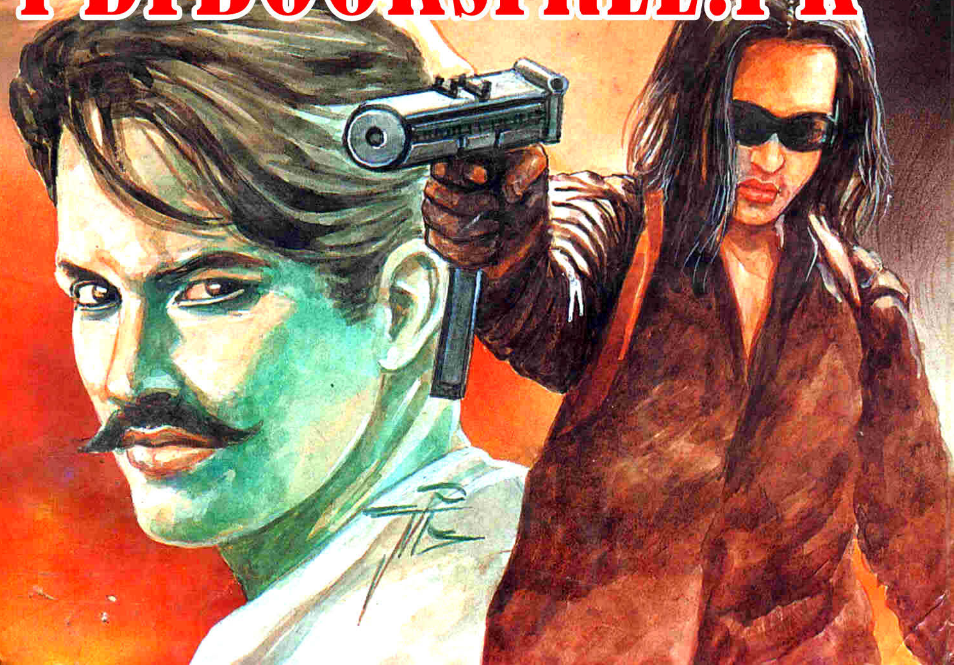
ایندھن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی



دیباچہ

ہر انسان کی زندگی یعنی مثبت زندگی اور ہر انسان کا مثبت کردار ایک توازن اور ایک ''بیلنس'' کا نام ہے۔ غیر متوازن رویے، منفی حالات و واقعات اور منفی زندگی کو جنم دیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسانوں نے ہر دور، ہر معاشرے اور ہر خاندان میں چاہے وہ شاہی خاندان ہو، وڈیرا خاندان ہو یا کوئی مفلس برادری ہو اپنے غیر متوازن رویوں سے ایسی ایسی عبرتناک داستانیں تخلیق کی ہیں جن کو پڑھ کر ذی احساس آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ داستان وطنِ عزیز کے ایک خوبصورت علاقے کی ایک غائت درجہ کی عبرت آموز کہانی ہے۔ یہ ان چار خاندانوں کی کہانی ہے جنھوں نے مہربان وقت کو اپنے منفی رویوں سے نامہربان بنا کے چھوڑا۔ محلاتی سازشوں کے بے مہر عفریت نے کس کس طرح ان کی خوشیوں کو ڈس لیا اور دلوں کی خوبصورتیوں کو ملیا میٹ کر کے ان میں نفرتوں کے بیج بو دیئے۔ ان چار خاندانوں میں بلند و بالا اور پُرشکوہ حویلی ''بھٹائی ہاؤس'' کے دو خاندان تھے۔

بھٹائی ہاؤس میں کبھی رونقیں اور شادمانیاں رقص کرتی تھیں مگر آج اس کا کونا کونا سناٹوں سے بھرا ہوا اپنی بربادی کا نوحہ سناتا دکھائی دیتا ہے۔ سازشوں کا سلسلہ جب گھر سے شروع ہوتا ہے تو بڑی بڑی ہمالیہ صفت شخصیات بھی لرزہ بر اندام نظر آتی ہیں۔ بقول شاعر ؎

''طوفانوں سے کھیلنے والے ڈوب گئے پیمانوں میں''

دوسرے لفظوں میں مذکورہ داستان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان بخوبی اپنے شب و روز کی تزئین و آرائش کرتے ہوئے راستی کے جوہر سے آشنا ہو سکتا ہے۔

ادارہ

میں وقت ہوں۔کسی کے لئے برا تو کسی کے لئے اچھا......مگر حقیقت یہ ہے کہ میں برانہیں ہوں۔اس دنیا کے باسی اپنے کرتوت کے حوالے سے مجھے برایا اچھا بناتے ہیں۔مجھ پر یہ بھی الزام ہے کہ میں کسی کا دوست نہیں ......اور سنگدل، بے مہر اور جانے کیا کیا ہوں۔مگر یہ درست نہیں۔میں برا کہنے والوں پر بہت کڑھتا ہوں۔ جیسا کہ ابھی میں چار خاندانوں کے لئے کڑھ رہا ہوں اور رنجیدہ خاطر ہو رہا ہوں۔ ان چاروں خاندانوں کے لوگوں نے مجھے نہ صرف اپنے لئے سنگین بنایا بلکہ دوسروں کے لئے بھی سخت بنایا کہ وہ بھی میرے عتاب سے نہیں بچ پائے۔ ان چاروں خاندانوں میں بلند و بالا حویلی ''بھٹائی ہاؤس'' سے متصل دو خاندان تیسرا خاندان ایک غریب ہاری مٹھن کا تھا جبکہ چوتھا شہری بودوباش اختیار کئے ہوئے چاندنی بی کا تھا۔

لاڑکانہ سے دادو جانے والی شارع سے کوئی پچیس، تیس کلومیٹر کے بعد ایک کچا راستہ سیدھا سردار شیر دل خان کے گوٹھ کی طرف جاتا ہے جو گوٹھ ''وسند خان'' کہلاتا ہے۔ وسند خان سردار شیر دل خان کے باپ کا نام تھا۔اس عبرت انگیز داستان کا آغاز اس خاندان سے شروع ہو کر باقی تینوں خاندانوں پر ختم ہوتا ہے۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اس شارع کے پہلو سے نکلنے والا کچا راستہ گندم، مکئی اور چنوں کے کھیتوں سے ہوتا ہوا ''بھٹائی ہاؤس'' کے دیوہیکل دروازے پر ختم ہوتا ہے۔ کبھی بھٹائی ہاؤس میں رہائش پذیر خاندان بھرا پرا تھا ......مگر اب اس کے دالانوں، بالا خانوں اور غلام گردشوں میں پراسرار سے سناٹے چیختے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ در و دیوار سے ہر سمے آسیبی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔اس کے کئی گوشے اب ویران ہو چکے ہیں۔ جدھر منحوس چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں ......کبھی کبھی ایک بوڑھا فقیر یہاں آ کر بڑی پرسوز آواز و انداز میں ''الومیاں'' گاتا ہے جس سے ''بھٹائی

ہاؤس'' کی خستہ حال ویرانیاں سوا ہونے لگتی ہیں۔ محلاتی سازشوں کے ناگوں نے اس کی خوشیوں اور خوبصورتی کو جگہ جگہ سے ڈس کر نفرت کا زہر کس طرح بھرا۔ آیئے میں آپ کو اس کی تفصیل سناتا ہوں کہ میں وقت ہوں۔



تاریک رات کے چیختے ہوئے سناٹے میں قرمزی پتھروں والی اس عالی شان بلند و بالا حویلی کا پرہیبت مہیب عفریت کی طرح خوابیدہ سا نظر آ رہا تھا۔ ''بھٹائی ہاؤس'' پر مکمل سکوت طاری تھا۔ کہنے کو یہ رات تاریک تھی مگر درحقیقت سازشوں بھری تھی۔ حویلی کے پرسکون اور آرام دہ گوشوں میں خاندان کے دیگر افراد محو استراحت تھے...... لیکن حویلی کا ایک گوشہ جو قدرے جنوبی سمت اور بالائی منزل پر تھا، ابھی جاگ رہا تھا۔ یہاں تین کمرے تھے جن میں ایک خواب گاہ، دوسرا بچوں کا اور تیسرا ڈرائنگ روم کی طرز کا تھا۔ صرف اس کمرے کی بتیاں روشن تھیں، جہاں ایک تیس پینتیس سالہ عورت اور دو مرد صوفوں سے ہٹ کر درمیان میں بچھی تین سرخ منقش کرسیوں پر براجمان تھے۔ یہ دونوں مرد آپس میں بھائی تھے اور ہدایتاں ان کی بہن تھی۔

یہ دونوں بھائی قریب کے ایک گوٹھ سے اپنی بہن سے ملنے آئے تھے اور اس بالائی منزل کے ایک مہمان کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ دونوں اوّل درجے کے سازشی ذہنوں کے مالک تھے اور اب تک اپنی گھناؤنی سازشوں کا تمام زہر اپنی شادی شدہ بہن ہدایتاں کی رگوں میں اتار چکے تھے...... اور آج بھی وہ دونوں ایک اہم خبر دینے بہن کے پاس آئے تھے۔ یہ حویلی جو ''بھٹائی ہاؤس'' کہلاتی تھی، ہدایتاں کا سسرال تھی۔ دونوں بھائیوں کی زہر فشانی سے اس وقت ہدایتاں کے بھرے بھرے اور سانولے چہرے پر ایک ابال کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ تینوں آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

''ادی...... ! اب تو تجھے پتہ چل گیا نا کہ تیرا مڑس (شوہر) عاقل خان پڑھائی کے بہانے شہر میں کیا گل کھلاتا پھر رہا ہے۔'' دفعتاً اس کے بڑے بھائی سائیں رکھیو نے سرگوشیانہ انداز میں بہن سے کہا تو دوسرا بھائی مولا داد بھی سازشی لقمہ دیتے ہوئے فوراً بولا۔

''دیکھ ادی...... ! ہم تیرے بھلے کے واسطے کہہ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے...... بھا عاقل کو شہر سے ہمیشہ کے لئے بلا لے...... ورنہ پچھتائے گی۔''

مولا داد اتنا کہہ کر بڑے غور سے بہن کا چہرہ تکنے لگا...... جیسے بہن کے چہرے پر اپنی بات کی اثر پذیری بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بھائی کی بات پر ہدایتاں کا چہرہ اندرونی جوش کا غماز محسوس ہونے لگا۔ چند ثانیے بعد اس نے لب کشائی کی تو اس کے جوش و غصے کے مارے تپے ہوئے لہجے سے جھنجھلاہٹ آمیز بے بسی مترشح تھی۔

''ادا...... ! میرا بس چلے تو میں عاقل خان کو کھونٹے سے باندھ کر رکھوں...... پر تم لوگ تو جانتے ہی ہو کہ اس حویلی میں ہم عورتیں طوطی کی مثال ہیں اور یہ حویلی نقار خانہ...... یہاں صرف مردوں کی بازگشت ہی سنائی دیتی ہے۔''

''اڑی واہ...... ! یہ کیا بات ہوئی بھلا......'' سائیں رکھیو بہن کی بات سن کر فوراً ہاتھ نچا کر بولا۔ ''تو کوئی گرے پڑے خاندان سے تھوڑی تعلق رکھتی ہے۔ ہم لوگ بھی سرداری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور پورے ''تر'' میں آ پڑیں عزت ہے...... یہ ٹھیک ہے کہ سردار شیر دل خان کا خاندان ہم سے بڑا ہے۔ پر کم ہم لوگ بھی نہیں ہیں۔'' سائیں رکھیو اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ ہدایتاں کے چہرے پر ہنوز بے بسی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات برقرار تھے۔ پھر بے بسی اس قدر بڑھی کہ ہدایتاں کی غم و غصے کی وجہ سے آنکھیں نمناک ہو گئیں...... اور وہ مغموم سے لہجے میں بولی۔ ''تم لوگ ہی کچھ کرو...... میرے واسطے...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' پھر دفعتاً وہ لحہ بھر رکی اور چند ثانیے پرسوچ انداز میں اپنی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رکھنے کے بعد بولی۔ 'تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اس چنڈال چھوکری کو ہی ختم کر ڈالو...... نا رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری......'' وہ انتہائی سفاک تجویز دیتے ہوئے اپنے دونوں بھائیوں کا چہرہ تکنے لگی۔

بہن ہدایتاں کی بات سن کر مولا داد اور سائیں رکھیو نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مولا داد نے سائیں رکھیو کو غیر محسوس انداز میں ایک اشارہ دیا۔ یہ اشارہ کائیاں سائیں رکھیو بھانپتے ہوئے اپنی بہن ہدایتاں کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی مکاری سے انتہائی نیچی آواز میں بولا۔

''ادی بات تو تیری بھی اتنی غلط نہیں ہے ...... جب سارے راستے ہی بند ہو جائیں تو یہی کرنا پڑتا ہے۔ پر تو تو جانتی ہی ہے کہ ایسے کاموں کے لئے روپیہ بہت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ آخر کو کسی کی جان لینی ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو ہدایتاں بولی۔ ''کتنا روپیہ چاہیئے؟''

''بس ......کوئی دو لاکھ......'' سائیں رکھیو نے یوں عام سے انداز میں رقم بتائی جیسے دو لاکھ نہیں دو روپے کہہ رہا ہو۔

''دو لاکھ یہ تو بہت زیادہ ہیں ادا سائیں......'' ہدایتاں کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اڑی ادی ...... کسی چڑیا کو تو نہیں نا مارنا بابا......جیتی جاگتی چھوکری کو مارنا ہے ...... اور وہ بھی شہر کی چھوکری کو ...... ویسے بھی یہ روپے کون سا ہماری جیبوں میں جائیں گے۔ بھاڑے کے لوگوں کو ہی دینے پڑیں گے۔'' مولا داد بڑی چالاکی سے بولا۔ ہدایتاں اب متذبذب سی نظر آنے لگی تھی۔ ایسے میں سائیں رکھیو نے بھی لوہا گرم دیکھتے ہوئے لب کشائی۔ ''دیکھ گوری......! وہ شہر کی چھوکری جو تجھ پر مصیبت ...... بلکہ ایک طرح سے حصے دار بن کر آنے والی ہے، اسے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ رقم بھی تھوڑی ہے ...... پر تیرے لئے ...... یہ رقم کوئی بڑی بات نہیں۔ آخر کو تو اس بھٹائی ہاؤس کی مان واری بہو ہے۔ سردار شیر دل خان کے بڑے بیٹے عاقل خان کی بیوی......''

''وہ تو ٹھیک ہے ...... پر...... میں اتنے سارے روپے مانگوں گی کس سے ...... میرا شوہر تو شہر میں ہے۔'' بالآخر ہدایتاں نے اپنی اصل پریشانی بتائی تو مولا داد مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''لو یہ کیا بات ہوئی ......تو اپڑیں سسر سے مانگ لے ......سنا ہے ...... بہت لاڈلی ہے تو اس کی ......اور بہت پیار کرتا ہے تجھے وہ......''

مولا داد کی چکنی چپڑی سن کر ہدایتاں کی گردن احساس غرور سے تن گئی۔ وہ پرغرور لہجے میں بولی۔ ''ہاں ...... یہ تو ہے...... اس میں کوئی شک نہیں ...... پر......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

تب سائیں رکھیو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''کل

تک سوچ لے ...... ہم کل دوپہر سے پہلے نکل جائیں گے۔ مگر ہماری ایک بات پلو سے باندھ لے۔ تجھے آگے بڑھ کر اور ساجھے دار بن کر اس حویلی میں رہنا ہوگا۔ اگر تو گھریلو محبت کے جھانسوں میں آ گئی تو اس حویلی کے شور میں دب کر رہ جائے گی۔ آ پڑیں چھوٹی وڈیرنی حاکم زادی کا حال دیکھا ہے ناں ...... وہ بھی تیری طرح چکنی چپڑی باتوں میں خوش رہتی تھی اور ساری عمر ایسی ہی خاموشی سے گزار دی۔ دیکھ لیا ...... کتنے حصے بخرے ہو گئے ......نوکروں جیسی حیثیت ہوکر رہ گئی ہے...... تیری چھوٹی ساس کی اب بڑھاپے میں چلاتی ہے مگر اب کیا فائدہ......'' اتنا کہہ کر وہ دونوں بھائی ہدایتاں کو حیران و پریشان چھوڑ کر خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔



ماہ جون کی پسینہ بہاتی گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کھیتوں میں چاولوں کی کاشت شروع ہو چکی تھی۔ قادر بخش اپنی سرخ جیپ، کھیتوں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے دھول اڑاتے راستے پر دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی ساری زمینیں اس کے باپ سردار شیر دل کی ملکیت تھیں۔ جہاں کئی مرد، عورتیں اور لڑکیاں کام میں مصروف تھیں۔ یہ سب لوگ ان کے ''رہاک'' (کسان) تھے۔

قادر بخش ایک بیس، بائیس سال کا بانکا سجیلا نوجوان تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ فطرتاً وہ ایک شریف اور ہمدرد انسان تھا۔ اس کی گواہی وہ سب لوگ دیتے تھے جو اس کی زمینوں میں ''رہاکی'' کرتے تھے۔ قادر بخش ان کسانوں میں بالکل اسی طرح گھل مل جایا کرتا تھا جیسے وہ ان کا چھوٹا بھوتار سائیں (مالک) نہ ہو ...... بلکہ ان کا اپنا ساتھی ہو...... بالخصوص بٹائی والے دنوں میں ...... وہ خود جب تک تمام غریب اور محنت کش ہاریوں کو بٹائی میں پورا ''حصہ'' نہیں مل جاتا، وہ وہاں سے اٹھتا نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات لالچی اور خبیث منشی بخشل کو گراں گزرتی تھی لیکن اسے اپنے چھوٹے بھوتار سائیں کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ ورنہ وہ بدطینت شخص ہر بار اس تاک میں رہتا تھا۔ اناج کی بوریاں پار کر کے اپنے گھر روانہ کر دے جب ہر بار اس نے اسی طرح اپنی دال گلتی نہیں دیکھی تو اس نے اس چھوٹے بھوتار سائیں (قادر بخش) کے مقابل اس کے چھوٹے بھائی منصب علی خان کو لا کھڑا کر دیا تھا۔ منصب علی

خان قادر بخش کا چھوٹا اور سوتیلا بھائی تھا جو سردار شیر دل خان کی دوسری بیوی حاکم زادی کے بطن سے تھا...... منشی بخشل ہر وقت نہ صرف غریب ہاریوں کی کام چوری کی جھوٹی داستانیں اسے سنایا کرتا تھا بلکہ اسے سوتیلے بھائی قادر بخش کے خلاف بھی بھڑکایا کرتا تھا۔ مگر باوجود اس کے منشی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار شیر دل خان بذات خود ایک نیک طینت اور انصاف پسند شخص تھا۔ اس طرح غریب ہاریوں کے معاملے میں اس کا جھکاؤ اپنے بیٹے قادر بخش کی طرف ہوتا تھا۔ اکثر دونوں بھائیوں کی آپس میں جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔ مگر پھر بھی منشی بخشل اور منصب علی خان، قادر بخش کا کچھ نہیں بگاڑ پائے تھے۔

قادر بخش اس وقت اپنی جیپ میں سوار ہو کر اپنے دوست سرمد سے ملنے جا رہا تھا۔ سرمد اس کی زمینوں میں کام کرنے والے ایک غریب ہاری محمد مٹھن کا جوان بیٹا تھا۔ یہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ان دونوں کی دوستی کو پورے گوٹھ کے لوگ رشک اور بعضے حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو گی کہ دونوں کے درمیان حیثیتوں کا فرق تھا لیکن قادر بخش نے کبھی اپنے اور سرمد کے درمیان اس طبقاتی تفاوت کو آنے نہیں دیا تھا۔

پھر ایک جگہ...... قادر بخش کو دور سرمد ٹریکٹر چلاتے ہوئے نظر آ گیا۔ سرمد قادر بخش کے باپ سردار شیر دل خان کے نہ صرف زرعی فارم کی نگرانی کرتا تھا بلکہ اس سے متصل آس پاس کی زمینوں پر بھی کام کرتا رہتا تھا۔ ٹریکٹر سردار شیر دل خان کی ملکیت تھا اور ایسے کئی ٹریکٹر فارم میں موجود تھے۔ سرمد نے بھی شاید قادر بخش کی جیپ دیکھ لی تھی لہٰذا اس نے ٹریکٹر کا لیور کھینچ کر اس کے "بلیڈ" اوپر اٹھائے اور اسے گھماتا ہوا نہنگ کے ایک چھتنار پیڑ تلے کھڑا کر کے نیچے اتر آیا۔

ادھر قادر بخش بھی اپنی جیپ لے آیا تھا۔

"کیا حال ہے...... بڑی مشقت ہو رہی ہے۔" قادر بخش جیپ کا اگنیشن سوئچ آف کر کے نیچے اترتے ہوئے سرمد سے مخاطب ہوا۔ جواباً سرمد نے اپنے کاندھے پر دھری اجرک سے اپنا پسینے میں تر چہرہ پونچھتے ہوئے قادر بخش سے مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاؤ یار...... گندم کے بعد چاولوں کے لئے زمین کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی جریب رہ گئی ہے۔ پر میں آج رات کو ٹریکٹر چلا کر کام ختم کرلوں گا تاکہ صبح سویرے بوائی شروع ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے سرمد نے اپنی اجرک درخت کے سائے میں بچھانے کی کوشش کی تو قادر بخش نے اسے روک دیا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے یونہی بھربھری مٹی پر بیٹھ گیا۔ اب دونوں دوست درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔

''یار سرمد......! تو واقعی بہت محنتی ہے۔ رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کام چوری نہیں کی۔ مگر یار پھر بھی ذرا ستا لیا کر...... یہ ضروری ہے۔'' قادر بخش نے کشادہ دلی کے ساتھ سرمد سے کہا تو جواباً سرمد اپنے سانولے مگر خوبرو چہرے پر میٹھی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''اڑے یار...... یہ تیری دوستی ہی تو ہے کہ مجھے وڈے بھوتار سائیں (سردار شیر دل خان) نے اتنا ٹھاٹ باٹھ والا کام دیا ہے...... مزے سے ٹریکٹر چلاتا ہوں۔ مائی بھاگی کے گیت سنتا ہوں اور بڑے آرام کے ساتھ اندر فارم میں سو جاتا ہوں...... ورنہ تو تمہاری زمینوں پر ایسے غریب اور بوڑھے لوگ تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں صبح سے شام تک کام کرتے ہیں۔'' سرمد اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو قادر بخش اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تاہم وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ''یار...... پتہ ہے میرا تو خود جی کڑھتا ہے...... ان غریب اور محنت کش ہاریوں پر...... اتنی کڑی محنت کرتے ہیں اور انہیں بدلے میں کیا ملتا ہے...... مٹھی بھر اناج...... میرا بس چلے تو اپنی زمینوں پر ایسی مشینیں لے آؤں جوان کے بدلے......''

''نا...... نا...... یار...... ایسا ظلم نہ کرنا...... کیوں ہم گریبوں کو بے روزگار کرنے پر تلے ہوئے ہو۔'' سرمد اچانک قادر بخش کی بات کاٹ کر بولا۔ ''ویسے ہمیں اپنی مشقت اور محنت پر فخر ہے...... محنتی تو اللہ سائیں کے حبیب ہوتے ہیں...... شاہ سائیں نے بھی تو اس دھرتی کے محنت کشوں پر بڑی اچھی شاعری کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سرمد شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری گنگنانے لگا جس میں محنت کش دہقانوں کی بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی تھی۔

پھر وہ دونوں دوست تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب

قادر بخش رخصت ہونے کے لئے اٹھنے لگا تو دفعتاً اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی کونجاں پر پڑی۔ اس کے نرم و نازک اور گورے گورے ہاتھوں میں دستر خوان نما نقشیں رومال نظر آ رہا تھا جس میں وہ اپنے بھائی سرمد کے لئے کھانا لائی تھی۔ قریب آتے ہی اس نے ایک چونکتی ہوئی نگاہ قادر بخش پر ڈالی اور پھر اندر ہی اندر دو دلوں کے تاریک وقت بج اٹھے۔

''اچھا یار...... میں اب چلا۔ آج تو تو اوطاق نہیں آئے گا۔ پر کل میں تیرا حویلی میں کھانے پر انتظار کروں گا۔'' قادر بخش نے کونجاں کی آمد پر اپنے دھڑکتے دل کی بے ترتیبی پر قابو پاتے ہوئے سرمد سے کہا اور سرمد ہولے سے مسکرا دیا۔

پھر قادر بخش نے اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے کونجاں کو ذرا گہری نظروں سے دیکھا تو کونجاں کے نرم و نازک ہونٹوں پر ایک لمحے کو خفیف سا تبسم لہرایا۔ مگر اس سے قطع نظر اس نے کونجاں کے خوبصورت چہرے پر ایک عجیب سی پریشانی کے آثار بھی محسوس کئے تھے جس پر قادر بخش اپنی جیپ میں جا بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے ہولیا۔

کونجاں نے اک ذرا انکھیوں سے سامنے دھول اڑاتی جیپ کو دیکھا اور پھر بھائی کے پیڑ کی گھنی چھاؤں تلے آ گئی۔ وہ اپنے بھائی سرمد سے تین چار برس چھوٹی تھی۔ گوٹھ کی کھلی، خالص اور آزاد آب و ہوا نے کونجاں کو ایسا شباب عطا کیا تھا کہ گھر کے بڑوں کی نیندیں اور گوٹھ کے نوجوانوں کی نیتیں خراب ہونے لگی تھیں۔ کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دلکش معصومیت اور حیا آمیز چمک کے ساتھ اس کی کمر پر بل کھاتی ناگن کی طرح گھنیرے بالوں کی چٹیا اس کے ملکوتی حسن کو دو آتشہ بنائے ہوئے تھی۔

سرمد نے اپنی بہن کو کونجاں کے سر پر روایتی انداز میں اپنا ہاتھ رکھا اور پھر اسے اپنے سامنے ہی بھربھری زمین پر بٹھا دیا۔ کونجاں نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رنگین و نقشیں دستر خوان کو کھول کر بچھا دیا تو مکئی کی گرم گرم اور دیسی گھی میں چپڑی ہوئی روٹیوں پر ساگ پلی کی سوندھی سوندھی مہک نے سرمد کی بھوک کو دوچند کر دیا اور وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گیا۔

معاً کھانا کھاتے ہوئے اس کی نگاہ کونجاں پر پڑی تو وہ ذرا چونکا۔ وہ خاصی مضطرب نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے ادی بھنبھل......! تو کچھ پریشان ہے۔ بابا کی طبیعت تو ٹھیک تھی نا......''

کونجاں بھائی کی بات سن کر چونکی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بتانے سے گریزاں ہو۔ تاہم وہ بولی۔

''ادا سائیں......! تو پہلے روٹی کھا لے پھر بتاتی ہوں۔ ویسے بابا کی طبیعت ٹھیک ہی تھی۔'' مگر سرمد کی تیز نظروں نے بہن کے مضطرب چہرے پر کھنڈی پریشانی کے آثار بھانپ لئے تھے۔ اس نے فوراً کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں...... پہلے مجھے بتا...... کیا بات ہے؟ تو ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔''

کونجاں اپنے غیرت مند بھائی کی جوشیلی طبیعت سے واقف تھی۔ لٰہذا سپر ڈالتے ہوئے بالآخر جواباً بولی۔ ''ادا سائیں......! وہ...... وہ زمیندار حکم داد نے بابا کو اپنی اوطاق میں بلایا تھا۔''

اس کی بات سن کر سرمد بری طرح ٹھٹکا۔ بات ہی ایسی تھی کیونکہ زمیندار حکم داد ایک قریبی گوٹھ کا وڈیرا تھا اور وہ اس کے دوست قادر بخش کے بڑے سگے بھائی عاقل خان کا سسر تھا۔ حکم داد نے اس کے باپ مٹھن کو کیوں اپنی اوطاق میں بلایا تھا۔ اس کا مطلب نہ صرف کونجاں سمیت اس کے گھر والے اور وہ خود سرمد بھی اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک بار حکم داد نے باقاعدہ اپنے ایک کمدار کو اسے لینے کے لئے ٹریکٹر بھیجا تھا۔ لٰہذا آج بھی جب ایسا ہوا تو وہ خود بھی متفکر نظر آنے لگا۔ اچانک ہی اس کی شعلہ بار آنکھوں کے سامنے ایک مکروہ چہرہ گھوم گیا۔ یہ چہرہ موجا خان کا تھا۔ سرمد کے دانت خود بخود بھنچتے چلے گئے۔ جیسے وہ موجا خان کا نرخرہ چبا رہا ہو۔



''ہاں بھئی مٹھن...... بابا بیٹھو...... تم سے آج بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' ایک قدرے چوڑے پشتے والے اور ذرا اونچے سرکنڈوں کے مونڈھے پر پُرغرور تمکنت کے

ساتھ براجمان ساٹھے پاٹھے ایک شخص نے اپنے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ایک خستہ حال اور مدقوق جاں ہاری سے کھرکھراتے لہجے میں کہا۔ یہ زمیندار حکم داد تھا۔ اس کے لہجے کی رعونت اس کی اکھڑ مزاجی کی غمازی کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے نام کی طرح صرف اپنا حکم منوانا اور دوسرے کا غلامانہ جواب سننے کا عادی ہے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے دست بستہ جس ہاری کو مٹھن کہہ کر مخاطب کیا تھا، وہ سرمد کا باپ تھا جو زمیندار حکم داد کے اچانک بلاوے پر اپنے دل کو دماغ میں سو قسم کے اندیشے لئے فوراً ہی ہاتھ باندھے یہاں آن پہنچا تھا۔

درحقیقت کچھ عرصہ قبل وہ زمیندار حکم داد کی زمینوں میں رہا کی کرتا تھا۔ پھر وہ مزدوری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ حکم داد کی جن زمینوں پر مٹھن مزدوری کرتا تھا اس کا کئی سو جریب پر مشتمل حصہ سردار شیر دل کے گوٹھ کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ بہر طور...... اس وقت بے چارہ مٹھن زمیندار حکم داد کے سامنے زمین پر پالتی مارے بیٹھا تھا اور اس کے بشرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ حکم داد نے دوبارہ اس سے گونجیلی آواز میں کہا۔

''اڑے بابا...... موجا خان کو تو جانتا ہی ہے ناں...... وہی جو میرا ساجھا ہے۔'' حکم داد کے یاد دلانے پر بے چارہ مٹھن جھٹ اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے انکسارانہ عجز کے ساتھ جواباً بولا۔ ''ہا...... ہاؤ...... سائیں وڈا......''

''کیا خاک جانتا ہے تو اسے......'' دفعتاً ہی زمیندار حکم داد کا لہجہ دھاڑ کی صورت میں گونجا اور مٹھن بے چارہ بری طرح سہم کر رہ گیا۔ اگرچہ مٹھن اس کی مزدوری چھوڑ چکا تھا مگر اس حقیقت سے بھی بہ خوبی واقف تھا کہ حکم داد سردار شیر دل خان آپس میں سمدھی تھے اور زمیندار حکم داد کی مزدوری چھوڑنے کے باوجود مٹھن اس سے اب بھی ڈرتا تھا۔ بے چارے ایک غریب ہاری کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو زمینوں کے سارے مالک ہی ''وڈے سائیں'' کا درجہ رکھتے تھے۔

حکم داد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اڑے بابا...... اگر تو موجا خان کو جانتا ہے تو پھر تو نے اپنی نیازیں (بیٹی) کونجاں کا رشتہ اسے دینے سے کیوں انکار کیا؟'' زمیندار حکم داد کے لہجے کی گھن گرج نے سہمے ہوئے مٹھن کا دل اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ زمیندار حکم داد جیسے لوگ عرصے سے مٹھن جیسے لوگوں کے مائی باپ

چلے آ رہے تھے۔ حاکم و محکوم کا یہ سلسلہ پشتوں سے جاری و ساری تھا۔ لہٰذا اس کے سامنے کبھی کسی نے دم مارنے کی جرأت تو کجا، سوچا تک بھی نہ تھا۔ مٹھن جیسے لوگوں کی گھٹی میں یہ بات ازل سے ڈال دی گئی تھی کہ زمیندار حکم داد جیسے لوگ صرف حکم چلانے اور وہ حکم ماننے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔

مٹھن بے چارہ چند ثانیے تک اپنے وجود کے ارتعاش پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا تو اثنائے راہ جانے کیا ہوا کہ ادھر زمیندار حکم داد کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا اور وہ مٹھن ہاری کو دوبارہ مخاطب کر کے بولا۔

''مٹھن...... ! بابا...... تو بالکل چریا ہے۔ تجھے تو موجا خان جیسے شریف اور مالدار شخص کو اپنی کونجاں کا رشتہ دینے کے لئے ذرا بھی ہچکچانا نہیں چاہئے بلکہ تجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارا ایک خاص اور قریبی آدمی تمہارا داماد بننا چاہ رہا تھا۔ سمجھتا ہے نا بابا تو اچھی طرح کہ ہمارا خاص آدمی کیا ''چیز'' ہوتا ہے۔'' آخر میں زمیندار حکم داد کے سنسناتے لہجے نے جانے کیوں بے چارے مٹھن کے وجود میں ایک انجانے خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بدبخت موجا خان اپنے ناپاک مقصد کے حصول کے لئے زمیندار حکم داد خان کو درمیان میں لے آئے گا۔ موجا خان کتنا ''شریف'' آدمی تھا، یہ سب جانتے تھے۔

بات کو خود ہی اپنے حق میں سمجھ کر ختم کرتے ہوئے زمیندار حکم داد اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اڑے بابا مٹھن تو فکر نہ کر۔ تیری کونجاں، موجا خان کے ساتھ بہت خوش اور سکھی رہے گی۔ کل وہ پھر آئے گا تیرے پاس...... خیال رہے...... وہ میرا آدمی ہے سمجھ گیا نا بابا...... اب...... تو جا یہاں سے......''



تھوڑی دیر بعد جب کونجاں بھائی سے رخصت ہونے لگی تو...... سرمد اس سے بولا۔ ''ادی تو گھر جا میں بس تھوڑا کام نمٹا کر پہنچتا ہوں۔''

کونجاں مغموم سے چہرے پر خاموشی لئے وہاں سے واپس گھر کی طرف چل دی۔ اسے دکھ تھا کہ اس کے کامی بھائی سے آج پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔

کاش وہ اپنی پریشانی اس پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ مگر وہ کیا کرتی پریشانی کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ باوجود چھپانے کے نہ چھپی رہ سکی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی کھیتوں کے بیچ بل کھاتی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی کہ دفعتاً اسے سامنے ایک چھتنار پیڑ تلے جیپ کھڑی نظر آئی۔

وہ ایک لمحے کو چونکی پھر اس کے نرم ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ کی لکیر سی کھنچ گئی۔ وہ جیپ کو پہچان چکی تھی۔ یہ قادر بخش کی جیپ تھی اور قادر بخش اس وقت جیپ کا بونٹ کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ کونجاں کے ہونٹوں پر اب شوخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی اور آنکھوں میں بھیدوں بھری معنی خیزی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ بہ ظاہر جیپ کی کوئی خرابی تلاش کرنے کے بہانے قادر بخش اس کے انتظار میں کھڑا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ قادر بخش بہ ظاہر بونٹ پر جھکا مگر کنکھیوں سے سامنے سے آتی ہوئی کونجاں کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر جیسے ہی کونجاں اس کے قریب آئی وہ ایک دم سیدھا کھڑا ہو کر محبت پاش نظروں سے کونجاں کی طرف دیکھے گیا۔ کونجاں کے قدم خود بخود تھم گئے۔ اس کے دل کی رفتار ابتر ہونے لگی۔ اس نے یونہی اک لمحے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور کھیتوں میں مرد عورتیں اپنے کاموں میں مگن تھے۔

''کونجاں......! کیا بات ہے، تم آج کچھ پریشان سی لگ رہی تھیں؟'' بالآخر قادر بخش نے گھبرائی ہوئی کونجاں سے سوال کیا۔ اس کے انداز تخاطب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات نہ تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی کسی ایسے ہی ویران کنج میں مل چکے تھے...... اور پھر جانے کب چھتنار پیڑوں تلے محبت کا بیج پروان چڑھا اور تن آور درخت بن گیا۔ کونجاں جب بھائی کو کھانا دینے آئی تھی تو قادر بخش نے اس کے چہرے سے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ اس وقت تو قادر بخش وہاں سے خاموشی کے ساتھ چلا آیا تھا۔ مگر سرمد سے رخصت ہونے کے بعد وہ خاصی دیر سے یہاں کھڑا کونجاں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی واپسی اسی راستے سے متوقع تھی۔

کونجاں نے قادر بخش کی بات سن کر اپنی گھنیری پلکوں کا جال اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک لحظے کو اس کی گہری گہری جھیل سی آنکھوں میں تذبذب کی

پرچھائیں لہرائی اور تب اس کے گلابی نرم و نازک ہونٹوں پر ارتعاش سا ابھرا۔

''زمیندار حکم داد نے آج میرے بابا کو دوبارہ اپنی اوطاق میں بلایا تھا۔'' قادر بخش کو کونجاں کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ مگر اس کی بات نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔ یہ بات اس سے بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ حکم داد کونجاں کے باپ سے کیا چاہتا تھا؟

''ہوں......اس کا مطلب ہے پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ حکم داد کے خبیث چیلے موجا خان کو لگتا ہے اب سبق سکھانا ہی پڑے گا۔'' قادر بخش نے دانت پیستے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو کونجاں کی غزالی آنکھوں میں تشویش کے سائے نمایاں ہو گئے۔ وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''نہیں...... قادر بخش......! میری خاطر ان لوگوں سے جھگڑا مت لو...... کہیں تم لوگوں کے بیچ رشتے داری ناچاقی میں نہ بدل جائے۔'' اتنا کہہ کر کونجاں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ وہ جانتی تھی کہ زمیندار حکم داد قادر بخش کے بڑے بھائی عاقل خان کا سسر تھا۔ لہٰذا موجا خان سے ٹکر لینے کا مقصد تھا، زمیندار حکم داد کو ناراض کرنا۔ مگر قادر بخش نے کونجاں کی بات کی فوراً نفی کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔ ''ہرگز نہیں......کونجاں......! اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر ہم آخر کب تک خوش گمانیوں میں مبتلا رہیں گے۔ اس سے پہلے کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکلے ہمیں فوراً بلکہ مجھے وہ قدم اٹھا لینا چاہئے تا کہ کوئی دوسرا تمہیں مجھ سے نہ چھین سکے۔'' وہ رکا تو کونجاں نے چونکنے کے انداز میں حیرت سے قادر بخش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کونجاں کو اس کے لہجے کی گھن گرج میں اٹل فیصلوں کی گونج اسے ہر قیمت پر اپنا لینے کی برق خرام کی تپش محسوس ہوئی تھی۔

کونجاں بے چاری ایک معصوم اور سیدھی سادی غریب لڑکی تھی۔ اوّل تو کبھی اس نے یہ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ قادر بخش جیسے سردار زادے کی اسے محبت نصیب ہو گی۔ اسے اپنی کم مائیگی کا بھی احساس رہتا تھا۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قادر بخش اور اس کے درمیان بلند سنگی روایتوں کی دیوار حائل تھی جسے وہ شاید کبھی بھی پھلانگ نہیں پائیں گے۔ مگر قادر بخش کے عزم صمیم اور اٹل لہجے پر وہ کبھی کبھی متوحش سی ہو جاتی تھی۔

کونجاں کو کسی سوچ میں مستغرق پا کر قادر بخش اس بار ملائمت سے بولا۔

"کونجاں......! میں جانتا ہوں ......تو کس وجہ سے گھبراتی ہے...... پر تو فکر نہ کر...... میں ہوں ناں ...... جا اب تو اپڑیں گھر......" قادر بخش نے اتنا کہہ کر ایک گہری سانس لی اور پھر ایک گہری نظر کونجاں پہ ڈالتا ہوا اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔



یونیورسٹی کے گیٹ میں ایک سیاہ چمکتی دمکتی ہنڈا اکارڈ داخل ہوئی اور بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ رینگتی ہوئی یونیورسٹی کے ایک پارکنگ شی میں جارکی ...... کار میں آج ڈرائیور موجود نہ تھا۔ اسے عاقل خان خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر بہترین تراش اور جدید ساخت کے سوٹ میں ملبوس ایک بیس بائیس سالہ حسین لڑکی براجمان تھی۔ یہ سورٹھ تھی، عاقل خان کی سوتیلی چھوٹی بہن۔ دونوں سردار شیر دل خان کی اولاد تھے۔ عاقل پچیس تیس کے پیٹے میں تھا۔ عموماً وہ پینٹ شرٹ میں ہوتا تھا۔ مگر آج اس نے گولڈ کاٹن کا کھڑکھڑاتا ہوا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کاندھے چوڑے اور چہرہ کلین شیو تھا۔ دونوں بھائی بہن کار سے اترے۔ سورٹھ اپنی کتابیں سنبھالے قریب کھڑی سہیلیوں کے جھرمٹ میں جا گھسی جبکہ عاقل اپنی اسائنمنٹ کی فائل ہاتھوں میں پکڑے، اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل دیا ویسے اس نے کنکھیوں سے سورٹھ کی سہیلیوں کی طرف متلاشی نظر ڈالی تھی۔ مگر وہاں سے پازیب نظر نہیں آئی تھی۔ عاقل خان پولیٹیکل سائنس کا اسٹوڈنٹس تھا جبکہ سورٹھ سوشیالوجی میں ماسٹرز کی ڈگری لینے کے بعد اپنی این جی او بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ان کی رہائش حیدر آباد کے ایک پوش علاقے میں تھی۔ وہاں ان کا اپنا ذاتی بنگلہ تھا جو "لنیجھر ولا" کے نام سے موسوم تھا۔ گوٹھ کی حویلی "بھٹائی ہاؤس" سے جب بھی ان کے خاندان کے افراد شہر آتے تو "لنیجھر ولا" میں ہی سکونت اختیار کرتے تھے۔

عاقل خان ٹھیک وقت پر اپنا پہلا لیکچر لینے کے بعد سینٹرل کینٹین آ گیا۔ اس کے ہمراہ چند دوست بھی تھے......مگر پھر وہ جلد ہی تنہا وہاں سے اٹھ کر لان میں آ گیا......اور تب اسے لان میں پازیب نظر آ گئی۔ وہ اس وقت اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ لان سے باہر نکل رہی تھی۔ عاقل خان پر نظریں پڑتے ہی اس کے قدم خود بخود رک گئے۔

پھر جب عاقل خان لان کے ایک کنج میں سیمنٹ کی بینچ پر جا بیٹھا تو پازیب بھی

اپنی کتابیں سنبھالے اس کے پاس آ گئی۔ اس نے بیش قیمت لان کا پھولدار چکن سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک سرو قد اور سرخ سفید رنگت کی خاصی حسین لڑکی تھی۔

"کیا بات ہے ...... آج خاموش خاموش سی ہو......؟" قریب آتے ہی اس نے عاقل خان سے کہا اور بینچ کے کونے میں بیٹھ گئی۔ عاقل خان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے...... جانے کیوں قنوطیت سی طاری ہے آج طبیعت پر......"

"او......! کیا بچے یاد آ رہے ہیں؟" پازیب کے لہجے میں ہلکی سی شرارت آمیز شوخی تھی۔

"تم باز نہیں آؤ گی ...... بھلا بچوں کو یاد کر کے کون باپ بیزار ہوتا ہے۔ بس ایک بے نام سی الجھن کا شکار تھا۔" عاقل خان نے گہری متانت سے کہا تو پازیب کے چہرے پر بھی سنجیدگی کھنڈ آئی۔

اسے خاموش پا کر عاقل خان بولا۔ "پازیب......! اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ سچ پوچھو تو تمہارے فیصلے کے طویل اور صبر آزما انتظار کی وجہ سے ہی میں آج کل الجھن کا شکار ہوں۔ دیکھو آج تمہیں ہر حالت میں اپنا فیصلہ سنانا پڑے گا۔" اس کے لہجے کی قطعیت نے پازیب کا دل دھڑکا سا دیا۔ تاہم اس نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا اور پھر یونہی اپنی مخروطی انگلیوں کے لانبے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"عاقل......! میں جب بھی اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا کرنا چاہتی ہوں تو جانے کیوں اچانک میری نظروں کے سامنے ایک عورت کا معصوم چہرہ رقصاں ہونے لگتا ہے ...... جس پر ایک دکھ آمیز التجا ہوتی ہے۔" اس کی بات سن کر عاقل خان کی قنوطیت سوا ہونے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ پازیب کس "عورت" کی بات کر رہی ہے۔ اس کا اشارہ اس کی بیوی ہدایتاں کی طرف تھا۔

"دیکھو پازیب جہاں میں نے تم سے اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپایا وہاں تم نے بھی مجھے اپنے ایک اہم راز سے بے خبر رکھنے کی کوشش نہ کی۔" عاقل خان نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "مگر جس طرح مجھے تمہارے ماضی اور بیک گراؤنڈ سے کوئی غرض نہیں اسی طرح تمہیں بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں

شادی شدہ ہوں۔ رہی بات میری بیوی ہدایتاں کی تو تم جانتی ہو کہ میں جس ماحول میں پروان چڑھا ہوں وہاں بچپن ہی سے اس قسم کے اہم فیصلوں کو غیر اہم جانتے ہوئے سروں پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔" عاقل اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو جانے کیوں پازیب کو ایسا محسوس ہوا جیسے عاقل نے اس کا بیک گراؤنڈ جتاتے ہوئے اسے اندر سے کمزور کرنے کی سعی کی ہو مگر پتہ نہیں کیوں پازیب نے اس کا برا نہیں منایا۔ تاہم اس نے ایک چبھتا ہوا سا سوال کیا۔ "عاقل......! اگر ہماری شادی ہو جاتی ہے فرض کرو......تو کیا تم اپنے خاندان والوں کے سامنے میری اصلیت بتا دو گے؟"

اس کی بات سن کر عاقل کی جھنجلاہٹ میں پھر اضافہ ہونے لگا مگر وہ چپ رہا۔

"تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا......؟" اسے خاموش پا کر پازیب نے بہ غور اس کی طرف دیکھ کر کہا تو عاقل بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھر کر مبہم انداز میں بولا۔ "شاید ہاں...... یا......پھر نہیں......کبھی نہیں......"



طبلے کی تھاپ پر جب وہ اپنے دائیں پاؤں کی ایڑی کو چکنے فرش پر مارتی تو اس کے پیروں میں بندھے گھنگروؤں کی جھنکار اور بدن کے قیامت خیز لوچ کی وجہ سے وہ تماش بینوں کے حواسوں پر چھانے لگتی اور بے اختیار اس محفل ہاؤ ہو میں کئی حسرت زدہ آہیں بلند ہونے کے ساتھ "واہ...... واہ" کا شور اور نوٹوں کی بارش ہونے لگتی تھی۔ یہ حسن جہاں اور قتالہ عالم مشہور مغنیہ گھنگھرو کا کوٹھا تھا۔ اس کا نظم ونسق مشہور نائیکہ چاندنی بی سنبھالتی تھی وہ اس وقت بڑے "کر" کے ساتھ چاندنی پر ایک جانب بیٹھی کلے میں گلوری دبائے فخر آمیز انداز میں تھرکتی ناچتی گھنگھرو پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے ہمراہ منے خاں اور اس کا بدمعاش چیلا بیر دادا براجمان تھے۔

پھر تھوڑی دیر بعد رقص ختم ہوا تو سازندوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لئے۔ پھر یہ محفل ہاؤ ہو رفتہ رفتہ برخاست ہونے لگی تو گھنگھرو سیدھی اپنے کمرۂ خاص میں آ گئی۔

وہ اپنے نام کی طرح گھنگھرو تھی۔ اس کا جسم کسی گھنگھرو کی طرح ہی ہر سے سنگیت بکھیرتا محسوس ہوتا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے بڑی ناگواری کے ساتھ اپنا گہرا سبز رنگ کا پشواز اتار کر پھینکا۔ گھنگھرو وہ پہلے ہی نوچ کر بے دردی کے ساتھ

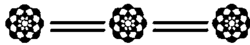
فرش پر ڈال چکی تھی۔ ابھی اس نے اپنا عام لباس زیب تن کیا ہی تھا کہ چاندنی بی...... اپنی پیک زدہ بدنما باچھیں پھیلائے تال پیٹتی اور "شاوا ...... بھئی شاوا......" کہتی کمرے میں داخل ہوگئی۔

"واہ......بٹیا رانی......آج تو تو نے محفل ہی لوٹ لی۔ ایسا رنگ جمایا کہ کسی کا اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ ایک قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "دو ایک رئیس زادے تو اڑ گئے......پھر دبیز دادا نے انہیں سنبھال لیا تھا۔" گھنگھرو نے اس کی یاوہ گوئی کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک ازلی اداسی سمٹ آئی تھی۔ تاہم چند ثانیے بعد وہ چبھتی ہوئی نظروں سے چاندنی بی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "چاندنی بی......! میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے بیٹی مت کہا کرو۔ اگر تمہاری کوئی اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم اسے میری طرح شمع محفل بناتیں؟"

"گھنگھرو......! اپنی زبان کو لگام دو۔ تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو۔" چاندنی بی ......کا مزاج ایک دم کرخت ہو گیا۔ سستے قسم کے میک اپ کی لیپا پوتی بھی اس کی جھریوں کی بدنما لکیروں کو ڈھانپ نہ سکی تھی اور مارے نخوت کے اس کا سوجا ہوا چہرہ مزید بدصورت اور کریہہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گھنگھرو سے تنبیہی لہجے میں بولی۔

"میں دیکھ رہی ہوں دن بہ دن تم باغیانہ انداز اپنا رہی ہو اگر تم نے ہم سے اپنی ایک ضد منوا لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تم نے اگر اپنا مزاج نہ بدلا تو تمہاری لاڈلی بہن پازیب کو بھی اس بازار کی زینت بنا دوں گی سمجھیں......" چاندنی بی اتنا کہہ کر غصے سے پاؤں پٹختی اسے گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

گھنگھرو کے چہرے پر ایک دم خوف سمٹ آیا۔ چاندنی بی کی دھمکی اسے ہمیشہ کمزور کر دیا کرتی تھی۔



گھنگھرو کافی دیر تک بند دروازے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ حالانکہ چاندنی بی کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر اس کے دھمکی آمیز الفاظ نے خاصی دیر گھنگھرو کو جکڑے رکھا تھا۔ اسے اب نہ صرف چاندنی بی بلکہ اپنے ماحول سے سے کراہت محسوس ہونے لگی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ اپنے لئے نہیں، پازیب کے لئے۔ جسے اس نے اس ''ماحول'' سے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے بھی دور رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خود جو ازل سے اس گندے تالاب میں سرتاپا غرق ہو چکی ہے، اپنی بہن پازیب کو بھی اس میں دھکیل دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے پازیب کو پہلے بورڈنگ اور پھر گرلز ہاسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔

پازیب اس سے دو، تین سال ہی چھوٹی تھی۔ ان دونوں نے اپنے ماں باپ کو آج تک نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں معصوم بچیاں تھیں تو انہوں نے خود کو چاندنی بی کے رحم و کرم پر پایا تھا۔ حتیٰ کہ ان دونوں کے نام بھی چاندنی بی نے ہی رکھے تھے۔

گھنگھرو کے مقابلے میں پازیب بچپن سے ہی ضدی اور سرکش ذہن کی مالک تھی۔

چاندنی بی نے پہلے پہل ان دونوں بچیوں کو ناچ گانے کی تربیت دینی چاہی تھی۔ گھنگھرو کی حد تک تو چاندنی بی کو کامیابی ہوئی تھی مگر پازیب اپنی تمرد مزاجی کے باعث چاندنی بی سے دور بھاگتی تھی اور اس کا بالکل کہا نہیں مانتی تھی۔ ایک بار جب چاندنی بی کے حکم پر منے خان نے پازیب کے ننھے پاؤں میں گھنگھرو باندھنے چاہے تو اس نے غصے سے وہ گھنگھرو منے خان کے منہ پر دے مارے تھے اور جب چاندنی بی نے طیش میں آ کر ننھی پازیب کی پٹائی کرنا چاہی تو یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی بڑی بہن گھنگھرو ڈھال بن کر پازیب کے آگے آ گئی اور اس نے ناچ گانا سیکھنے سے بائیکاٹ کر دیا تھا۔

اس وقت ان دونوں بہنوں کی عمریں بالترتیب گیارہ اور چودہ تھیں۔ چاندنی بی یہ دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ تب پھر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ گھنگھرو کو ہی فی الحال ''کام'' پر لگانا چاہیے۔

آہستہ آہستہ گھنگھرو کا بھی شعور جاگنے لگا۔ اس نے جوانی میں قدم رکھتے ہی اپنی بہن پازیب کی فکر کرنا شروع کی اور اسے فی الفور بورڈنگ میں داخل کراتے ہوئے باقاعدہ تعلیمی میدان میں مصروف کر دیا اور پھر تب سے آج تک اس نے کبھی پازیب کو یہاں قدم رکھنے نہیں دیا۔ البتہ خود وہ اس سے ملنے چلی جایا کرتی تھی۔

دونوں بہنوں میں بہت محبت تھی۔ چاندنی بی اگرچہ ان دونوں بہنوں کے ہی دام کھرے کرنا چاہتی تھی اور اگرچہ وہ گھنگھرو کی طرح اس کی جسارت اور ضد کے آگے چیں بہ چیں بھی ہوئی تھی مگر ہمیشہ کی طرح گھنگھرو کی ناچ گانے سے انکار کی دھمکی نے چاندنی بی کو چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پازیب اب یونیورسٹی گرلز کیمپس میں رہتی تھی۔

آج بھی جب حسب معمول چاندنی بی اور گھنگھرو کی آپس میں جھڑپ ہو گئی تو چاندنی بی نے گھنگھرو کی حد سے بڑھتی ہوئی بیزاری اور بے لگامی کو قابو کرتے ہوئے اسے اس کی شریف بہن پازیب کو یہاں لانے کی دھمکی دی تو گھنگھرو کا خوفزدہ ہونا لازمی امر تھا۔ کیونکہ گھنگھرو جانتی تھی کہ چاندنی بی کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ وہ اپنے پالتو بدمعاش دیبز دادا کے ذریعے پازیب کو ہاسٹل سے بھی اٹھوا سکتی تھی۔ یہ گھنگھرو نے چاندنی بی کو اپنی جان ضائع کر دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ چاندنی بی کے لئے یہی کافی تھا کہ چلو کم از کم گھنگھرو تو اسے کما کر دے رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس میں سے تھوڑا خرچہ اپنی بہن پازیب کو بھی متواتر بھیج رہی تھی۔



شام کا وقت تھا، ماحول میں حبس کی سی کیفیت رچی ہوئی تھی۔ بوسیدہ کچی دیواروں اور دو کمروں کے مکان کے قدرے کشادہ صحن میں دو چارپائیوں پر چار افراد انتہائی سوگواری کے عالم میں بیٹھے تھے۔ یہ غریب ہاری مٹھن کا کنبہ تھا۔ اس کی

بیمار بیوی سامنے رلی بچھی چارپائی پر اپنی بیٹی کونجاں کے ساتھ سر تھامے بیٹھی ''اللہ سائیں......رحم کر...... رب سائیں ہم غریبوں پر رحم کر......'' کا ورد کئے جا رہی تھی۔ جبکہ اس کا بیٹا سرمد اپنے باپ مٹھن کے ساتھ دوسری چارپائی پر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا باپ مٹھن اسے اپنے اور زمیندار حکم کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر چکا تھا۔

''نہیں بابا سائیں......! یہ نہیں ہوسکتا......اس کمینے موجا خان کو ہم ہی نہیں بلکہ پورا گوٹھ جانتا ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ ادی کونجاں کا ہاتھ اسے دینے کا مطلب اسے اندھے کنویں میں دھکیلنے کے برابر ہوگا۔'' سرمد اپنے کاندھوں پر دھری اجرک کو درست کرتے ہوئے باپ سے مخاطب ہوا۔

''پٹ (بیٹا)......! یہ مجھے معلوم ہے۔ پر وڈیرا سائیں......'' اس کا باپ مٹھن کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''وڈیرے کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ادی کونجاں کے بارے میں ایسے فیصلے صادر کرتا پھرے......'' سرمد، باپ کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ترخ کر بولا۔ اس کا سانولا چہرہ جوش اور غصے کی شدید کیفیت سے دوچار تھا۔ اثنائے راہ...... کونجاں آنچل میں اپنا سسکتا چہرہ چھپائے وہاں سے جا چکی تھی۔ ادھر جوان بیٹے کو جوش غیرت میں سلگتا دیکھ کر بوڑھے ماں باپ بے چارے ایک دم پریشان ہوگئے۔

''پٹ سرمد صبر کر ذرا......اللہ سائیں بہتر کرے گا......'' ناچار اس کے بوڑھے باپ نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے سرمد سے کہا تو وہ بھڑک کر ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بابا......! میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے چارپائی کی پائینتی سے ٹکی ہوئی اپنی کلہاڑی اٹھا کر کاندھے پر رکھی اور فیصلہ کن لہجے میں مزید بولا۔ ''میں خود ابھی زمیندار حکم داد کے پاس جا کر اسے صاف صاف جواب دے کر آتا ہوں کہ ہم کسی بھی صورت میں اپڑیں کونجاں کا ہاتھ اس مردود موجا خان کو نہیں دیں گے۔''

یہ سن کر اس کی بوڑھی ماں گھبرا کر اٹھی اور بیٹے کے قریب آ کر پیار بھرے اور

قدرے متوحش لہجے میں بولی۔ ''پٹ سرمد......! تو زمیندار سائیں کے پاس نا جا...... کہیں تیرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو......تو......زمیندار......بس تو یوں سمجھ لے ہم سب کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔'' وہ اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے پریشان کن انداز میں چپ ہو رہی۔

''تو ...... امڑ (ماں) ابھی کون سا ہم سکھ چین سے ہیں......؟'' سرمد ترت جواب دیتے ہوئے بولا۔

پھر چند ثانیے بعد وہ اپنی کھولتی کیفیت پر قابو پانے کی کوششیں کرتے ہوئے بڑی محبت کے ساتھ ماں کے ضعیف اور کپکپاتے وجود کو تھام کر زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے ملائمت بھرے لہجے میں بولا۔ ''امڑ گودی! (پیاری ماں) تو فکر نہ کر...... مجھے ذرا زمیندار حکم داد کے پاس تو جانے دے...... میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو ہم سب کے لئے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنے...... پر امڑ......! کیا تو یہ چاہتی ہے کہ اپڑیں پھول جیسی نازک کونجاں کو اس کمینے موجا خان کے ساتھ بیاہ دیں۔'' بیٹے کی بات سن کر ماں لاجواب سی ہو کر چپ ہو رہی اور پھر تھوڑی دیر بعد سرمد وہاں سے جا چکا تھا۔



سائیں رکھیو اور مولا داد اپنی بہن ہدایتاں کے کان بھرنے کے بعد ''بھٹائی ہاؤس'' سے جا چکے تھے مگر ہدایتاں کی پریشان کن بے چینی نے پھر اسے چین سے رہنے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اسے اب اپنے شوہر عاقل پر غصہ آ رہا تھا جو پڑھائی کے بہانے شہر میں جانے کیا گل کھلا رہا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے شہر جا کر پڑھنے پر شروع ہی سے خائف تھی اور اس نے اپنے شوہر کے سامنے دبے لہجے میں مخالفت بھی کی تھی لیکن عاقل خان نے اسے بری طرح جھڑک کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اسے اس کا یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کا شوہر عنقریب شہر سے سوتن لانے کا خواب...... بلکہ تیاری کر چکا تھا۔

پہلے تو اس کا یہ ہی ارادہ تھا کہ جب عاقل حویلی آئے گا تو اسے خوب آڑے ہاتھوں لے گی مگر اس کے دونوں بھائیوں نے اسے ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ اس نے

اپنی ہونے والی سوکن کا ہی پتہ صاف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر اس کے لئے سائیں رکھیو اور مولا داد نے اسے فوری طور پر دو لاکھ روپے کا بندوبست کرنے کو کہا تھا۔

اگرچہ یہ رقم ہدایتاں کے لئے معمولی حیثیت رکھتی تھی مگر بہرطور اسے اتنی رقم لینے کا کوئی خاطر خواہ جواز سجھائی نہیں دے رہا تھا مگر یہ جواز اسے ہر قیمت پر پیدا کرنا تھا۔ کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ ہدایتاں کو بھی ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس کے لئے اس نے اپنی چھوٹی ساس جو ایک طرح سے اس کی ہم راز اور سہیلی بھی تھی، اس سے رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کی چھوٹی ساس حاکم زادی بھی ہدایتاں کی طرح ہی ہر وقت اس فکر میں گھلی رہتی تھی کہ پوری حویلی میں صرف انہی کے حصے سے زیادہ سے زیادہ مال و دولت آئے۔ اس تگ و دو میں ان دونوں نے بچوں کی صورت میں ''نفری'' بڑھانے کی سعی بھی کی تھی مگر باوجود شادی کو سالوں سال گزرنے کے، حاکم زادی کے ہاں صرف دو ہی بچے منصب خان اور بیٹی سورٹھ پیدا ہوئے تھے اور یہی حال ہدایتاں کا تھا جبکہ بڑی وڈیرنی دراں خاتون جو سردار شیر دل خان کی پہلی بیوی تھی، کے بطن سے تین اولادیں بالترتیب بڑا بیٹا عاقل خان جو ہدایتاں کا شوہر تھا۔ دوسرا قادر بخش اور تیسری سب سے چھوٹی بیٹی راڑیں تھی۔

پورے بھٹائی ہاؤس میں ایک دراں خاتون تھیں جو نیک نفس اور ملنسار خاتون تھیں۔ اس کے برعکس اس کی سوکن حاکم زادی اور بہو ہدایتاں جوڑ توڑ رکھنے والی ذہنیت کی عورتیں تھیں۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ ہدایتاں نے اپنی چھوٹی ساس حاکم ززدی کو اس بارے میں باخبر کرتے ہوئے ساتھ ملانے کا سوچا کہ عاقل خان دوسری شادی کے چکر میں پڑ کر ایک نیا خاندان جنم دینا چاہتا ہے۔ بالالفاظ دیگر نئے ''حصے دار'' پیدا کرنا چاہ رہا ہے۔ گھاگ حاکم زادی کے کانوں میں یہ بھنک پڑی تو وہ تڑپ کر ہدایتاں سے بولی۔ ''اڑی...... ! یہ تو بڑی بری خبر سنائی تو نے ...... اور ...... تجھے پتہ ہے کہ ''دوسری'' کو شوہر زیادہ چاہتا ہے پہلی سے ...... اور یہاں تو بچوں کی قطار لگ جائے گی۔

''اس لئے تو کہہ رہی ہوں کچھ تو ہی بتا امڑ ...... کیا کروں......'' جواباً ہدایتاں نے کہا۔

اس کی بات سن کر حاکم زادی تذبذب کا شکار ہوگئی۔ جب کافی دیر بعد اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو بالآخر ہدایتاں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے دونوں بھائیوں کے ''خطرناک'' ارادے کے بارے میں بتایا۔ جسے سن کر یک دم حاکم زادی کی آنکھیں سفاک انداز میں چمکنے لگیں۔

''لیکن امڑ...... ! ایک مسئلہ ہے...... دو لاکھ روپے کہاں سے آئیں گے......''

ہدایتاں کی بات سن کر حاکم زادی یک دم بولی۔ ''اس کی تو فکر نہ کر اس کا بندوبست میں کرلوں گی کسی طرح۔ ہدایتاں اس کی بات سن کر خوش ہوگئی۔ تاہم بولی۔

''امڑ...... ! مگر اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلے۔'' حاکم زادی نے اس کی تائید میں پرخیال انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔



''سائیں وڈا...... ! یہ مٹھن ہاری کا بیٹا سرمد تو بڑی ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے۔ کیا کریں؟ اس چھوکرے کا......'' ایک منحنی سے مگر کرخت چہرے والے شخص نے اپنے سامنے بیٹھے زمیندار حکم داد سے قدرے مدھم لہجے میں مگر قدرے مکاری سے کہا۔ یہ موجا خان تھا۔

زمیندار حکم داد کا منظور نظر اور اس کا خاص آدمی۔ لوگ اس لئے اس سے بات کرنے سے بھی کتراتے تھے۔ یہ پرلے درجے کا اوباش شخص تھا۔

اس وقت مغربی افق پر شام کی کجلاہٹ دھیرے دھیرے نمودار ہو رہی تھی۔ بھربھری مٹی والے ایک خاصے وسیع احاطے میں ہالا کی بنی موٹے موٹے منقش پایوں والی رلی بچھی قدرے بڑی چارپائیوں پر موجا خان اور زمیندار حکم داد ٹانگیں لٹکائے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ زمیندار حکم داد کی اوطاق کا ایک حصہ تھا۔ جہاں پانی کا چھڑکاؤ کرکے حبس زدہ گرم فضا کو قدرے خنک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

زمیندار حکم داد نے بہ غور اپنے سامنے بیٹھے موجا خان کی بات سنی اور پھر چند ثانیے بعد اس کی گھنی بھنوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی سفاک چمک عود کر آئی اور وہ اپنی صحرائی بچھو کے ڈنک کی طرح اٹھی ہوئی مونچھوں کے نوکیلے سروں کو

مروڑتے ہوئے موجا خان کو مخاطب کر کے سفاکانہ لہجے میں بولا۔

''اڑے بابا...... موجا خان ...... ٹیڑھی کھیر کے لئے تو پھر انگلیاں بھی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں نا بابا...... تب ہی تو گھی نکلتا ہے۔ اسے اندھا کر کے مار دے...... بس......''

''سائیں وڈا......! میں حیران ہوں کہ سرمد جیسے حقیر چھوکرے نے بڑے دھڑلے کے ساتھ آپ کا حکم بھی ٹھکرا دیا۔'' شاطر موجا خان زمیندار حکم داد کو سرمد کے خلاف مشتعل کرتے ہوئے اپنے لہجے میں مکارانہ استعجاب سمیٹ کر بولا۔

حکم داد اسے یہ بات بتا چکا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کونجاں کا بھائی سرمد یہاں آیا تھا اور اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں اپنی بہن کونجاں کا رشتہ موجا خان کو دینے سے صاف صاف انکار کرتے ہوئے درخواست بھی کی تھی، وہ یعنی زمیندار حکم داد اس کے باپ مٹھن پر کونجاں کے سلسلے میں مزید کوئی دباؤ نہ ڈالے بہر طور ادھر زمیندار حکم داد اپنے چہیتے حواری موجا خان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''موجا خان......! سرمد جیسے مکار چھوکروں کو اپنے جوتوں کے نیچے مسلنا میں اچھی طرح جانتا ہوں مگر موجا خان تم میری مجبوری جانتے ہو کہ آج کل انتخابی سرگرمیاں زوروں پر ہیں اور اس بار مقابلہ بھی ٹکر کا ہے۔ بس یہی موسم ہوتا ہے جب ہم خود کو ذرا قابو کئے رکھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے مخالفوں کو ہم پر کیچڑ اچھالنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن تیرے والا مسئلہ اور ہی طریقے سے حل کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

پھر چند لمحوں کے بعد اس کے چربیلے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور وہ کچھ مضطرب سا موجا خان سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولا۔ ''موجا خان......! تیری ایک جوان بہن بھی تو ہے۔ کیا نام ہے اس کا......''

''ہاؤ سائیں وڈا......! ہے میری ایک بہن ...... بھاگی نام ہے اس کا۔'' موجا خان نے جھٹ جواب دیا۔

''بس تو پھر اٹھا کلہاڑی اور اپنی بہن بھاگی کو سرمد کے ساتھ ''کاری'' (بدکار)

کر دے اور یوں سرمد کو ''کارو'' (بدکار) قرار دے کر جان سے مارنے کی بجائے اسے صرف دہشت زدہ کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دے۔ پھر اس کی جان بخشی کی خاطر خود ہی اس کے والی وارث ''چٹی'' (ہرجانہ) یا ''بازو'' کے طور پر کونجاں جیسی شہزادی کو گڑیا کی طرح سجا کر تیرے حوالے کر دیں گے۔''

زمیندار حکم داد نے بڑی سفاکی کے ساتھ صراحت بھرے لہجے میں کہا اور موجا خان کو زمیندار کی اس زوردار ترکیب پر اپنے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی لیکن یہ سنسنی غیرت کے جذبات ردعمل کے طور پر نہیں تھی جو وجود میں ایک دم جوش غیرت کا ابال پیدا کر دیتی ہے۔ یقیناً زمیندار حکم داد کی اس شرمناک ترکیب پر کوئی بھی غیرت مند بھائی زمیندار کے سامنے اس طرح اس بات پر اپنا سر نہیں ہلا رہا ہوتا جیسا کہ موجا خان ہلا رہا تھا اور اس کے وجود میں زمیندار حکم داد کی بات سن کر انتہائی خوشی ومسرت کی لہر دوڑ گئی تھی جیسے اس نے اپنے حصول مقصد کی خاطر کوئی کارآمد گر پا لیا ہو۔

موجا خان کو اس کی پرواہ نہ تھی کہ وہ اپنے مقصد کی خاطر اپنی ہی عزت وناموس کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زمیندار حکم داد کی اس تجویز پر خوشی سے جھوم اٹھا اور نہایت کمینگی سے مسکراتے ہوئے ازراہ تہنیت بولا۔

''واہ سائیں واہ......! آپ نے تو کمال کر دیا۔ کیا ترکیب لڑائی ہے سائیں......'' اور حکم داد اس کی خوشامدانہ گفتگو پر دھیرے دھیرے اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔



سرمد اپنے گھر پہنچا تو حسب توقع اس کا چہرہ غصے اور جوش غیرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ گھر والے اس کی ہیجانی کیفیت پر دہل گئے تھے۔ وہ سیدھے سادے معصوم لوگ تھے جو بلاشبہ زمیندار حکم داد سے دشمنی یا مخالفت مول لینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سرمد کے گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی ان بے چاروں کو یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ کہیں سرمد جوش غیرت میں آ کر زمیندار کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھے جس کا خمیازہ ان سب کو بھگتنا پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی سرمد گھر میں داخل ہوا تو اس کا بوڑھا باپ مٹھن اس کی طرف لپکا۔

”پٹ......! خیریت تو رہی ناں ......کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی نا ......تو نے وڈے سائیں سے......“

”میں اس کتے ......موجا خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ سرمد اپنے کاندھوں سے اجرک اتار کر قریب پڑی چارپائی پر پھینکتے ہوئے غضبناک لہجے میں بولا۔”بزدل کہیں کا ......زمیندار حکم داد کو بیچ میں ڈال کر ہم پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس خبیث موجا خان کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ ایک تڑی میں اسے بھی لگانا چاہتا تھا، کمبخت ملا نہیں مجھے ......مردود کہیں کا......“ یہ کہتے ہوئے اس نے حقارت سے کچے فرش پر تھوک دیا۔

بوڑھا مٹھن فوراً اپنے کڑیل اور غیرت مند بیٹے کو سنبھالتا سمجھاتا ہوا چارپائی پر اسے لے کر بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں سامنے کے کمرے سے ہراساں کونجاں بھی بھائی کی غیرت میں سلگتی حالت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے لئے پانی کا گلاس بھر لائی اور ماں اس کی بے چاری اللہ سے اپنے بیٹے کے سر کی خیر کی دعائیں مانگنے لگی۔

”رب سائیں ......ہم گریبوں پر اپنا رحم کرنا۔“ پھر وہ بے چاری پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور کونجاں سسکتی ہوئی اپنی ماں کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھی۔



دور مغرب میں ڈوبتے سورج کے سرخی مائل سناٹے اترے ہوئے تھے۔ ہرے بھرے کھیتوں سے آنے والی گرم ہوائیں اب خنک ہونے لگی تھیں۔ ”بھٹائی ہاؤس“ سے ملحقہ اوطاق سے قادر بخش نکل کر اپنی جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دفعتاً اس کی نظر اوطاق کے احاطے میں داخل ہوتے سرمد پر پڑی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔ قادر بخش نے اس کی عجلت آمیز چال سے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔

”آؤ دوست......! کیسے ہو......؟ میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔“ سرمد کے قریب آتے ہی قادر بخش بڑے تپاک کے ساتھ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا تو سرمد نے کہا۔”قادر بخش میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔“ اس کا لہجہ خاصا سپاٹ تھا۔

قادر بخش نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اوطاق کے سائبان تلے بچھی ایک چارپائی پر لا بٹھایا اور خود سامنے رکھے سرکنڈوں کے ایک مونڈھے پر براجمان ہو کر بیٹھ گیا اور سرمد سے مستفسر ہوا۔

”ہاں سرمد......اب بتاؤ کیا بات کرنی ہے۔“

سرمد کے خاموش چہرے پر ایک ابال کی کیفیت تھی جس پر وہ قدرے قابو پاتے ہوئے بولنا شروع ہوا۔”زمیندار حکم داد کو تو تم جانتے ہی ہونا......“

”ہاں ...... ہاں کیوں نہیں ...... وہ میرے ادا سائیں عاقل خان کا سسر ہے۔“ قادر بخش اب کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بولا تو سرمد نے فوراً کہا۔”تو بس پھر اسے اچھی طرح جا کر سمجھا دو کہ وہ اپنی مرضی ہم پر مسلط نہ کرے۔ ہم گریب ضرور ہیں پر اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔“

”یار سنگت (دوست)......! آخر بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہے......؟“ اگرچہ قادر بخش اچھی طرح جانتا تھا کہ سرمد کیا کہنا چاہتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ دانستہ انجان بنا رہا۔ اس میں بھی ایک تعمیری مصلحت اندیشی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرمد کو پتہ چلے کہ اس کی بہن کونجاں نے اسے زمیندار حکم داد کے عزائم کے بارے میں اسے پہلے ہی سے آگاہ کر دیا ہے۔

سرمد نے قدرے تفصیلاً قادر بخش کو ساری بات بتا دی اور آخر میں تنبیہی لہجے میں بولا۔”دیکھو یار قادر بخش ...... زمیندار حکم داد تمہارا عزیز ہے، اس لئے میں نے اس سے زیادہ الجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا، اس کی سانس پھول رہی تھی۔

قادر بخش پر سوچ نظروں سے سرمد کے تمتماتے بشرے کو یک ٹک تکتا رہا۔ پھر قدرے پرسکون لہجے میں بولا۔”سرمد......! تم نے مجھے ان حالات سے آگاہ کر کے اچھا کیا۔ اب تم یہ معاملہ میرے سپرد کر دو۔ میں حکم داد سے نمٹ لوں گا۔ چھوڑ اب چھوڑو ان باتوں کو......کیا پیؤ گے؟ ٹھہرو......تمہیں مکھن والی لسی پلاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بلند آواز سے ایک نوکر کو لسی لانے کا کہا۔ سرمد کا چہرہ اب بتدریج پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔



سولہ سترہ سالہ الھڑ بھاگی عام شکل وصورت کی ایک معصوم لڑکی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کا بڑا بھائی موجا خان اسے یوں اچانک آخر کدھر لے جا رہا ہے۔ وہ بے چاری چپ اللہ میاں کی گائے بنی کھیتوں کے بیچ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر اپنے بھائی موجا خان کے پیچھے پیچھے حیران و پریشان چلی جا رہی تھی۔

اس معصوم کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ساتھ اس کا بے غیرت بھائی کیا سلوک کرنے والا تھا زن اور زر کی ہوس نے اسے اس قدر اندھا کر ڈالا تھا کہ وہ اس کی خاطر اپنی بے گناہ معصوم بہن کو اپنی حرص وطمع کی بھینٹ چڑھانے کے لئے موت کا ہرکارہ بنا ہوا تھا اور بھاگی بے چاری کو تو سان وگمان بھی نہ تھا کہ اس پر کون سی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

چلتے چلتے راستے میں ایک جگہ پر اس کے بھائی موجا خان کے چند کلہاڑی بردار ساتھی بھی آن ملے تھے، جنہیں دیکھ کر پہلی بار بھاگی کے نازک دل میں خدشے کی ایک تیز دھڑکن نے سر ابھارا تھا اور وہ ایک لخت بے چین سی ہو کر سہمی ہوئی مستفسرانہ نظروں سے اپنے بھائی موجا خان کی طرف تکنے لگی تھی مگر وہاں موت جیسی سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔ موجا خان چند ثانیے کھڑا اپنے نووارد ساتھیوں کے ساتھ اشاروں کنایوں میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سب ایک جانب لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی جانب مڑ گئے۔ ذرا پرے نہنگ، کھجور اور کھو کے لانبے لانبے گھنے درختوں کا سلسلہ گندم ومکئی کی فصلوں کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔

وہاں قریب ہی ایک جگہ پر انہیں سرمد بھی کھیتوں میں کام کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ان سب کی رفتار تیز ہوگئی۔ بھاگی بے چاری ہنوز ڈری سہمی کسی انجانے خدشات کے زیر اثر ان کے ہمراہ چل رہی تھی۔ اسے اپنے کرخت مزاج اور غصیلے بھائی موجا خان سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

پھر اچانک ایک مقام پر موجا خان کے قدم ڈرامائی انداز میں رک گئے اور وہ یک دم بڑے خوفناک انداز میں سراسیمہ کھڑی اپنی بہن بھاگی کی طرف گھوما۔ وہ بے چاری بھی رک کر اب خزاں رسیدہ پتے کی مانند تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ادھر موجا خان

نے اپنے کلہاڑی بردار ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا اور اپنے کاندھے سے کلہاڑی اتار کر سفاک نظروں سے لرزیدہ بھاگی کو گھورنے لگا۔

بے چاری بھاگی کے ستے ہوئے چہرے پر موت کی سی زردی کھنڈ آئی تھی اور وہ فوراً اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بھائی سے گڑگڑا کر بولی۔ اسے شاید موجودہ صورت حال کی ہولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔

''ادا سائیں......! اللہ واسطے ...... دھڑیں واسطے ...... مم ...... میں بے قصور ہوں۔ مم ...... مجھے مت مارو......''

ابھی اس بے چاری نے اتنا ہی کہا تھا کہ موجا خان نے اپنی کلہاڑی بلند کی اور اونچی آواز میں ''کارو ...... کاری ہے ...... کاری ہے......'' کہتے ہوئے کلہاڑی کا وار اس ک سر پر کیا۔

معصوم بھاگی نے وحشت زدہ ہو کر خود کو کلہاڑی کے سفاک وار سے بچانا چاہا لیکن صرف اتنا ہوا کہ کلہاڑی کا مہیب پھل اس کے سر کے بجائے نازک کاندھے میں پیوست ہو گیا۔ بھاگی بے چاری کے حلق سے برآمد ہونے والی لرزہ خیز چیخ نے ذرا دور اپنے کام میں مگن سرمد تک کے دل کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ چونک کر چیخ کی سمت متوجہ ہوا۔

ادھر موجا خان اور اس کے ساتھیوں نے بھاگی کے نازک بدن پر پے در پے وار کر کے اس کا قیمہ بنا ڈالا۔ اس دوران سرمد بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا ''جائے واردات'' پر پہنچا اور یہی مکار موجا خان چاہتا تھا۔ اس نے اپنی خونی اور سفاک آنکھوں سے قریب کھڑے سرمد کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کی جانب اپنی کلہاڑی اٹھا کر کارو ہے ...... کارو ہے ...... کہتا ہوا لپکا تو سرمد ایک لمحے کو بدحواس سا ہو گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کون سی سازش کھیلی جا رہی تھی۔ تاہم موت کو اپنے سر پر اچانک موجود پا کر اس نے وہاں سے راہ فرار میں ہی عافیت جانی۔ وہ ایک جانب دوڑ پڑا۔

شاطر موجا خان اور اس کے ساتھی دانستہ تھوڑے فاصلے تک سرمد کے پیچھے

باآواز بلند ''کارو ہے ...... کارو ہے......'' چلاتے ہوئے دوڑتے رہے۔ پھر اس کے بعد موجا کے مخصوص اشارے پر وہ سب اپنی جگہ رک گئے اور موجا خان بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے دور تک سرمد کو حواس باختہ سرپٹ دوڑتے دیکھتا رہا۔ سرمد کو دانستہ فرار ہونے کا موقع دے دیا تھا کیونکہ اسے ہلاک کرنا موجا خان کے منصوبے میں شامل نہ تھا۔



شہر میں دھواں اگلتی گاڑیوں کا ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ گھنگھرو کالے رنگ کا برقعہ اوڑھے ایک ٹیکسی میں سوار تھی۔ اس کے ہمراہ مخنی صورت و شکل کا شخص بھی براجمان تھا۔ یہ منے خان تھا جو اس وقت بڑے بھونڈے انداز میں پان کی جگالی کر رہا تھا۔ ٹیکسی اب حیدرآباد شہر سے کافی دور مضافات میں نکل آئی تھی۔ اب جامشورو کی حدود شروع ہو چکی تھی۔

پھر ٹیکسی جامشورو پھاٹک کراس کرتی ہوئی یونیورسٹی کے کیمپس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

گھنگھرو اس وقت میک اپ سے عاری تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ عام سے لباس اور برقعے میں ملفوف یہ وہی سج دھج رکھنے والی مشہور مغنیہ ہے، جس نے ایک عالم کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ منے خان کی موجودگی کسی نہ کسی طور اس کی اصل شناخت کا پول کھول سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھنگھرو کو اس کی موجودگی بری طرح خائف کر رہی تھی لیکن یہ چاندنی بی کا حکم تھا اس لئے وہ مجبور اور خاموش تھی۔

گھنگھرو جب بھی اپنی بہن پازیب سے ملنے گرلز ہاسٹل جاتی تھی تو وہ منے خان کو ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہنے کا سختی سے حکم دے جاتی تھی۔ لہٰذا جیسے ہی ٹیکسی گرلز ہاسٹل کے مین گیٹ کے باہر رکی تو گھنگھرو گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور سیدھی اندر داخل ہو گئی۔

اس وقت شام کے چھ بجے کا وقت تھا اور دریائے سندھ سے آنے والی ہواؤں نے دن بھر چلنے والی گرم، حبس زدہ لو کے تھپیڑوں کو خنکی میں بدل ڈالا تھا۔ گھنگھرو اپنا

نقاب الٹے سیدھی ہاسٹل کی عمارت کے ایک وزیٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں موجود چائے پیتی ہوئیں چند لڑکیوں سے اس نے پازیب کے بارے میں پوچھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ سیدھی پازیب کے روم میں جانے کی بجائے ادھر ہی وزیٹنگ روم میں آ بیٹھتی تھی۔ ذرا دیر بعد پازیب کو اطلاع کر دی گئی۔ اس نے پھولدار لون کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں بہنیں آپس میں گلے ملیں اور ایک دوسرے کے گال چومے۔

''آئیں باجی ...... روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میری روم میٹ اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔ میں اکیلی ہوں۔'' پازیب نے دھیرے سے کہا اور پھر دونوں بہنیں باتیں کرتیں، مسکراتیں روم میں آ گئیں۔

روم میں قالین بچھا ہوا تھا۔ دو سنگل بیڈ تھے اور دو دیوار گیر الماریوں کے علاوہ ایک اسٹڈی ٹیبل اور چیئرز رکھی ہوئی تھیں۔ پازیب اور گھنگھرو آپس میں بہنیں ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی سہیلیاں بھی تھیں۔ اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتی تھیں بلکہ گھنگھرو تو پازیب کے لئے باجی، ماں اور سب کچھ تھی۔ گھنگھرو کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ یہاں کم ہی آئے۔ اس مرتبہ بھی پازیب نے ہی اسے کوئی اہم بات کرنے کے لئے بلایا تھا۔

''چلو ...... پازی بغیر کسی تکلفات کے شروع ہو جاؤ۔ تمہیں کون سی بات کرنی تھی مجھ سے؟'' ایک کرسی پر براجمان ہوتے ہی گھنگھرو نے پازیب کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شفقت آمیز انداز سے کہا۔ تو چند ثانیے کے بعد پازیب اپنی نظریں قدرے نیچے کئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''آپی ......! وہ ...... عاقل کا اسرار بڑھتا جا رہا ہے۔''

پازیب کی بات سن کر گھنگھرو نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز رکھیں اور بولی۔

''تم دونوں میں کس حد تک انڈراسٹینڈنگ ہو چکی ہے؟''

اپنے اور عاقل کے بارے میں پازیب نے اپنی بہن سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ گھنگھرو نے کسی خیال کے تحت پازیب سے پوچھا تو پازیب کے چہرے پر ذرا

تذبذب کے سے آثار نمودار ہوئے پھر وہ بولی۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ عاقل شادی شدہ ہے۔ آپی! میں کس طرح ایک معصوم عورت پر سوکن بن کر جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو پا رہا۔'' اتنا کہتے ہی پازیب کی آنکھوں سے نمی چھلکنے لگی اور لہجہ از حد رقت آمیز ہو گیا۔

گھنگھرو خاموشی کے ساتھ پازیب کے چہرے پر نظریں جمائے تکتی رہی۔ وہ اتنا تو بھانپ گئی تھی کہ نہ صرف عاقل بلکہ پازیب بھی اس کی آتش الفت میں سلگ رہی ہے۔ مگر دل کے بیچ ضمیر کی خلش آڑے آ گئی تھی جس نے پازیب کو جھنجھوڑ سا ڈالا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ عاقل کو کبھی کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ گھنگھرو ایک جہاندیدہ لڑکی تھی۔ بہ ظاہر وہ بڑے غور اور تدبر کے ساتھ اپنی بہن پازیب کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھی لیکن درحقیقت اسے پازیب کی اس ذہنی حالت پر تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ''ہاں اور نا'' کے بیچ معلق رہنا کتنا خطرناک ہوتا ہے، یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ گھنگھرو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پازیب کو کس طرح تسلی دے۔ تاہم وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پازیب کے پاس بیڈ پر آ بیٹھی اور اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ''دیکھو پازیب......! اگرچہ دوسری شادی کرنا خالصتاً مرد کا اپنا ذاتی فعل ہوتا ہے۔ مگر تم پر بھی کچھ اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے۔ تم ایسا کرو فی الحال اس مسئلے کو اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا بہانہ کر کے ٹالتی رہو۔ یہی ایک صورت ہے۔''

گھنگھرو کی بات سے پازیب کو ذرا تسلی ہوئی اور اس نے اپنے دوپٹے سے اپنی غمناک آنکھیں پونچھتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔



پہر رات گزر چکی تھی۔ ایک کچے مگر کشادہ کمرے کی دیواروں پر کمزور بلب کی یرقان زدہ روشنی میں عجیب سوگواریت سی طاری تھی۔ ایک کھری چارپائی پر انتہائی ضعیف عورت اپنا دودھیا چونڈا تھامے سسک رہی تھی۔ یہ بوڑھی عورت موجا خان کی ماں تھی جو اپنی معصوم اور جوان بے گناہ بیٹی بھاگی کی المناک موت پر جانے کب سے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اپنے بدقماش بیٹے موجا خان کے ''کرتوتوں'' سے اچھی

طرح واقف تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بیٹے موجا خان نے اپنی معصوم بہن بھاگی کو اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے سرمد جیسے شریف لڑکے کے ساتھ بے گناہ ''کاری'' قرار دے کر اسے قتل کر ڈالا تھا اور اس بہیمانہ فعل کے درپردہ موجا خان کی کیا غرض پوشیدہ تھی یہ موجا خان کی ماں اچھی طرح جانتی تھی۔

بیٹی کی جوان موت نے بے چاری کو بالکل ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک بھاگی ہی تو تھی جو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ ورنہ موجا خان کو تو سوائے تیتر اور مرغ لڑانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ صبح کا جاتا تو کہیں رات گئے ہی لوٹتا تھا۔ اس بے چاری کا تو جیسے اب سب کچھ چھن چکا تھا۔ مارے غم کے اس کا دماغ الٹنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کا بیٹا موجا خان رات گئے مسرور مسرور سا لوٹا تو اس وقت اس کی بوڑھی ماں کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور شدت غم سے نڈھال ہو کر اس نے موجا خان کا گریبان اپنے کپکپاتے بوڑھے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''تت...... تو نے...... تو نے...... میری پھول سی معصوم بھاگی کو مار ڈالا۔ ظالم تو نے کیوں لالچ میں اندھا ہو کر میری بے گناہ بچی کو مارا۔ بول کیا بگاڑا تھا غریب نے تیرا ......بول......''

''ماں......! یہ کیا کہہ رہی ہے تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے تو......'' موجا خان نے بڑی ڈھٹائی سے قدرے درشت لہجے میں اپنا گریبان ماں کے لرزیدہ ہاتھوں سے چھڑایا اور بولا۔ ''وہ بدکار تھی...... وہ کاری تھی...... میں نے وہی کیا جو ایک غیرت مند بھائی کو کرنا چاہئے تھا۔''

''نہیں تو جھوٹ بولتا ہے...... میں جانتی ہوں۔ سب پتہ ہے مجھے...... تو نے...... بھاگی کو کیوں قتل کر ڈالا۔ مم...... میں...... وہ......'' غم و غصے کی شدت سے بیچاری اپنا جملہ پورا نہ کر سکی، اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

موجا خان غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی بوڑھی ماں کھانستے کھانستے بے حال ہو کر فرش پر ڈھیر ہو چکی تھی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک چکا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔



"یہ لے ہدایتاں ...... سنبھال ان روپوں کو پورے ایک لاکھ ہیں۔" حاکم زادی نے ہدایتاں کے ہاتھ میں نوٹوں کی دس گڈیاں تھمائیں جسے ہدایتاں نے مسرت اور کچھ الجھن آمیز انداز میں فوراً اپنی چادر کے اندر چھپا لیا۔ الجھن اسے دو لاکھ کی بجائے صرف ایک لاکھ ملنے کی تھی ...... اور وہ اس کا دبے دبے لہجے میں اظہار کئے بنا نہ رہ سکی بولی۔ "امڑ ......! یہ کیا ......؟ باقی کے ایک لاکھ ......؟"

"اڑی ...... تو بھی تو کچھ ہاتھ پیر چلا ...... ایک لاکھ میں نے کیا ایک لاکھ کا تو خود بندوبست کر ...... آخر یہ مسئلہ تو اصل میں تیرا ہی ہے۔" جہاندیدہ حاکم زادی نے ہاتھ نچاتے ہوئے قدرے سرگوشی میں جواب دیا اور ہدایتاں اپنے سر کو خفیف سی جنبش دے کر چپ ہو رہی۔

وہ جان گئی تھی کہ حاکم زادی اگر چاہتی تو اسے پورے دو لاکھ روپے دے سکتی تھی۔ بہر طور ...... سر دست اتنا ملنا بھی اسے بہت لگا۔

اس وقت شام کی سرمئی ملگجاہٹ بھٹائی ہاؤس کے بلند و بالا در و دیوار پر تھکے تھکے پنچھی کی مانند اتر رہی تھی۔ حاکم زادی ہدایتاں کو روپے تھما کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ ایک تیس پینتیس سالہ خاصی پرکشش عورت تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور بھاری بھاری ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ خاصی دبنگ قسم کی خاتون نظر آتی تھی۔ اس وقت حسب معمول اس نے سندھی کڑھائی کا جھلمل جھلمل کرتا کرتہ اور خوبصورت پائینچوں والی اجرک کے رنگ کی شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ دو جوان بچوں کی ماں بننے کے باوجود ہر سے نوبیاہتا دلہن کی طرح سج دھج کر رہتی تھی ...... شاید وہ جانتی تھی کہ دوسری شادی کرنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی دوسری بیوی سے کیا چاہتا ہے۔ ہر سے نوبیاہتا دلہن کی طرح بنا سنورنا حاکم زادی کا ایک ایسا ہتھیار تھا جس سے اس نے

اپنے ادھیڑ عمر شوہر سردار شیر دل خان جیسے دبنگ شخص کو اپنی زلفوں کا اسیر بنایا ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر حاکم زادی نے شیشم کی لکڑی کے بنے بڑے سے بیضوی آئینے والی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر تنقیدی نظروں سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر سیدھی اپنے شوہر سردار شیر دل خان کے کمرے میں آ گئی۔

کمرے کے وسط میں ایک جہازی سائز اور خوبصورت ڈیزائن والی مسہری پر سردار شیر دل خان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھا۔ جسم خاصا بھاری بھرکم اور سرخ و سفید تھا۔ چہرہ باریش تھا۔

"میرے سر کے سائیں کی خیر ہووے ...... کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" دروازے پر کھڑے ہو کر حاکم زادی نے انتہائی ادب کے ساتھ کہا۔

اس کی مترنم آواز پر سردار نے گھنی سفید بھنوؤں سے ڈھکی ہوئی غلافی آنکھوں سے حاکم زادی کی طرف دیکھا اور بھاری آواز میں اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آ جاؤ۔"

پروانۂ راہداری پاتے ہی حاکم زادی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی مسہری کے قریب رکھے ایک بڑے سے مونڈھے پر براجمان ہو گئی۔ اس کے وجود سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"کوئی بات کرنی ہے مجھ سے ......؟" سردار نے بہ غور اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا تو مکار حاکم زادی ایک نیم آزردہ سی ہنکاری بھر کر بولی۔

"رب سائیں ......! اس حویلی کی خوشیوں کو کسی راکاس (شیطان) کی نظر بد سے بچائے ...... بے شک میں اس گھر کی چھوٹی ماں سہی ...... پر میرا دل کبھی کبھی کڑھتا ہے۔"

"کیوں ......؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟" سردار شیر دل خان بدستور اس پر نظر جمائے بولا۔

"بس سائیں ...... اس خاندان کی عزت کی خاطر خاموش ہوں مگر ......" شاطر حاکم زادی نے کہتے کہتے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو سردار کی آواز کمرے میں گونجی۔

"حاکم زادی......! جو کہنا ہے کہو...... تجھے معلوم ہے۔ یہ پہیلیوں والا انداز مجھے بری طرح کھٹکتا ہے۔"

"ہاؤ......سائیں...... ہاؤ بتاتی ہوں۔" مکار حاکم زادی ایک دم گھبرا کر بولی۔

"میں اپڑیں فرض سے مجبور ہوں، اسی لئے بتانا ہی پڑے گا۔ آپ کا بیٹا...... میرا مطلب اپڑاں پٹ...... عاقل خان...... دوسری شادی کر رہا ہے۔" اس کی بات سن کر خلاف توقع سردار شیر دل خان ایک آسودہ سی سانس خارج کر کے مسکراتے لہجے میں بولا۔

"اڑی تو اس میں کون سی برائی ہے......ہم نے بھی تو تیرے سے دوسرا بیاہ کیا تھا۔ کیا ہم نے یہ غلط کیا تھا؟"

"بالکل نہیں سائیں مان وارا......" حاکم زادی ایک دم بولی پھر پینترا بدل کر کہا۔ "دوسرا بیاہ بری بات تو نہیں...... پر......شاید یہ بات اپڑیں نوں (بہو) کو بری لگی ہے۔"

"یہ ایک عام اور فطری بات ہے۔" سردار نے لاپرواہانہ انداز میں کہا۔

"......لیکن ہم اپڑیں عاقل کو اچھی طرح جانتے ہیں...... وہ دونوں سے انصاف کرے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سائیں! پر......اپڑیں نوں (بہو) ہدایتاں......تو کچھ اور ہی چکر چلا رہی ہے......جس میں اس نے اپریں دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد کو بھی ساتھ ملایا ہوا ہے۔"

حاکم زادی نے بڑی مکاری سے انکشاف کیا اور پہلی بار سردار شیر دل خان کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔ "کیا مطلب...... ہم سمجھے نہیں...... کھل کر بات کرو۔"

اس کی بات سن کر مکار حاکم زادی نے پھر چال بدلی اور قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔ "سائیں......! وہ بات آپ کو میں بتا تو دوں...... پر ڈرتی ہوں...... میرا نام آنے سے، میں کہیں بری نہ بن جاؤں۔"

"حاکم زادی......! جب تم ہماری نظروں میں بری نہیں ہو تو دوسروں کی پرواہ

کیوں کرتی ہو۔ اب بتاؤ مجھے، کیا بات ہے؟" سردار کی بات سن کر حاکم زادی قدرے مطمئن لہجے میں بتانے لگی۔

"سائیں......! اپڑیں پٹ......! عاقل کی ایک دوست ہے جو شہر میں اس کے ساتھ ہی پڑھتی ہے...... عاقل اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے مگر کسی طرح...... ہدایتاں کے بھائیوں کو اس کا پتہ چل گیا اور انہوں نے اپڑیں بہن کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ اگر وہ اپڑیں سوکن سے بچنا چاہتی ہے تو اس کو راستے سے ہی ہٹا دے اور اس کے خاتمے کے لئے...... اس کے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد نے...... اپڑیں بہن ہدایتاں سے دو لاکھ روپے مانگے ہیں۔" اتنا بتا کر وہ خاموش ہوئی تو سردار شیر دل خان کے بھاری بھرکم وجود میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا اور وہ قدرے بدک کر مسہری سے اٹھ بیٹھا...... اور اپنی بیوی حاکم زادی کی طرف گھورتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں بولا۔ "کیا تو سچ کہہ رہی ہے......؟"

"سائیں......! مجھے جھوٹ بول کر کون سا فائدہ پہنچے گا۔ ہاں یہ نقصان ہو گا کہ میں آپ کی نظروں کے سامنے ہمیشہ کے لئے گر جاؤں گی...... جو میرے لئے موت سے بڑھ کر سزا ہو گی۔"

اس کی بات سن کر سردار اٹل لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے...... پھر اسی وقت میں ہدایتاں کو بلاتا ہوں۔"

"نا سائیں نا......اس طرح نہیں...... یوں حویلی کی عزت چھوٹے لوگوں کے کانوں تک پہنچے گی۔ ہدایتاں سے نمٹنے کا آسان طریقہ میں بتاتی ہوں۔" حاکم زادی لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ "ہدایتاں...... کو اپڑیں ہونے والی سوتن کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے...... دو لاکھ روپوں کی ضرورت ہے جو وہ اپنے دونوں بھائیوں کو دے گی۔ ایک لاکھ کا بندوبست وہ کسی طرح کر چکی ہے...... باقی ایک لاکھ کی رقم، ہو سکتا ہے آپ سے لینے کی کوشش کرے۔ بس یہی وقت ہو گا جب آپ اس سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں۔" مکار حاکم زادی نے کہا اور سردار کے بشرے پر گمبھیر خاموشی چھا گئی۔

مکار حاکم زادی اپنا خطرناک چلتر چلنے کے بعد وہاں سے سیدھی دوبارہ

ہدایتاں کے پاس آئی ...... اور اس سے پُر مسرت لہجے میں بولی۔ ''دیکھ ڑی نوں (بہو) ......! میں تیرا کام کر آئی ہوں تو ایسا کر ...... اپڑیں بڑی ساس دراں خاتون سے ایک لاکھ روپے مانگ لے۔ مجھے یقین ہے ...... وہ نہ نہیں کرے گی ...... میں نے اشاروں میں اسے بتا دیا ہے کہ تیرے کسی بھائی کا بچہ بیمار ہے۔ اسے ضرورت پڑ گئی ہے ...... بعد میں وہ لوٹا دے گا۔''

ہدایتاں اپنی سوتیلی چھوٹی ساس کی بات سن کر ایک دم خوش ہو گئی ...... اور حاکم زادی کے ہاتھ تھام کر اسے چوم کر بولی۔ ''امڑ ......! تو میری سوتیلی سہی پر سگی ساس سے بڑھ کر اچھی نکلی۔ میں ابھی اپنی ساس کے پاس جاتی ہوں۔''

''نا ...... نا دھیئے ......! ابھی اتنی جلدی نہ کر ...... رات کے کسی پہر اس سے یہ بات کرنا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' وہ مکار لومڑی یہاں سے نکل کر سیدھی ...... اپنی بڑی سوکن عاقل خان کی ماں دراں خاتون کے پاس پہنچی۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ سیدھی سادی عام شکل وصورت کی عورت تھی۔

''ادی کیسی ہو ......؟'' حاکم زادی اپنے لہجے میں دنیا جہان کا خلوص سمیٹتے ہوئے بولی۔

''ہاؤ ...... میں ٹھیک ہوں ...... تو کیسی ہے سائڑ (سہیلی)'' جواباً دراں خاتون نے بھی پرخلوص انداز میں کہا ...... اور حاکم زادی اپنے چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ ''ادی ...... تو مجھے سائڑ (سہیلی) کہتی ہے ناں تو میرا دل بڑا خوش ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ سے ذرا بھی ناراض نہیں ...... اور میں تیری سوتنی نہیں بلکہ بہن ہوں۔''

''تو واقعی میری بہن ہے ...... میں نے تجھے آج تک اپنی سوتنی کی طرح نہیں دیکھا۔'' جواباً دراں خاتون صاف گوئی سے ملائمت سے بھرے لہجے میں بولی ...... تاہم اسے حیرت ضرور تھی کہ حاکم زادی ...... جیسی دبنگ عورت جو اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھا لیا کرتی تھی آج اتنی بدل کیسے گئی تھی۔ دراں بے چاری خود ایک سادہ طبیعت اور ملنسار عورت تھی۔ وہ حاکم زادی کا چلتر کیا سمجھتی کہ وہ مکار عورت اس کے اور ہدایتاں کے ساتھ درون خانہ کسی قسم کی چومکھی لڑ رہی تھی۔

''ایک کام تھا، تجھ سے ...... بلکہ یہ میرا کام تو نہیں ہے یوں سمجھ تیری آپڑیں ہی نوں (بہو) ہدایتاں کا ہے۔''

دراں خاتون ایک دم بولی۔ ''ہاں ...... ہاں ...... بتا مجھے ...... پر ...... ہدایتاں میرے پٹ عاقل کی گھر والی ہے۔ وہ خود مجھ سے آ کر بھی بول سکتی تھی ...... اچھا چل بتا ...... کیا بات ہے؟''

''وہ بے چاری تیرے پاس آنے سے ذرا جھجک رہی تھی ...... بات ہی ایسی تھی اسی لئے اس نے مجھے تمہارے سے بات کہنے کی گزارش کی تو میں نے اسے فوراً اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا کہ چری تو بھی تو میری نوں راڑیں (بہورانی) ہے۔ عاقل میرا بھی پٹ ہے۔ مجھے تو بڑا ترس آیا اس کی بات سن کر۔'' حاکم زادی نے بڑی مکارانہ معصومیت سے کہا اور سادہ لوح دراں خاتون ایک دم پریشان ہو گئی۔'' بتا تو سہی کیا بات ہے آخر؟''

حاکم زادی نے ایک ہنکاری بھری اور بولی۔ ''اس کے بھائی کے ایک بیٹے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے ...... اب اسے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ بے چاری ہدایتاں کو تجھ سے مانگنے سے شرم آ رہی تھی۔ پھر اس کا شوہر بھی تو یہاں نہیں ہے۔ وہ ہم سے نہیں کہے گی تو اور کس سے کہے گی۔''

اس کی بات سن کر دراں خاتون کے چہرے پر پریشانی اور سوچ کی لکیریں مزید گہری ہو گئیں۔ اسے گومگو میں مبتلا پا کر حاکم زادی دوبارہ مکارانہ انداز سے بولی۔ ''پہلے میں نے یہی سوچا کہ اپڑیں سائیں وڈے سے خود بات کروں مگر پھر یہ سوچ کر روپوں پیسوں کا معاملہ ہے ...... تیرے سے ہی کہوں مرد چاہے جتنی شادیاں کر لے۔ آخر کو بھروسہ پہلی بیوی پر ہی کرتا ہے۔''

دراں خاتون کو یہ بات سن کر خود پر ایک فخر سا محسوس ہونے لگا اور پھر وہ حاکم زادی کا مطلب سمجھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی۔ ''ٹھیک ہے ...... میں خود سائیں ...... سے بات کروں گی۔ وہ یقیناً میرا کہا نہیں ٹالیں گے۔''

''تیری وڈی مہربانی سائڑ (سہیلی) تو نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔'' مکار حاکم زادی نے ایک دم خوش ہو کر کہا اور سادہ لوح دراں خاتون حاکم زادی کو

خوش دیکھ کر اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی کہ حالانکہ عاقل خان اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ مگر اس کی بیوی کے لئے اپنی سوتن کو مضطرب محسوس کر کے دراں خاتون کے دل میں اپنی سوتن کی قدر و قیمت سوا ہونے لگی۔ مگر وہ معصوم عورت اپنی سوتن کے چلتر سے یکسر ناواقف تھی ...... کہ وہ بیک وقت اس کی بہو اور خود اس کے ساتھ کیا چال چل رہی تھی۔ جاتے جاتے حاکم زادی نے آخری بار انکسارانہ گزارش کرتے ہوئے دراں خاتون سے کہا۔ ''سائیں......! بس ایک بات کا خیال رہے کہ میرا ناں...... (نام) بیچ میں نہ آئے ...... دوسری ہوں ناخواہ مخواہ مجھ پر بات آ جائے گی۔ اب کسی کو کیا معلوم کہ مجھے اس حویلی کی خوشیاں کتنی عزیز ہیں۔''

دراں خاتون یہ سن کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنی سوتن کو گلے سے لگا لیا۔

سادہ لوح دراں خاتون یہ منظر دیکھنے سے قاصر تھی کہ اس کے کاندھے پر ٹھوڑی رکھے پشت کی سمت دیکھتے ہوئے حاکم زادی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں ہے۔



سرمد کو ''کارو'' قرار دیئے جانے کے بعد پورے گوٹھ میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اس واقعے پر جہاں بعض لوگوں کو دکھ تھا وہاں حیرت بھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرمد کی نیک نفس طبیعت سے سب ہی واقف تھے۔ سرمد اسی دن سے اپنی جان کے خوف سے کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ زیادہ رنج اس کے دوست قادر بخش کو ہو رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس اندوہناک سانحے کی اصل حقیقت سے واقف تھا۔ اس نے اپنے طور پر اپنے دوست سرمد کو تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مزید برآں وہ اس کے گھر بھی گیا تھا۔

اب وہ اپنی جیپ میں سوار سیدھا موجا خان کے پاس پہنچا۔ حسب توقع وہ اسے زمیندار حکم داد کے اوطارے میں ملا ...... وہاں حکم داد خود تو موجود نہ تھا البتہ موجا خان کے ہمراہ اس کے دو تین کارندے وہاں ضرور تھے۔

قادر بخش کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے یہ بات متعلقہ تھانے سے معلوم ہو چکی تھی کہ موجا خان نے اپنی معصوم بہن بھاگی کو قتل کرنے کے بعد اسی وقت

رضاکارانہ طور پر اپنی گرفتاری دے دی تھی اور بعد میں پولیس نے ''غیرت کے معاملہ'' کا روایتی رنگ دے کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ نیز اسے ''آزاد'' کرانے میں بھی زمیندار حکم داد کا ہی ہاتھ تھا۔

موجا خان اس وقت ایک بڑی سی چارپائی پر بیٹھا بھنگ کے پیالے چڑھا رہا تھا۔ قادر بخش کو دیکھتے ہی وہ پہلے تو بری طرح چونک گیا مگر پھر فوراً چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ...... سائیں آؤ...... بھلی کار...... بھلی کار......'' کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا تو قادر بخش اس سے ہاتھ ملائے بغیر سرد لہجے میں بولا۔

''تو نے سرمد پر کارو کا جھوٹا الزام کیوں لگایا ہے؟''

قادر بخش کی بات سن کر موجا خان کے چہرے کے تاثرات ایک دم سپاٹ ہو گئے۔ وہ جواباً بولا۔ ''سائیں ...... یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس نے میری جوان بہن بھاگی کے ساتھ منہ کالا کیا۔''

''بکواس کرتے ہو تم۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس میں تمہارا کون سا ذاتی مقصد پوشیدہ ہے۔'' قادر بخش اس کی بات کاٹتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔ غصے سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ ایسے میں وہاں موجود ایک حواری نے ٹانگ اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے قادر بخش سے کہا۔ ''سائیں...... آپ کے لئے ہمارے دل میں احترام ہے...... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہمارے وڈے سائیں کے تھانگ پر آ کر اس طرح جھگڑا کرو۔''

قادر بخش نے ایک سنسناتی ہوئی نظر ڈالی اور غیظ آلود لہجے میں اسے گھور کر بولا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو...... یہ ساری کھچڑی تمہارے ''وڈے سائیں'' کی اوطاق میں ہی پکائی گئی ہے۔''

قادر بخش کے کرارے جواب نے اسے بھنا کر رکھ دیا مگر وہ جانتا تھا کہ قادر بخش زمیندار حکم داد کے داماد عاقل خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس لئے اس میں دوبارہ ''کچھ'' کہنے کی ہمت نہ ہوئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے موجا خان نے بھی اسے خفیف اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور پھر قادر بخش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

برماتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو سائیں......! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے......تمہیں اس میں دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں......''

''تو ٹھیک ہے پھر......مگر ایک بات تم کان کھول کر سن لو......موجا خان......''

قادر بخش بھی زناٹے دار لہجے میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تم اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔'' اس تنبیہہ کے بعد قادر بخش غصے سے اپنا پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلا گیا تو موجا خان کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

''لگتا ہے اب اس کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا۔'' موجا خان خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ اندرونی غیظ سے اس کا مکروہ چہرہ مزید مکروہ ہوگیا تھا۔



حاکم زادی اوّل درجے کی مکار عورت تھی۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہی تھی اور کامیاب تھی ...... اپنے شوہر سردار شیر دل خان کو اپنی بہو ہدایتاں کے خلاف بھڑکانے کے بعد اس نے اس کی پہلی بیوی دراں خاتون کو بھی نہیں بخشا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی دوسری بیوی حاکم زادی کی اس بات پر اپنے کان کھڑے کر لئے تھے کہ اس کی بہو ہدایتاں اپنی ہونے والی سوتن کو راستے سے ہٹانے کے لئے اس کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جب سادہ لوح دراں خاتون مکار حاکم زادی کی باتوں میں آ کر اپنے شوہر کے پاس رقم لینے آئی تو سردار بری طرح ٹھٹکا۔ اسے حیرت کے ساتھ غصہ بھی آنے لگا کہ ہدایتاں کے ساتھ اس کی بیوی بھی مل کر گل کھلا رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا، سردار نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور گرجدار آواز میں کہا۔

''تجھے بتانا ہوگا کہ یہ رقم تو کس مقصد کے لئے لینا چاہتی ہے۔ بول......''

بے چاری دراں خاتون خلاف توقع شوہر کو اتنی معمولی بات پر یک دم چراغ پا ہوتے دیکھ کر گھبرا گئی۔ پہلے کبھی تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے کچھ مانگا ہو اور سردار نے بلا چوں چرا اسے نہ دیا ہو......لیکن آج یہ اتنی معمولی رقم پر باز پرس کیسی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے مزاج سے واقف تھی۔ ایک بار اڑ جاتا تو پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

''سائیں......رب جانتا ہے...... یہ پیسے میں کسی غلط مقصد اور نا ہی اپنے لئے لینا چاہتی ہوں بلکہ...... بلکہ کسی کی مدد......'' بے چاری دراں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سردار خان اس کی بات کاٹ کر دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''کسی کی مدد کرنا چاہتی ہو...... یا قتل کرانا......؟'' سردار کے لہجے میں استہزاء عود کر آیا تھا۔

دراں خاتون ...... یہ سن کر شل سی ہوگئی۔ اس بے چاری کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ اسے شوہر کی نظروں سے گرانے کے لئے اس کی مکار سوتن حاکم زادی نے کیسی گھناؤنی چال چلی تھی۔ لہٰذا اس نے گڑبڑا کر یہ کتھا سنا دی کہ درحقیقت یہ رقم ان کی بہو ہدایتاں کو چاہئے تاکہ وہ بھائی کے بیمار بیٹے کے علاج و معالجے کے سلسلے میں مدد کر سکے۔ البتہ اس سادہ لوح نے اپنی سوتن سے وعدہ نبھاتے ہوئے اس کا درمیان میں نام نہیں لیا تھا۔ ہدایتاں کا نام لینے کی دیر تھی کہ سردار شیر دل کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے الٹے پیروں دراں خاتون کو واپس جانے کا کہتے ہوئے اسی وقت بہو کو بلانے کا حکم دیا۔ وہ بے چاری حکم کی بندی ویسے ہی الٹے پیروں بہو ہدایتاں کو بلانے چل دی۔



ادھر مکار حاکم زادی نے فی الفور ہدایتاں کے ہاتھ میں مزید ایک لاکھ کی رقم رکھ دی اور بولی۔ ''دیکھ ڑی نوں......! میں نے کسی نہ کسی طرح مزید ایک لاکھ روپوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ مگر لگتا ہے تیری ساس دراں خاتون کے کانوں میں یہ بھنک پڑ چکی ہے کہ تجھے رقم کی ضرورت ہے اور اس نے اس کا تذکرہ ......وڈے سائیں سے کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے تجھے وہ بلائے ...... پر تو صاف مکر جانا۔'' حاکم زادی نے ہدایتاں کو ایک نئی پٹی پڑھا دی اور اس کے کمرے سے چلی گئی۔



رقم ملتے ہی ہدایتاں نے کسی طرح اپنے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد کو بلایا اور پورے دو لاکھ کی رقم ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ...... انہیں فوراً اپنا ''کام'' نمٹانے کی تاکید کی۔

رقم ملتے ہی وہ دونوں بہن کے پاس ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرے۔ گھر پہنچ کر انہوں

نے ایک ایک لاکھ روپیہ آپس میں بانٹا۔ خوشی سے ان کی باچھیں پھیل گئی تھیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اپنی بہن کے معاملے میں سنجیدہ نہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ایک بار ان کا اعتبار بہن کے دل سے اٹھ گیا تو وہ پھر اس سے ساری زندگی کچھ نہیں بٹور سکتے تھے۔ دو لاکھ ایک بڑی رقم تھی۔ انہوں نے محض دس پندرہ ہزار اپنے ایک حواری موگو کو دیئے اور اسے ساتھ لے کر شہر آ گئے۔ مقصد موگو کو پازیب کی شناخت کرانا تھا۔ پھر وہ اسے آج ہی پازیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کی تاکید کر کے واپس اپنے گوٹھ آ گئے۔



معصوم بھاگی کے سانحے کے چند روز بعد ہی زمیندار حکم داد کے چند کارندے جیپ میں سوار ہو کر مٹھن کے گھر آئے اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ حکم داد...... کا بلاوا تھا اسی لئے مٹھن لیت و لعل کے بغیر ان کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر حکم داد کے حضور پہنچا۔ وہ اپنے اوطاق میں موجود تھا۔ موجا خان بھی ساتھ تھا۔ مٹھن کو دیکھتے ہی مکار اور بدطینت موجا خان نے اپنے چہرے پر اچانک غیظ وغضب کے آثار طاری کر لئے تھے۔

بے چارہ مٹھن تو اس واقعے کے بعد سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر دست بستہ کھڑا رہا۔ اس کے بشرے پر انتہا درجے کی شکستگی طاری تھی۔ بے چارے کے منہ سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔

زمیندار حکم داد نے ایک لمحے کو بڑی گہری اور برماتی ہوئی نظروں سے مٹھن کے یاسیت بھرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کھرکھراتے لہجے میں بولا۔ ''بابا...... دیکھ لیا تو نے ...... تیرے پٹ سرمد نے کیا گل کھلایا...... تو میرے ہیرے جیسے یار موجا خان کے کردار پر شک کرتا تھا نا...... اب بتا...... کون خراب تھا۔ موجا خان یا تیرا بیٹا؟''

زمیندار حکم داد کی بات سن کر مٹھن کے ہونٹوں پر ہلکا سا ارتعاش ابھرا۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا، وہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا اور شاید یہی حکم داد بھی چاہتا تھا لہٰذا اس غریب کو بولنے کا موقع دیئے بغیر دوبارہ بولا۔

''میں نے تو موجا خان کو صاف کہہ دیا ہے کہ اس کا وہ راجواڑیں فیصلہ کروائے...... مگر......''

''ہرگز نہیں...... سائیں وڈا......'' قریب بیٹھے خاموش موجا خان نے یک دم بھڑک دار لہجے میں کہا۔ ''میں لالچی نہیں ہوں...... میرے لئے عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ راجواڑیں فیصلے سے کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ مجھے کونجاں کا سنگ (رشتہ) اور روپیہ ملے گا نا...... لیکن مجھے نہیں چاہئے یہ سب، اس سے میری کھوئی ہوئی عزت تو واپس نہیں لوٹ آئے گی۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر میں نے اپنی سگی بہن کو بھی نہیں بخشا۔ اب سرمد کو قتل کر کے ہی مجھے چین نصیب ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جو محض ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ مٹھن پر نفسیاتی دباؤ ڈال رہا تھا...... جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کسی طرح سادہ لوح مٹھن ہاری کو دہشت زدہ کر کے اسے ''تاوان'' دینے پر مجبور کرے اور وہ کونجاں کا سنگ پلیٹ میں سجا کر اس کے آگے رکھ دے۔

راجواڑیں فیصلوں کی طوالت سے وہ خود بھی بچنا چاہ رہا تھا کیونکہ اسے یقین نہ تھا کہ آیا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا خلاف...... بہرطور...... اس کی یہ چال کامیاب رہی۔ جو گھاگ زمیندار حکم داد کی ہی سجھائی ہوئی تھی۔ مٹھن ہاری موجا خان کی بات پر ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑا کر بولا۔ ''نا سائیں...... تیکوں دھڑیں سائیں کا واسطہ...... میڈے پٹ سرمد کو ماپھ کر دے...... وہ میری لاٹھی ہے۔''

''اڑے بابا...... پھر تو ہی بتا...... کیا چاہتا ہے۔ اس کا راجواڑیں فیصلہ ہو یا ہم آپس میں ہی بیٹھ کر یہ سب طے کر لیں۔'' دفعتاً زمیندار حکم داد...... مغموم مٹھن ہاری کی طرف گھور کر بولا۔ ''پھر یہ بھی یاد رکھنا کہ...... ہوسکتا ہے راجواڑیں فیصلے میں نہ صرف تجھے...... اپڑیں دھی کونجاں کا سنگ (رشتہ) موجا خان کو دینا پڑ جائے...... بلکہ ہوسکتا ہے تجھے مال (ڈھور ڈنگر) پیسہ بھی دینا پڑے۔'' زمیندار حکم داد نے آخر میں ایک طرح دیتے ہوئے مٹھن سے کہا اور بے چارہ مٹھن تصویرِ غم بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس بے چارے کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ زمیندار کو کیا جواب دے۔ اسے کافی دیر خاموش کھڑے دیکھ کر زمیندار کڑک دار لہجے میں دوبارہ اس سے بولا۔

”اڑے بابا...... بول کچھ تو...... کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ کچھ بولنے سے ہی جان چھوٹے گی نا بابا......“

”بس...... سائیں پھر جیسے آپ کی مرضی...... میں گریب کیا کر سکتا ہوں۔“

سوگوار مٹھن کے کپکپاتے لبوں سے الفاظ پھسلے......مگر یہ کہتے ہوئے اس کے سینے میں درد کی ایک ٹیس سی ابھری اور بوڑھی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

اس کی بات سن کر زمیندار حکم داد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور موجا خان کا دل اندر سے جیسے بلیوں اچھلنے لگا مگر اس نے اپنی دبی دبی مسرت کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور ویسے ہی چہرے پر برہمی طاری رکھی۔ تب زمیندار حکم داد اپنے قریب بیٹھے موجا خان کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ہا بابا...... موجا خان......! کیا کہتا ہے اب تو...... بے چارہ مٹھن تو آپس میں ہی ”ٹپاہ“ (صلح صفائی) کرنے کو تیار ہے۔“ زمیندار نے محض دکھاوے کی خاطر موجا خان کو مخاطب کر کے اس کی وقعت بڑھانا چاہی تھی اور بدطینت موجا خان پہلے ہی یہ اشارہ بھانپ چکا تھا لہٰذا تھوڑے ہچر مچر کے بعد ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”بس سائیں وڈا......! اس کے پٹ سرمد نے جرم ہی ایسا ناقابل معافی کیا ہے کہ دل کرتا ہے، جب تک اس کے خون سے اپنی کلہاڑی نہ رنگ لوں چین سے نہ بیٹھوں...... پر یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے اس گریب پوڑے (بوڑھے) پر ترس آتا ہے۔ اگر راجواڑیں فیصلہ ہو جاتا ہے تو اس کے سارے خاندان کو جرگے میں ذلیل و خوار کرتا...... پر سائیں وڈا...... آپ کی بات بھی تو ٹالنے کی جرأت نہیں کر سکتا...... میں...... اگر یہ...... مٹھن ہاری...... ادھر ہی معاملے کو نمٹا دیتا ہے تو مجھے منظور ہے۔“

اتنا کہہ کر موجا خان جھوٹ موٹ اپنا منہ بسور کر چپ ہو رہا۔ جیسے اس نے کوئی کڑوی گولی نگلی ہو۔ بے چارہ مٹھن فوراً آگے بڑھ کر موجا خان کے پیروں پر گر گیا اور روتے ہوئے بولا۔

”وڈی مہربانی موجا سائیں...... مجھ گریب کو تم نے رحم کی نظر سے دیکھا...... بس تو میڈے پٹ سرمد کا سر بخش دے۔ میں تیکوں اس کا سر دھان اپڑیں دھی کونجاں کا رشتہ دے کر ادا کر دیتا ہوں۔“

”ہالا...... بابا...... ہالا...... بات طے ہوگئی۔ اب تو جا......کل ہم خود تیرے گھر

آئیں گے۔“

زمیندار حکم داد نے قدرے اونچی آواز سے مٹھن ہاری کو مخاطب کر کے کہا اور بے چارہ مٹھن ......اپنی بوڑھی آنکھوں میں اپنی بے کسی کے باقی ماندہ آنسو لئے لوٹ گیا۔

اس کے اوطاق سے باہر جاتے ہی زمیندار حکم داد اور موجا خان نے مکارانہ مسکراہٹ سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی ہتھیلی پر ہاتھ مارتے ہوئے شیطانی قہقہہ لگایا۔

”اڑے واہ سائیں وڈا......! کیا دماغ پایا ہے آپ نے بھی...... ایسی ترکیب لڑائی کہ سرمد بھی راستے سے ہٹ گیا اور راجواڑیں کے لمبے چوڑے کھڑاک سے بھی بچ گئے اور کونجاں جیسی حور پری بھی خود بخود پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آ گری۔“ موجا خان وحشت انگیز قہقہے کے اختتام میں زمیندار سے بولا اور زمیندار حکم داد معنی خیز انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے اثباتی جنبش دینے لگا...... لیکن پھر اگلے ہی لمحے......موجا خان کے مسرت بھرے چہرے پر یک دم کرختگی عود کر آئی اور وہ اسی لہجے میں دانت پیس کر بولا۔ ”پر سائیں وڈا...... ایک ٹیڑھ اور پیدا ہوگئی ہے۔“

”کیسی ٹیڑھ......!“ زمیندار قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سائیں...... وہ ہے ناں قادر بخش آپ کے داماد کا چھوٹا بھائی اور سردار شیر دل خان کا پٹ...... وہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا۔ کونجاں کے سلسلے میں مجھے دھمکیاں دے کر گیا ہے۔“

پھر موجا خان نے اسے اپنی اور قادر بخش کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ یہ سن کر زمیندار حکم داد نے پرتشویش انداز میں ذرا دیر کو خاموشی اختیار کی۔ پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔

”اس سے بھی نمٹ لیں گے۔ میرا خیال ہے...... اس کی شکایت خود ہمیں سردار کے پاس جا کر ہی کرنی پڑے گی۔“

”یہ ٹھیک رہے گا سائیں وڈا......“ موجا خان نے تائیدی انداز میں اپنا سر

ہلاتے ہوئے کہا۔



پازیب نے اپنی بہن گھنگھرو کی یہ بات گرہ سے باندھ لی تھی کہ وہ عاقل خان کو پڑھائی مکمل کرنے کا بہانہ بنا کر ٹالتی رہے گی۔ اس حد تک وہ کتنا کامیاب ہوئی تھی اس کا سردست وہ اندازہ نہ کرسکی تھی تاہم ایک بات ہنوز اسے بے چین کئے دے رہی تھی کہ آخر کب تک وہ عاقل خان کو اس طرح ٹالتی رہے گی۔ درحقیقت اس کے دل کے کسی نہاں خانے میں یہ خدشہ بھی پل رہا تھا کہ کیا اس طرح عاقل خان اس سے بددل نہیں ہو جائے گا۔ تب پازیب کے اندر...... جیسے کسی نے پکارا۔ ''پازیب......! محبت خودغرض ہوتی ہے۔ پوچھ ذرا خود سے...... کیا تو...... عاقل خان سے محبت نہیں کرتی؟ تو پھر یہ تاویلیں کیوں؟ اس طرح تو تم خود اندر سے گھائل ہو کر رہ جاؤ گی۔ سوچ لو...... اچھی طرح سے...... اور اپنے دماغ سے نہیں بلکہ دل سے بار بار پوچھو۔ اگر...... اگر عاقل تم سے دور ہو گیا تو...... کیا تم اس کے بغیر زندہ رہ سکو گی؟''

''نہیں...... ہرگز نہیں......'' غیر ارادی طور پر پازیب کے منہ سے یہ لفظ ایک قدرے ہسٹریائی انداز میں بلند ہوا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ اس وقت کمرے میں اس کی روم میٹ موجود نہ تھی...... ورنہ...... وہ پازیب کو یوں ایک دم چلاتے دیکھ کر اس کی دماغی حالت پر شبہ کرتی۔

وال کلاک میں اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ پازیب...... اپنے ہاسٹل کے کمرے میں تنہا تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ جب وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی تو ذرا دیر بعد خود ہی اپنی اس کیفیت پر گڑبڑا بھی گئی کہ اس کا آج پڑھنے کا بھی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی دونوں روم میٹ سہیلیاں کچھ روز کے لئے اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ ان میں ایک کا گھر کراچی میں اور دوسری کا نواب شاہ میں تھا۔ لہٰذا پازیب نے آج رات یہی سوچا تھا کہ وہ بجائے لائبریری جا کر اسٹڈی کرنے کے کمرے میں ہی پڑھے گی لیکن پھر جلد ہی عاقل خان کا خیال اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا۔ درحقیقت پازیب کو عاقل اس وجہ سے بھی پسند تھا کہ اس نے اس کے ''ماضی'' یا خاندانی بیک گراؤنڈ سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا اور نہ

ہی پازیب نے خود اپنا ماضی چھپایا تھا۔

بہرطور...... پازیب نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ اس بات کا اسے اکثر بڑی شدت سے قلق ہوا کرتا تھا کہ آخر یہ کب تک اس طرح ہاسٹل کی زندگی گزارتی رہے گی۔ کیا اسے کبھی بھی کسی شریف گھرانے کی عزت دار چاردیواری نصیب نہیں ہوگی۔

اسے اب ہاسٹل کے ایک ہی طرح کے سوگوار کمروں سے بیزاری بلکہ کافی حد تک نفرت ہو چلی تھی۔ اس وقت بھی اس کا دل اتنا گھبرایا کہ وہ آدھی رات کے وقت اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

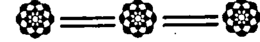
ویک اینڈ تھا...... کافی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ ہاسٹل میں کم ہی لڑکیاں تھیں جن کے گھر دور دراز علاقوں یا گوٹھوں میں تھے۔ وہ پانچ چھ ماہ بعد ہی جایا کرتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا...... جب ہاسٹل میں بالکل تنہا ہو جاتی تو وہ اپنی ایک قریبی سہیلی ثمرینہ کے ہاں حیدرآباد چلی جایا کرتی تھی یا کبھی اس کی بہن گھنگھرو اسے رات کے اندھیرے میں بڑی رازداری کے ساتھ شہر میں ایک چھوٹے سے مگر فرنشڈ فلیٹ میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتی تھی۔ بہرطور پازیب سنسان راہداری میں کھڑی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں مچھروں کے جھرمٹ محوِ گردش تھے...... اندر کہیں کمروں سے بولنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

پازیب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی باہر لان میں آ گئی۔ چہار سو رات کا سناٹا طاری تھا۔ کینٹین بھی بند ہو چکی تھی۔ اتفاق ہی تھا کہ لان میں بھی کوئی موجود نہ تھا۔ پازیب عالم اداسی میں چلتی ہوئی سیمنٹ کی ایک بینچ پر کھوئی کھوئی اور سوگوار سے انداز میں بیٹھ گئی۔

اس کے عقب میں ہاسٹل کی تین منزلہ عمارت تھی۔ بالائی منزلوں کی راہداریاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں جبکہ گراؤنڈ فلور پر کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی فضا میں پھولوں اور بیل بوٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ باہر کی کھلی اور سبک خرام تازہ ہوا نے پازیب کے ژولیدہ ذہن پر اچھا اثر ڈالا تھا مگر وہ اس بات سے یکسر بےخبر تھی کہ ایک پراسرار سایہ جانے کس طرح ہاسٹل کی عقبی دیوار پھلانگ کر ہاتھ میں بڑا سا خنجر

دبائے چہرے پر ڈھاٹہ باندھے...... گھنے پودوں کی آڑ لئے آہستہ آہستہ......اس کے عقب سے قریب آ رہا تھا۔

یہ موگو تھا...... جسے سائیں رکھیو اور مولا داد نے پازیب کو قتل کرنے کا کام سونپا تھا۔ موگو موت کا ہرکارہ بنا پازیب کے عین سر پر پہنچ چکا تھا۔ اب اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ پازیب اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی بے خبر بیٹھی تھی۔



اسی لمحے پازیب کی نظر نیچے گھاس پر ابھرنے والے سائے پر پڑی اور وہ بری طرح چونک کر پیچھے کی جانب مڑی۔ اس اثناء میں موگو کا خنجر والا ہاتھ نیچے آیا لیکن پازیب ایک باحوصلہ اور بیدار مغز لڑکی تھی، غیر ارادی طور پر اس کے بچاؤ میں اٹھتے ہوئے دائیں ہاتھ کی کلائی سے حملہ آور موگو کا خنجر والا ہاتھ ٹکرایا تو پازیب حلق کے بل زور سے چیخنے لگی۔

موگو اگرچہ ایک دبلا پتلا شخص تھا مگر بہر حال مرد تھا اور پازیب ایک صنف نازک تھی مگر پھر بھی اس نے موگو کے اپنے چہرے کی طرف بڑھتے ہوئے خنجر والے ہاتھ کو روکے رکھا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ہوسٹل کی لابی میں دوڑتے قدموں اور شور کی آواز ابھری۔ موگو کی کوشش یہی تھی کہ کسی کے آنے سے پہلے اپنا کام مکمل کر کے فرار ہو جائے مگر اس اثناء میں لان میں چوکیدار خان بابا ڈنڈا گھماتا ہوا وہاں آن پہنچا اور اس ڈنڈے کو لہرا کر موگو کے سر پر دے مارا۔

موگو کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گھاس پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک زقند بھر کر گیٹ کی طرف دوڑا۔ چوکیدار جو ہاسٹل میں ''خان بابا'' کے نام سے مشہور تھا، اس کے پیچھے بھاگا۔

اس دوران کچھ لڑکیاں دوڑتی ہوئیں پازیب کو سنبھالنے کے لئے پہنچیں۔ پازیب پر بری طرح دہشت سوار تھی۔

''پازیب! تم ٹھیک تو ہوناں......کیا ہوا؟'' وہ سب قریب پہنچ کر چیخیں'

''اسے اندر لے چلو، فوراً......'' ان میں سے ایک نے خوف سے نڈھال ہوتی پازیب کو دیکھ کر کہا اور پھر وہ سب اسے سہارا دے کر اندر ہوسٹل کے ایک کمرے میں لے آئیں۔ اس اچانک دہشت ناک واقع نے پازیب پر غشی طاری کر دی تھی۔ ایک

لڑکی نے گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے اور پھر پازیب کو ذرا ہوش میں آتے ہی گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد چوکیدار خان بابا بھی ہانپتا ہوا وہاں آن پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ وہ نامعلوم حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔



''بھٹائی ہاؤس'' میں اس وقت بھونچال آیا ہوا تھا۔ افراد خانہ سمیت حویلی میں کام کرنے والے نوکر چاکر بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سردار شیر دل خان غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور ایک بڑے سے ہال کمرے میں اس نے باقاعدہ چوپال سی ڈال دی تھی۔ اس کی بیوی دراں خاتون اور بہو ہدایتاں کمرے کے وسط میں کھڑی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ وہاں سردار شیر دل خان کی دوسری بیوی حاکم زادی اور اس کے دونوں بچے منصب خان اور بیٹی سورٹھ بھی موجود تھی۔ سورٹھ آج کل یونیورسٹی سے گھر آئی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ہی دراں خاتون کا چھوٹا بیٹا قادر بخش اور بیٹی رانی بھی موجود تھی اور اپنی ماں دراں خاتون کی حالت دیکھ کر بری طرح پریشان ہو رہے تھے۔ مگر انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ مکار حاکم زادی اپنے شوہر کے قریب کھڑی آنکھوں میں مگرمچھ کے آنسو لئے دہائیاں دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے سردار شیر دل خان سے التجا کر رہی تھی۔ ''بس...... بس...... سائیں! اللہ کے واسطے خود کو سنبھالو...... ان...... دونوں کو معاف کر دو۔''

''تو چپ رہ ڑی۔ مجھے آج ذرا ان دونوں سے نمٹ لینے دے۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی اتنی بڑی سازش کرنے کی؟ ان دونوں نے ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔'' جواباً سردار غیظ آلود لہجے میں دراں خاتون اور ہدایتاں کو زہرخند نظروں سے گھور کر بولا اور مکار حاکم زادی اپنے سینے پر دوہتڑ مار کر خود کلامی کے انداز میں فریاد کرنے لگی۔

''سائیں گھوڑا...... اس حویلی کو کس راکاس (شیطان) کی نظر لگ گئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نڈھال ہو کر مسہری پر گر گئی تو منصب خان اور اس کی بیٹی سورٹھ۔ ''امڑ جی جی۔'' کہتے ہوئے ماں کو سنبھالنے کے لئے لپکے۔

ادھر سردار شیر دل خان غصے سے پھنکتے ہوئے مجرموں کی طرح سر جھکائے لرزیدہ براندام کھڑی دراں خاتون اور ہدایتاں سے دھاڑ کر بولا۔ ''تم دونوں کو جرأت کیسے ہوئی، ایک بے گناہ لڑکی کو قتل کروانے کی جس نے تمہارا کچھ بگاڑا ہی نہ تھا۔ مجھ سے تو بات کی ہوتی۔ میں خود عاقل خان سے بات کرتا۔''

ان دونوں کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ سب سے زیادہ حالت دراں خاتون کی خراب تھی۔ وہ بے چاری سرے سے ہی بے قصور تھی جبکہ اس کے ساتھ کھڑی اس کی بہو ہدایتاں کی حیثیت واقعی ایک مجرم کی سی تھی۔ تاہم پھر بھی دراں خاتون نے اپنی ہمت جمع کر کے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ ''بس...... بس...... سائیں! رب سائیں جانتا ہے مم...... میں بالکل بے قصور ہوں...... مم...... مجھ کو کچھ بھی پتہ نہیں کہ......''

''جھوٹ بولتی ہے تو۔'' سردار شیر دل خان اپنی بیوی کی بات کاٹ کر زور سے گرجا۔ ''کم از کم...... دراں......! تو نے ہی میری عزت کا کچھ خیال کیا ہوتا...... تو کیا چاہتی تھی؟ یہاں پولیس آئے...... اور...... اور وسند خان کا خاندان پولیس کچہریاں بھگتے۔ لعنت ہے تجھ پر۔''

بے چاری دراں خاتون باعث ندامت زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ تب سردار ہدایتاں سے قہرناک لہرے میں بولا۔ ''بتا ڑی...... تمہارے ساتھ اور کون لوگ سازش میں شامل ہیں؟ بول۔'' سردار کی بات سن کر مکار حاکم زادی کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ یہ سوچ کر کہ کہیں اس کا نام بیچ میں نہ آ جائے فوراً حالت غشی کو بھول کر دراں اور ہدایتاں کی طرف بڑھی اور انہیں ٹہوکا دیتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں ان سے سرگوشی میں بولی۔ ''بحث کا کوئی فائدہ نہیں...... فوراً...... سردار سائیں کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لو۔''

ہدایتاں تو تیار تھی مگر دراں خاتون جو واقعی بے قصور تھی، اس کا دل ایسا کرنے کو نہیں مان رہا تھا کیونکہ سردار کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کا مطلب تھا کہ وہ بھی اس جرم میں شریک تھی۔ اس طرح نہ صرف وہ ہمیشہ کے لئے اپنے شوہر کی نظروں سے گر جاتی بلکہ...... اسے اپنے بڑے بیٹے عاقل خان اور دوسرے دونوں چھوٹے بچوں قادر بخش اور رانی کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑتا۔ اس بے چاری کا ایسے

نازک حالات سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا جس نے اس کے دل و دماغ تک کو ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ بالآخر اپنی مکار سوتن حاکم زادی کے چلتر میں آ گئی۔ پھر سب سے پہلے ہدایتاں اور پھر بعد میں دراں خاتون نے فوراً آگے بڑھ کر سردار شیر دل خان کے قدم پکڑ لئے اور دونوں ہی گڑگڑا کر معافی کی درخواست کرنے لگیں اور ندامت کی وجہ سے بے چاری دراں خاتون کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے مگر سردار مجسم پتھر بنا کھڑا رہا۔

قادر بخش اور رانی نے اپنی ماں دراں خاتون کو شوہر کے پاؤں پر گرتے دیکھا تو ان کے دل کٹ سے گئے۔

آخر قادر بخش سے نہ رہا گیا۔ اس کی تیز نگاہوں اور ذہن رسا نے بھانپ لیا تھا کہ اس کی ماں دراں خاتون بے قصور تھی نیز یہ کہ یہ ساری کھچڑی کسی اور کی پکائی ہوئی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا وہ فوراً جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باپ سے بولا۔

''بابا سائیں......! آپ کو میری ماں کی بات ضرور سننی چاہئے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔''

بیٹے کی بات سن کر سردار شیر دل خان نے ایک لحہ خشونت آمیز نظروں سے اسے گھورا پھر اپنی دونوں مٹھیاں اور دانت پیس کر بولا۔ ''تیری ماں......اگر بے قصور ہوتی تو مجرموں کی طرح میرے پیروں پر سر نہیں رگڑتی۔''

قادر بخش کو باپ کا لہجہ خائف کرنے لگا۔ تاہم خاموش وہ بھی نہ رہ سکا تھا۔ بولا۔ ''بابا سائیں......! میری ماں ...... ایک سیدھی سادی اور شوہر پرست خاتون ہے۔ دوسرے کا جرم بھی اپنے گلے ڈال کر آپ کے قدموں میں جھکی ہے۔ یہ تو اس کی اعلیٰ ظرفی اور صابر ہونے کی اعلیٰ مثال ہے۔ آپ کے پیروں پر گرنے کا مقصد ماں کا مجرم ہونا نہیں بلکہ آپ کے غصے کو ٹھنڈا کرنا ہے۔''

''قادر بخش......! ماٹھ (چپ) کر تو۔ آ پڑیں بابا سائیں کے سامنے اس طرح بات کرتے ہیں۔'' دراں خاتون نے باپ بیٹے کو آمنے سامنے دیکھ کر یک دم شوہر کے قدموں سے اٹھتے ہوئے بیٹے کو سرزنش کی۔

''تو ہٹ جا پرے ...... دراں......! اس کو اپنی بات کرنے دے۔'' سردار

گرجدار لہجے میں اپنی بیوی سے بولا اور پھر بیٹے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بابا...... بتا...... تجھے کیسے پتہ یہ بے قصور ہے۔ تیری ماں ہے اس لئے؟'' سردار کے لہجے میں طنز کی چبھن تھی جسے قادر بخش محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

اس دوران ہدایتاں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مکار حاکم زادی کچھ پریشان سی ایک طرف کو کھڑی تھی۔ اپنے سوتیلے بیٹے قادر بخش کی مداخلت بے جا نے اسے ذرا متوحش سا کر دیا تھا اور اس کے دل کا چور اندر سے بری طرح ڈرا ہوا تھا۔

قادر بخش کے لہجے اور انداز و اطوار سے ذرا بھی کسی قسم کی سرکشی یا بدتمیزی ہویدا نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کے بالمقابل محو گفتگو ضرور تھا لیکن اپنی نظریں اس نے جھکا رکھی تھیں۔ تاہم باپ کی طنز کے زہر میں ڈوبی ہوئی بات کا جواب دینا ضروری تھا لہٰذا وہ پھر آہستگی مگر اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔

''بابا سائیں......! اگر یہ میری ماں ہے تو آپ بھی تو میرے بابا ہیں۔ ماں اگر قصوروار ہے تو اس کی باز پرس آپ کا حق ہے مگر بابا سائیں آپ اماں جانی کو کم از کم اپنی صفائی کا کچھ موقع تو دیں ناں۔'' قادر بخش کے لہجے میں اب دبے دبے احتجاج کی بجائے ایک التماس عود کر آئی تھی۔

بیٹے کی بات پر ایسا ہوا کہ پہلی مرتبہ سردار شیر دال خان کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب غصے کی سرخی کی بجائے متردد پرچھائیں دیکھ کر چنڈال صفت حاکم زادی یک دم گڑبڑا سی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر دراں یا ہدایتاں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ملا تو خود اس کے لئے یہ بات مصیبت کا باعث بن سکتی تھی لہٰذا وہ فوراً قادر بخش سے مخاطب ہو کر اپنے لہجے میں دنیا جہان کی ممتا کا پیار بکھیرتے ہوئے بولی۔

''اڑے پٹ......! بات کو بڑھانے کا کیا فائدہ۔ بلاوجہ یہ بات باہر نکلے گی۔ ہم سب کی ہی اس میں بدنامی ہے۔ ان دونوں نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے بس بات ختم۔'' اس نے اپنی بات پوری کی تو قادر بخش کو اب شک ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہو گیا تھا کہ ہو نا ہو، اس سازش میں اس کی سوتیلی ماں کا پورا پورا ہاتھ ہے بلکہ کوئی بعید نہیں کہ اصل مجرم ہی یہ ہو۔ قادر بخش اپنی نظریں سوتیلی ماں کے چہرے پر مرکوز کرتے

ہوئے قدرے استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''آمڑ جیجل ......! جتنا آپ کو حویلی کی عزت کا خیال ہے اتنا ہی مجھے بھی ہے مگر کیا آپ نہیں چاہتیں کہ اصل مجرم بے نقاب ہو جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس سازش کے پیچھے جو کوئی بھی ہے اسے منظرِ عام پر لانا ضروری ہے ورنہ وہ دوبارہ اور بار بار ایسی نیچ حرکات کرتے ہوئے خاندان کی عزت کو داؤ پر لگاتا رہے گا۔''

قادر بخش کی بات سن کر حاکم زادی سناٹے میں آ گئی۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ ماں کی خفت دیکھ کر اس کا لاڈلا تندخو بیٹا منصب خان جو پہلے ہی قادر بخش سے جلتا تھا، یک دم اس سے بولا۔

''قادر بخش! یہ بڑوں کا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرو۔''

قادر بخش اپنے سوتیلے چھوٹے بھائی کی طرف گھوما۔ پھر اس سے پہلے کہ دونوں میں تُو تڑاق ہوتی، سردار شیر دل خان گرجدار آواز میں منصب خان کو ٹوکتے ہوئے بولا۔

''منصب! تم خاموش کھڑے رہو۔'' اتنا کہہ کر وہ دراں خاتون سے گھمبیر لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''ہاں کہو تم ......کیا کہنا چاہتی ہو؟''

اگرچہ سادہ لوح دراں خاتون معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی لیکن اپنے بیٹے قادر بخش کی کوشش کو ضائع بھی نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا بولی۔

''مجھ سے حاکم زادی نے کہا تھا کہ نوں (بہو) ہدایتاں کو اپنے بھائی کے بیٹے کے علاج کے لئے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے جسے آپ سے مانگتے ہوئے ہدایتاں کو شرم آ رہی تھی، اس لئے میں نے وہ رقم ہدایتاں کو دینے کے لئے آپ سے مانگی تھی۔''

''حاکم زادی!'' دفعتاً سردار نے گرجدار لہجے میں اپنی دوسری بیوی حاکم زادی سے پوچھا۔ ''کیا یہ بات درست ہے؟'' شوہر کی بات سن کر حاکم زادی کی ٹانگیں کانپنے لگیں، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا اور اس کے لبوں سے بات نہیں نکل پا رہی تھی۔

''میں تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں حاکم زادی!'' سردار شیر دل خان نے دوبارہ

درشت لہجے میں اسے پکارا تو حاکم زادی کے ہونٹ کانپے اور بمشکل اس کے منہ سے لرزیدہ الفاظ برآمد ہوئے۔

''مجھے بھی ہدایتاں نے ہی کہا تھا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔''

ہدایتاں نے یہ سنا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تاہم پھر بھی اس کے محتاط ذہن نے مزید پریشان یا ہراساں ہونے کی بجائے اسے جھوٹی ہٹ پر قائم رہنے کا اشارہ دیا کہ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹی رہے لہٰذا بولی۔ ''س ...... سائیں ...... ی ...... یہ بات درست تھی کہ وہ رقم مجھے اپنے بھائی کو دینی تھی۔''

''تاکہ اس بے گناہ لڑکی کو کسی کرائے کے قاتل سے مروایا جا سکے۔ کیوں یہی بات تھی ناں؟'' سردار اپنی بہو کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں بولا تو ہدایتاں سر تا پا لرز کر رہ گئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ سردار کو اصل حقیقت کا علم ہو چکا ہے اور ظاہر ہے، اس کا علم اس کی سوتیلی ساس حاکم زادی کو بھی تھا یقیناً یہ بات اس نے ہی سردار کو بتائی ہو گی۔ لہٰذا اس نے بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے فوراً سوچا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گی تو اس کی پکڑ ہو گی اور یوں حاکم زادی صاف بچ نکلے گی۔ لہٰذا اس نے سردار کو صاف بتا دیا کہ یہ ترغیب درحقیقت حاکم زادی کی ہی تھی۔

سردار شیر دل خان جب اصل حقیقت سے آگاہ ہوا تو وہ ایک بار پھر غصے کی شدت سے کانپنے لگا۔ قادر بخش کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی سادہ لوح ماں کا بڑی کامیابی کے ساتھ دفاع کیا تھا۔ ادھر حاکم زادی نے ہدایتاں کو اپنے خلاف یہ کہتے سنا تو یک دم چلا کر بولی۔ ''یہ جھوٹ بولتی ہے سائیں ...... حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری سازش ہدایتاں اور اس کے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد کی ہے اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی۔'' اس سے پہلے کہ ہدایتاں بھی اپنی ساس کے خلاف تندخوئی پر اترتی سردار شیر دل خان غضبناک لہجے میں دھاڑ کر بولا۔

''دفع ہو جاؤ تم لوگ۔ تمہارا بعد میں فیصلہ کروں گا۔ پہلے میں ذرا شہر سے عاقل خان کو بلوا لوں۔''

پھر باری باری سب کمرے سے کھسکنے لگے البتہ سردار نے اپنی پہلی بیوی دراں خاتون اور قادر بخش کو وہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا۔



سب لوگ جا چکے تھے، صرف سردار شیر دل خان اور اس کی بیوی دراں خاتون کے علاوہ قادر بخش وہاں رہ گئے۔ کمرے میں چند ثانیے گہرا سکوت طاری رہا۔ سردار ایک بوجھل سی ہنکاری بھرتے ہوئے مسہری پر جا بیٹھا اور خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''میں حاکم زادی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا مگر سب سے زیادہ دکھ مجھے آپڑیں نوں (بہو) پر ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو دونوں ماں بیٹوں نے دیکھا کہ سردار کے چہرے کے تیور پھر بدلنے لگے تھے۔ وہ بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ قادر بخش سے بولا۔

''پٹ...... ! تو ایسا کر...... آپڑیں وڈے بھراں (بھائی) کو شہر پیغام بھیج کر بلا لے۔ اس کے بعد ذرا حکم داد کے پاس کسی چاکر کو بھیج کر اسے ادھر پہنچنے کا بندوبست کرو۔''

اتنا کہہ کر وہ رکا تو دراں پیشان سی ہوگئی۔ قادر بخش کی بھی یہی حالت تھی۔ انہیں شاید اس تلخ حقیقت کا اندازہ تھا کہ حکم داد کی طلبی خاندان میں جھگڑے کی ابتدا کا باعث بن سکتی تھی اور نتیجتاً عاقل خان کے گھر اور بیوی بچوں پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا۔

قادر بخش نے اپنی ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور تب دراں خاتون نے ہمت کر کے پہلے بیٹے قادر بخش کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے شوہر کی مسہری کے قریب آ کر ذرا فاصلے پر آہستگی سے بیٹھ گئی۔ قادر بخش جا چکا تھا۔ سردار کے بشرے پر خاموشی طاری تھی۔ تاہم اس کی پریشان نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ دراں آہستگی کے ساتھ شوہر کو مخاطب کر کے بڑے رسان سے بولی۔

''بس...... سائیں! مجھ باندی کو بھی اپنی گرتی (پریشانی) میں شریک سمجھیں لیکن میرا خیال ہے اس مسئلے کو جلدبازی یا غصے میں حل کرنے کی کوشش کہیں خود ہمارے لئے نقصان کا باعث نہ بنے۔''

''کیسا نقصان؟ آپڑیں نوں ہدایتاں اور میری چھوٹی بیوی حاکم زادی نے جو کچھ کیا ہے، بھلا اس سے بڑھ کر کیا نقصان ہوسکتا ہے؟ عاقل کی ماں!'' سردار نے ہنوز غیر مرئی نقطہ پر اپنی نظریں مرکوز رکھے ژولیدگی سے کہا تو دراں بولی۔

''مجھ باندی میں آپ سے زیادہ عقل نہیں مگر آپ چونکہ پریشان ہیں اس لئے

ہوسکتا ہے کہ کہیں جوش میں کیا گیا کوئی فیصلہ ہمارے لئے مزید نقصان کا باعث بن جائے۔'' دراں کے متحمل لب و لہجے نے بالآخر سردار کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کیا اور وہ اپنی بیوی کی طرف گردن موڑ کر بولا۔ ''کہنا کیا چاہتی ہو عاقل کی ماں!''

دراں کو جیسے ہی اپنے شوہر کے لہجے میں مشورہ طلبی کا اندازہ ہوا تو وہ ذرا کھنکار کر بولنا شروع ہوئی۔

''سائیں! گند میں لٹھ گھمانے سے بدبو ہی پھیلے گی۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ بات ادھر ہی ختم کر دی جائے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جن لوگوں نے یہ سازش کھیلی تھی، انہیں فراموش کر دیا جائے۔ نہیں...... بلکہ ان پر اب اور آئندہ بھی کڑی نظر رکھی جائے تاکہ دوبارہ وہ ایسی جرأت نہ کر سکیں۔''

دراں اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو سردار نے گھمبیر مگر سوچتے لہجے میں بیوی سے پوچھا۔ ''اور...... ہدایتاں کے دونوں بھائیوں کا کیا کیا جائے۔ کیا انہیں بھی؟'' سردار شیر دل خان نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور مستفسرانہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں سائیں! ان دونوں کو بھی بلا کر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ان کا علاج یہی ہے کہ ان پر کڑی نظر رکھی جائے اور انہیں سزا دینے کی بجائے مجرموں کی طرح شرمسار ہی رہنے دیا جائے ورنہ یہ لوگ اکڑیں گے اور اس طرح خاندان کی عزت و وقار کو دھچکا پہنچے گا۔'' دراں خاتون نے کہا اور پھر آخر میں مزید بولی۔ ''ہاں...... سائیں! یہ ضرور ہونا چاہئے کہ آپڑیں پٹ عاقل خان کو چند روز کے لئے شہر سے حویلی بلا لیا جائے اور اسے ساری باتیں سمجھا کر اپنی بیوی اور دونوں سالوں پر نگرانی یا تھوڑی بہت پابندی لگوا دی جائے...... بس۔''

سردار چند ثانیے اپنی آنکھیں سکیڑے پر سوچ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر کار اس کے تنے ہوئے اعصاب اور بگڑے ہوئے تیوروں کی گرمی بتدریج معمول پہ آتی چلی گئی اور پھر وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر اپنے سر کو ثباتی جنبش دینے لگا۔



ڈور چنوں کے کھیتوں سے پرے مغربی افق پر شام کے سناٹے اترے ہوئے تھے۔ اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے تھکے ماندے پرندوں کی منظم قطاریں بوجھل انداز میں محو پرواز تھیں۔ کھیتوں کھلیانوں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے اور پگڈنڈی نما کچے راستوں پر ملگجی سی دھول اڑ رہی تھی۔ ہر کوئی رات بھر کھیتوں میں جفاکشی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہا تھا۔ دھول اڑاتے راستوں میں مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تھکے تھکے اور سوگوار سے انداز میں ''آں...... ں...... بیں...... بیں'' کرتے یکساں رفتار سے چلے جا رہے تھے۔

کہیں دور سے آٹے کی چکی کی مخصوص پک...... پک...... پک کی آواز نغمگی سی بکھیر رہی تھی۔ ایک جانب نہنگ کے درختوں کے سامنے پھیلے ہوئے ''لوسن'' (جانوروں کا چارا) کے کھیتوں میں کونجاں اور اس کی بوڑھی ماں دن بھر لوسن کی کٹائی کرنے کے بعد ان کی بڑی بڑی گٹھیاں بنا کر بیل گاڑی پر لاد رہی تھیں۔ جب ساری گٹھیاں لد چکیں تو اس کی ماں بیلوں کی رسی تھام کر آگے آگے چلنے لگی اور کونجاں عقب میں۔ یہ ایک لمبی اور پتلی سی پگڈنڈی تھی۔ اب نہ کونجاں اپنی ماں کو دیکھ پا رہی تھی اور نا ہی اس کی ماں۔ تب دفعتاً ہی ایک درخت کی آڑ سے قادر بخش نکل کر کونجاں کے ساتھ ہولیا۔ کونجاں اسے دیکھ کر ذرا گھبرائی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر گہرے دکھ کی پرچھائیاں نمودار ہو گئیں۔

''کونجاں......! تو ٹھیک تو ہے ناں؟'' قادر بخش نے کونجاں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا تو کونجاں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''قادر بخش! حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس بدذات موجا خان نے زمیندار حکم داد کے ذریعے میرے پیو (باپ) پر دباؤ ڈال کر اسے میرا سنگ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔'' کونجاں کی بات سن کر قادر بخش سن ہو کر رہ گیا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے الفاظ پھسلے۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہے کونجاں؟ کیا واقعی تیرا پیو (باپ) اس کمینے موجا خان کو تیرا سنگ دینے پر راضی ہو گیا؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی عود کر آئی تھی۔ اس بار جب کونجاں بولی تو اس کے لہجے میں گہرا دکھ اور مایوسی تھی۔ اس کی

آنکھیں بھی نمناک ہو چکی تھیں۔ ''قادر بخش! تمہیں اب مجھے بھولنا ہوگا کیونکہ میرا پیو دادا سرمد کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ وہ...... وہ بے چارہ بیمار بھی ہو گیا ہے۔ مجھے اب اپنے بھائی پر قربان ہونا ہی پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں انتہا درجے کی مایوسی تھی۔

پھر اچانک ایک موڑ کے بعد کھلا میدان آ گیا اور سامنے کچے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں بھی نظر آنے لگیں۔ قادر بخش کا اب زیادہ دیر کونجاں کے ہمراہ چلنا مناسب نہ تھا اس لئے کونجاں کو حوصلہ دے کر اپنا راستہ بدل گیا۔

قادر بخش کونجاں سے جدا ہو کر واپس اسی پگڈنڈی پر ہولیا۔ ذرا دور ہی نہنگ کے درختوں کے سائے تلے اس کی جیپ کھڑی تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا مگر جیپ اس نے اسٹارٹ نہیں کی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی کہنیاں ٹکائے، اس پر جھک سا گیا تھا۔ وہ پریشان کن سوچوں کی گرفت میں آ چکا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے اختیار ہو کر آہ سی بھرنے لگتا تھا۔ کونجاں کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح ضربیں لگا رہے تھے۔ اس نے اس سے پہلے بھی کونجاں کو اتنا دکھی اور مایوس نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے سلجھایا جائے جس کی سازش کے تار عنکبوت اس طرح بنے گئے تھے کہ نکاسی کی کوئی صورت ہی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

موجا خان کا مکروہ چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر اس کے غیظ و غضب کو ہوا دے رہا تھا مگر وہ یہ بھی کڑوی حقیقت جانتا تھا کہ اس طرح پیچ و تاب کھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کوئی قدم کوئی ایسا اور فوری عملی قدم اٹھانا ضروری تھا جس سے کونجاں جیسی معصوم اور سجل سنور لڑکی کو مکروہ موجا خان کے پنجوں سے بچایا جا سکے۔ معاً ہی قادر بخش کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ سرمد! یہاں اگر کسی طرح سرمد کو تلاش کیا جا سکے تو کسی حد تک مسئلے کو حل کرنے میں کوئی کامیاب پیشرفت ہو سکتی تھی۔'' اس خیال نے قادر بخش کی رگوں میں آتش جوش بھڑکا دی۔ ویسے قادر بخش کو اس بات پر حیرت اور افسوس ہو رہا تھا کہ آخر سرمد اتنا چھوٹے دل کا کیوں واقع ہوا تھا کہ ایک دم جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ قادر بخش سرمد کو اتنا کم ہمت اور بزدل نہیں سمجھتا تھا۔

آج سرمد کی روپوشی کو پورے آٹھ، نو دن ہونے کو آئے تھے۔ کیا وہ ان حالات سے بالکل بے خبر تھا؟ کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے گھر والوں پر بالخصوص اس کی معصوم بہن کونجاں پر کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی۔

پہلے تو قادر بخش کے جی میں آئی کہ وہ دوبارہ موجا خان اور اس کی پشت پناہی کرنے والے زمیندار حکم داد کے پاس جا کر اسے باز رکھنے کی کوشش کرے مگر پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ تاہم اب وہ جلد سے جلد سرمد کو تلاش کر لینے کی مہم شروع کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے آس پاس کے دیہات اور اس کے عزیز رشتے داروں سے ملنے کا منصوبہ بنایا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔



پازیب پر قاتلانہ حملہ کی خبر آگ کی طرح ہاسٹل سے پوری یونیورسٹی تک پھیل گئی تھی۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے برائے نام اور محض کاغذی طور پر کارروائی کی تھی مگر عاقل خان نے خود ذاتی طور پر ایک اعلیٰ پولیس افسر سے مدد لے کر متعلقہ تھانے میں نامعلوم قاتل کے خلاف نہ صرف رپورٹ درج کروا دی تھی بلکہ مذکورہ پولیس افسر کے ذریعے متعلقہ تھانے پر ایک ذمہ دار اور فرض شناس انسپکٹر چوہدری خرم کے ذریعے باقاعدہ تفتیش بھی شروع کروا دی تھی اور پازیب کے علاوہ ہاسٹل کے چوکیدار خان بابا کا بھی بیان دلوا دیا تھا۔ بہر طور انسپکٹر چوہدری خرم نے ضابطے کی کارروائی کے بعد پازیب پر قاتلانہ حملے کرنے والے نامعلوم ملزم کی تلاش شروع کر دی اور یہ پولیس نے ہاسٹل کے لان میں گرے ہوئے ملزم کا خنجر بھی ڈھونڈ کر اپنے قبضے میں لے لیا تھا کہ اس کے ذریعے فنگر پرنٹس بھی حاصل کر لئے تھے۔

اس سانحے کی اطلاع جب پازیب کی بڑی بہن گھنگھرو کو ملی تو وہ پریشان ہو گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہاسٹل سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے ہاسٹل تک محدود رہنے والی پازیب کا بھلا ایسا کون سا دشمن پیدا ہو گیا تھا کہ جو اس کی جان کے درپے تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب عاقل خان اور گھنگھرو کی ایک سنجیدہ نوعیت کی ملاقات ہوئی تھی۔ یوں تو پازیب نے اس واقعے کے بعد سے خود کو ہاسٹل تک ہی محدود کر لیا تھا

اور ہاسٹل میں پولیس کے کچھ آدمی بھی تعینات کر دیئے گئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ پازیب کے سر سے قاتلانہ حملے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس کے لئے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا جس پر سوچ و بچار کرنے کے لئے وہ تینوں، یعنی عاقل خان، پازیب اور گھنگھرو یکجا ہوئے تھے۔ ان کی یہ ''میٹنگ'' عاقل کی شہر والی رہائش گاہ ''لیچھر ولا'' کے ایک کمرے میں ہو رہی تھی۔ مذکورہ کمرہ ضرورت کی ہر اشیاء سے مزین تھا جس میں ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ اور ایک مرد کے علاوہ مالی، خانساما اور چوکیدار بھی تھا۔

کمرے کے وسط میں ایک دبیز خوبصورت قالین پر بچھے صوفوں پر آمنے سامنے یہ تینوں براجمان تھے۔ دونوں بہنیں، پازیب اور گھنگھرو اپنے چہروں پر پریشانی اور اضطراب لئے ایک صوفے پر ساتھ جڑی بیٹھی تھیں جبکہ سامنے کے صوفے پر عاقل خان براجمان تھا۔ اس کے تاثرات سے بھی الجھن آمیز پریشانی ہویدا تھی۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر پازیب کو کون قتل کرنا چاہ رہا ہے اور اس کا کیا مقصد پوشیدہ ہے؟'' ذرا دیر کی گھمبیر خاموشی کے بعد عاقل خان نے بالآخر پریشان کن لہجے میں کہا۔ پھر ذرا دیر بعد گھنگھرو نے پازیب کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''پازیب! کیا تمہارا بھی یونیورسٹی میں کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا تھا میرا مطلب ہے کسی اوباش قسم کے لڑکے سے۔''

''بالکل نہیں۔'' پازیب کی بجائے عاقل خان نے جلدی سے جواب دیتے ہوئے گھنگھرو کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں پازیب سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں رہتا اور ویسے بھی میں نہیں سمجھتا کہ کسی میں ایسی جرأت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سب لوگ میرے اور پازیب کے تعلق کے بارے میں اچھی طرح واقف ہیں۔''

اس کی بات سن کر پازیب کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ گھنگھرو کو عاقل خان کے لہجے میں ایک غرور کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ اسے اگرچہ عاقل خان کی یہ بات بری نہیں لگی تھی تو اچھی بھی نہیں لگی تھی تاہم وہ چپ رہی لیکن پھر فوراً ہی اس بوجھل اور لمحاتی وقفے کو پازیب نے پاٹتے ہوئے اپنی بہن گھنگھرو سے کہا۔ ''نہیں باجی! ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں آپ سے اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی۔''

"میرا خیال ہے پازیب کی رہائش کا الگ بندوبست کرنا پڑے گا۔" گھنگھرو نے فیصلہ کن مگر قدرے تائید طلب لہجے میں کہا تو عاقل خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس طرح پازیب محفوظ ہونے کی بجائے مزید خطرات میں گھر سکتی ہے۔ پازیب بہرصورت ہاسٹل میں ہی محفوظ رہ سکتی ہے لیکن اگر آپ کو برا نہ لگے تو میرا خیال ہے کہ جب تک مجرم گرفتار نہیں کرلیا جاتا، پازیب کو ادھر ہی رہنے دیا جائے۔ یہاں میری بہن سورٹھ بھی رہے گی اس کے ہمراہ!"

عاقل خان کی بات سن کر دونوں بہنوں نے ایک لمحے کو چونک کر بیک وقت اس کی طرف دیکھا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں اچانک قریب ہی تپائی پر رکھے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عاقل نے فوراً ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا۔ دوسری جانب انسپکٹر چوہدری خرم تھا۔

"انسپکٹر چوہدری خرم کا اچانک فون آنا...... کسی اہم خبر یا اطلاع کا ہی موجب ہوسکتا تھا۔" یہ بات عاقل خان نے ریسیور پر انسپکٹر خرم کی آواز سنتے ہی فوری طور پر سوچی تھی۔ بہرطور...... عاقل خان کے "ہیلو" کہتے ہی ریسیور میں انسپکٹر خرم کی آواز ابھری۔

"عاقل صاحب......! کیا آپ تھانے تشریف لا سکتے ہیں...... یا پھر میں خود حاضر ہو جاؤں؟"

عاقل خان کو انسپکٹر کا لہجہ کسی بھی سنسنی خیزی سے عاری محسوس ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے...... تاہم وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

"دونوں ہی باتیں درست ہیں۔ جیسا آپ چاہیں...... کیا کوئی ضروری بات تھی......؟"

"ہاں...... بس کچھ خاص نوعیت کی گفتگو کرنی تھی...... کیس کے سلسلے میں کچھ نکات میرے ذہن میں اچانک ہی آئے ہیں۔ شاید اس نامعلوم قاتل کے بارے میں کوئی سراغ ہاتھ آسکے۔"

اس کی بات سن کر عاقل لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولا۔ "انسپکٹر صاحب......! پھر آپ ایسا کریں کہ تھوڑی تکلیف گوارہ کرتے ہوئے...... ادھر ہی تشریف لے

آئیں۔ میں کینجھر ولا میں آپ کا منتظر ہوں......"

"میرے خیال میں یہی بہتر رہے گا۔" دوسری طرف سے انسپکٹر خرم نے کہا اور پھر رسمی کلمات کے بعد سلسلۂ گفتگو منقطع ہوگیا۔

انسپکٹر خرم کے اچانک فون آنے پر...... عاقل خان کے ذہن میں فوری طور پر پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید وہ پازیب پر قاتلانہ حملہ کرنے والے اس گمنام قاتل کے بارے میں کوئی امید افزا خبر دینا چاہتا ہو مگر عاقل کو یہ سن کر مایوس کن کوفت سی ہونے لگی کہ پولیس ہنوز تفتیش کے گھوڑے ہی دوڑا رہی تھی۔

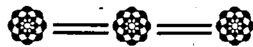
اس کے سامنے ایک ہی صوفے پر ساتھ بیٹھیں...... گھنگھرو اور پازیب نے عاقل خان اور انسپکٹر خرم کے درمیان ہونے والی مختصر گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ فون کس کا تھا۔ لہٰذا عاقل خان نے جیسے ہی ریسیور رکھا...... گھنگھرو نے یک دم بے تابی سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہے تھے انسپکٹر صاحب...... کچھ پتہ لگا قاتل کے بارے میں؟"

عاقل خان نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بے دلی کے ساتھ گھنگھرو کو فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتادیا۔ گھنگھرو کے چہرے پر مایوسی کھنڈ آئی تھی۔ اثنائے راہ...... ایک ادھیڑ عمر ملازمہ وہاں آئی اور عاقل خان سے مؤدبانہ انداز میں بولی۔

"بوتار سائیں......! حویلی سے پیغام آیا تھا...... وڈے سائیں نے آپ کو فوراً گوٹھ بلایا ہے۔" عاقل خان اس کی بات سن کر ایک لمحے کو چونکا۔ پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔ "کون لایا تھا حویلی سے یہ پیغام؟"

"بس...... سائیں بھوتار......! حویلی سے دو چاکر (ملازم) آئے تھے۔ آپ اس وقت یہاں موجود نہیں تھے۔ ان دونوں کو بھی فوری حویلی لوٹنے کا حکم تھا۔ اس لئے وہ اتنا بتا کر لوٹ گئے تھے۔" ملازمہ نے صراحت سے کہا۔ عاقل خان کی پیشانی پر تفکر کی پرچھائیاں مزید گہری ہوگئی تھیں۔



"اور کوئی خاص بات تو نہیں بتائی انہوں نے......" لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد کسی خیال کے تحت عاقل خان نے اس سے پوچھا۔

"نا سائیں بھوتار......! اور کوئی ایسی بات نہیں بتائی۔" ملازمہ نے جواب دیا اور پھر عاقل خان نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

وہ ابھی گوٹھ جانے کے قطعی موڈ میں نہ تھا۔ جب تک پازیب پر قاتلانہ حملہ کرنے والے اس گمنام قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل جاتا...... یہی وجہ تھی کہ عاقل خان اس پریشانی اور تگ ودو میں "کین جھرولا" بھی کئی دنوں سے نہیں آسکا تھا اور وہیں یونیورسٹی کیمپس میں دوستوں کے ہمراہ رہا تاکہ پازیب خود کو بالکل تنہا نہ سمجھے۔

"آ...... آپ کو گوٹھ کا چکر لگا ہی لینا چاہئے۔ ہوسکتا ہے آپ کے بابا سائیں کو کوئی بہت ضروری کام ہو آپ سے۔" ذرا دیر بعد پازیب نے سکوت توڑتے ہوئے عاقل خان سے کہا تو وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

"ہوگا کوئی...... زمینوں یا ہاریوں کا مسئلہ...... موقع ملا تو چکر لگا آؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو پازیب گہری نظروں سے عاقل خان کے ژولیدہ چہرے کی طرف بہ غور دیکھنے لگی۔

اسے بے اختیار خود پر فخر سا محسوس ہونے لگا۔ عاقل خان کو اپنے لئے اتنا پریشان اور متفکر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس بات کو پازیب کی بہن گھنگھرو نے بھی محسوس کیا تھا ساتھ ہی کچھ سوچنے پر بھی مجبور کیا تھا اور یہ بات درست ہی تھی کہ جب تک پازیب پر قاتلانہ حملہ کرنے والے مجرم کا پتہ...... یا وہ گرفتار نہیں کرلیا جاتا...... عاقل ایک لمحہ بھی پازیب کو تنہا چھوڑ کر کہیں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تقدیر بھی کیسے کیسے گل کھلاتی ہے۔ عاقل خان یہ بات نہیں جانتا تھا کہ...... گوٹھ جانے کا

اسے کتنا بڑا فائدہ ہوتا۔ اپنی جان جاناں اور محبوب ہستی پازیب کے جس نامعلوم قاتل کے بارے میں جتنا وہ پریشان ہورہا تھا اگر وہ تھوڑے ہی عرصے کے لئے گوٹھ چلا جاتا تو بڑی آسانی کے ساتھ اصل "مجرم" اس کے سامنے بے نقاب ہوسکتا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا باپ سردار شیر دل خان اس کا بے تابی سے منتظر ہی اسی لئے تھا کہ اپنے بیٹے کو نہ صرف "اصل مجرم" سے آگاہ کرے بلکہ ان کے لئے کڑی سے کڑی سزا بھی خود ہی تجویز کرے۔ مگر وہ تقدیر ہی کیا جو عجیب کھیل نہ کھیلے اور انسانوں کو جھمیلوں میں پڑنے سے بچائے۔

ذرا دیر بعد عاقل خان نے گھنگھرو کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک سوال دہرایا۔ "آپ کا کیا خیال ہے...... یہ بہتر نہ ہوگا کہ پازیب کا عارضی طور پر رہائش کا بندوبست "کینجھر ولا" میں کردیا جائے۔ جب تک کہ اصل مجرم گرفتار نہیں ہوجاتا۔ ویسے یہاں یہ زیادہ محفوظ اور خوش بھی رہ سکتی ہے۔"

عاقل خان یہ سوال ذرا دیر پہلے گھنگھرو اور پازیب سے پوچھ چکا تھا...... لیکن ان کے کوئی جواب دینے سے پہلے انسپکٹر خرم کا فون آ گیا تھا اور یہ بات بھی درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔

اب جبکہ...... عاقل خان نے دوبارہ اپنا سوال ان دونوں بہنوں کے سامنے دہرایا تو...... وہ دونوں پہلے چند ثانیے کو ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔ پھر بالآخر گھنگھرو نے صاف انکار کرنے کی بجائے مبہم سے انداز میں کہا۔ "عاقل صاحب......! آپ پہلے ہی ہماری وجہ سے اتنے پریشان اور بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں...... پھر الٹا پازیب بھی ایک بوجھ......"

"قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں...... لگتا ہے پازیب نے آپ کو...... میرے اور اپنے ایک سنجیدہ نوعیت کے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ورنہ شاید آپ اتنی غیریت کی باتیں نہ کرتیں۔" عاقل خان نے گھنگھرو کی بات کاٹتے ہوئے گہری متانت سے کہا اور اپنی نظریں ان کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ لاکھ لہجے کو محتاط رکھنے کے باوجود گھنگھرو کی بات عاقل خان کو مکدر سا کرگئی تھی۔ اس کے لئے واقعی یہ بات اچنبھے سے کم نہ تھی کہ جب پازیب نے اپنے اور اپنی بہن گھنگھرو کو اب تک اس بات

کا اندازہ کیوں نہیں ہو پایا تھا کہ...... پازیب اور اس کے بیچ تعلق خاطر کی کی جو ڈور قائم ہو چکی تھی اس سے وہ اتنی ہی بے خبر تھی کہ پازیب کی بھلائی کے لئے کی گئی کوششوں کو گھنگھرو ''احسانات'' کے القاب سے نواز رہی تھیں۔ البتہ گھنگھرو کو عاقل خان کا کھرا اور سچا لہجہ اچھا لگا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے ساتھ بیٹھی پازیب پر ڈالی۔ پھر عاقل خان کی طرف دیکھ کر اثبات میں بولی۔ ''عاقل صاحب......! میں معافی چاہتی ہوں۔ پازیب مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ وہ آپ کے بارے میں مجھے تفصیلاً آگاہ کر چکی ہے...... مگر اس بات سے قطع نظر پازیب کا ''لینجھر ولا'' میں رہنا کیا معیوب نہیں سمجھا جائے گا؟''

گھنگھرو کی محتاط گفتگو نے عاقل خان کو لمحہ بھر کے لئے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا پھر جب کافی دیر تک وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے پایا تو بالآخر پازیب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہاسٹل سے زیادہ میرے لئے کوئی اور محفوظ جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہ قاتل اتنا بے وقوف ہرگز نہیں ہو گا کہ دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرے۔'' پازیب نے کہا اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔



بظاہر ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ گھمبیر معاملہ دب چکا ہو مگر ایسا تھا نہیں اور یہ بات بھی حویلی کا تقریباً ہر فرد جانتا بھی تھا کہ...... رفتہ رفتہ...... ''بھٹائی ہاؤس'' ایک ایسے خوابیدہ آتش فشاں کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، جس کے بطن میں لاوا سا پک رہا ہو اور وہ کسی بھی سمے ایک خوفناک دھاکے سے پھٹنے والا ہو...... سب لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی بڑے طوفان کی آمد کا اشارہ کرتی ہوئی اس اچانک خاموشی میں اس وقت بھونچال آئے گا جب سردار شیر دل خان کا بڑا بیٹا عاقل خان شہر سے یہاں حویلی میں پہنچے گا۔

سب سے زیادہ ذہنی خلجان اور پریشانی میں عاقل خان کی بیوی ہدایتاں مبتلا تھی۔ اگرچہ...... اس کے دونوں سازشی بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد کی حویلی میں آنے جانے پر ایک غیر محسوس سی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ہدایتاں نے کسی طرح اپنے دونوں چہیتے بھائیوں کے پاس پیغام بھیج کر موجودہ صورت حال کی سنگینی کے

بارے میں بتا دیا تھا جس پر ان دونوں بھائیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے تاہم انہوں نے اپنی لاڈلی بہن کو جواباً پیغام بھجوایا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو اور ہوشمندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرے اور جیسے ہی عاقل خان حویلی پہنچے سارا الزام وہ اپنی سوتیلی ساس حاکم زادی کے سر تھوپ دے۔

بھائیوں کے پیغام سے ہدایتاں کو کچھ حوصلہ ہوا مگر پھر بھی اس کا دل اندر سے پریشان اور لرزیدہ تھا۔ اسے مکار حاکم زادی پر بھی غصہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اسی مکار عورت کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے اس بات پر بھی پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے اس اہم راز میں اسے کیوں شریک کیا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے کی ایک اونچی مسہری پر نیم دراز تھی۔ اس کے پہلو میں پانچ سالہ احمد علی اور چار سالہ بانو گہری نیند سو رہے تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا...... دیوار گیر کلاک نے رات کے بارہ بجائے تو دفعتاً ہی دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ہدایتاں خیالات سے چونکی۔

''اس وقت کون ہو سکتا ہے۔'' لمحہ بھر کو اس نے سوچا اور پھر بہ آہستگی مسہری سے اٹھ کر دروازے کے قریب آئی۔ ''کون......؟'' ہولے سے اس نے پوچھا۔

''میں ہوں...... تیری سائڑی...... حاکم زادی...... در کھول......''

دوسری طرف اپنی سوتیلی ساس کی آواز پر ہدایتاں کا دماغ جلنے لگا۔ ''اب کیا لینے آئی ہو یہاں...... کیا پھر مجھے پھنسانے کے لئے کوئی کھیل کھیلنا چاہتی ہو۔'' ہدایتاں نے جواباً تلخ لہجے میں کہا۔ زہر میں بجھے ہوئے اس کے الفاظ نظر انداز کرتے ہوئے اپنے لہجے میں ہمدردی سمو کر کہا۔

''دیکھ ڑی......! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری کچھ مجبوریاں تھیں...... پر تو در کھول...... سوچ بچار کرتے ہیں۔ آخر کو میں ہی تیرے کام آؤں گی۔''

اس بار پھر شاطر حاکم زادی کا چلتر چل گیا اور ہدایتاں نے لمحہ بھر کو کچھ سوچنے کے بعد دروازہ کھول دیا اور حاکم زادی ہدایتاں پر نظریں گاڑے ہونٹوں پر میٹھی مسکراہٹ لئے اندر آ گئی۔

انسان مجبور اور پریشان ہو تو دشمن کو ناچار برداشت کر لیتا ہے۔ حاکم زادی نے

بھی ایسے ہی وقت میں ہدایتاں کو امید کی جوت دکھائی تھی۔

"...... دیکھ ...... کاوڑ (غصہ) نہ کر ...... جو ہوا سو ہوا ...... کچھ تیری ...... کچھ میری مجبوریاں ...... پر اب آگے کی سوچ......" مکار حاکم زادی نے اندر داخل ہوتے ہی ہدایتاں سے سرگوشیانہ لہجے میں بولی اور مسہری کے پائینتی پر بیٹھ گئی۔

ہدایتاں بھی ایک پریشان کن خاموشی کے ساتھ مسہری کے سرہانے بیٹھ گئی۔

ہدایتاں کی طرف عیار نظروں سے تکتے ہوئے حاکم زادی دوبارہ مکاری سے بولی۔

"دیکھ ڑی ...... بیٹا باپ سے سوا سیر ہوتا ہے۔ اسی لئے عاقل خان کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں کچھ سوچنا ہوگا۔"

حاکم زادی نے اپنی بات ختم کی تو ہدایتاں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جما دیں۔ جیسے اب بہ زبان خاموشی پوچھ رہی ہو کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ لیکن حاکم زادی بھی ایک کائیاں تھی۔ وہ اس کی کیفیت کو فوراً بھانپ گئی اور آواز قدرے نیچی کر کے ہدایتاں کی طرف جھک کر بولی۔

"دیکھ ...... مجھے آپڑاں دشمن نہ سمجھیں ...... اب بھی تجھ پر کچھ زیادہ ہی کڑا وقت ہے اور سارا الزام بھی تیرے سر ہے لیکن مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا تھمی اور بڑے غور سے ہدایتاں کے چہرے کا جائزہ لینے لگی پھر بولی۔ "مجھے تو سائیں وڈے نے جو سزا تھوڑی بہت دینی تھی سو دے دی ...... پر تیرا مڑس ...... (شوہر) عاقل خان تیرے ساتھ بہت بری طرح پیش آ سکتا ہے۔"

"امڑ ......! تو کیا مجھے ڈرانے آئی ہے ...... میں پہلے ہی پریشان ہوں ...... کوئی کام کی بات ہے تو کر......" ہدایتاں نے دفعتاً حاکم زادی کی بات کاٹ کر کہا اور ردعمل کے طور پر حام زادی نے موقع مناسب جان کر فوراً پینترا بدلا۔

"یہ سب پہلے بتانا ضروری تھا ...... چل اچھا اب جیسے میں کہتی ہوں ویسا کرنا۔ عاقل خان اگر تجھ سے کچھ پوچھے تو صاف مکر جانا کہ تم بالکل بے قصور ہو...... اور تم نے محض سردار سائیں کے خوف کی وجہ سے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا...... تاکہ بات آئی گئی ہو جائے اور اس کے بعد جب عاقل خان کو تیری بات کا اعتبار ہونے لگے تو اسے یہ بھی فوراً بتا دینا کہ...... اصل سازش اس کی ماں دراں خاتون کی تھی۔"

حاکم زادی نے اپنی بات ختم کی تو ہدایتاں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"یہ میں نہیں کہہ سکوں گی کیونکہ عاقل خان اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسے میری بات پر بالکل یقین نہیں آئے گا۔"

"چری ہے تو ...... بول کر تو دیکھ ...... کچھ نہ کچھ تو تیری بات اس کے دل میں اثر کرے گی۔" حاکم زادی نے کہا۔ "لیکن اتنا یاد رکھنا ہدایتاں اپنا جرم کبھی تسلیم مت کرنا اور ہاں ...... ایک اور بات ذہن نشین کر لو۔ چاہے کچھ ہو جائے میرا نام زبان پر مت لانا ...... ورنہ تو سمجھتی ہے نا ...... کہ یہ ہم دونوں ہی کے لئے برا ہوگا۔" مکار حاکم زادی نے آخر میں بھیدوں بھرے لہجے میں کہا اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہدایتاں کے چہرے پر پُرسوچ خاموشی کا راج تھا۔



گوٹھ میں سرِ شام ہی رات جیسی تاریکی پھیل جایا کرتی تھی۔ ایک نسبتاً پختہ اینٹوں والے مکان سے ملحق کچی اوطاق میں سائیں رکھیو اور مولا داد دم بہ خود سے بیٹھے تھے ...... ان کے بشروں پر پریشانی کے آثار ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اندر بلب روشن تھا اور یہ دونوں ...... اوطاق کے باہر بدنما بانسوں کے سہارے ایستادہ پھونس کے چھپر تلے رلی بچھی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

آس پاس دور تک کھیتوں کے سلسلے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے ...... آسمان پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں کی وجہ سے ستاروں اور دمکتے چاند کی روشنی دب سی گئی تھی۔ ہوا بھی بند تھی مگر گھٹن عنقا تھی۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ کبھی کسی جھینگر کی وقفے سے سنسناہٹ ابھرتی۔

"ادا رکھیو ...... اب کیا کریں ...... یہ تو الٹی فلم ہی گلے پڑ گئی۔"

دفعتاً ...... سامنے کی چارپائی پر بیٹھے مولا داد نے ازراہ تشویش اپنے بھائی سے کہا۔

"...... یہ سب ادی ہدایتاں کی بے وقوفی سے ہوا ہے۔ اگر وہ اپنی چھوٹی ساس حاکم زادی کو ہم راز نہ بناتی تو آج حالات مختلف ہوتے۔" سائیں رکھیو نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"ویسے ادا سائیں رکھیو......! حالات بہت نازک اور خراب ہو چکے ہیں۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ کم بخت موگو...... اس شہر والی چھوکری کو قتل کرنے میں ناکام رہا...... ورنہ......"

"اڑے چریا ہوا ہے تو...... بس اتنی ہمت تھی تیرے اندر......" سائیں رکھیو ڈپٹنے کے انداز میں اپنے بھائی مولا داد سے بولا۔ "اڑے بابا...... تو گڑتی (فکر) کیوں کرتا ہے۔ اب بھی ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... پازیب کو مرنا ہی ہوگا۔ موگو کو میں نے پھر اس کے لئے ایک نئی منصوبہ بندی کے ساتھ تیار کر دیا ہے۔ وہ صبح تڑکے ہی شہر کی لاری پکڑ کر نکل جائے گا۔"

سائیں رکھیو نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ مولا داد کا چہرہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر وہ سائیں رکھیو کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا...... اتنا کچھ ظاہر ہونے کے بعد...... کیا اب بھی تو چاہتا ہے کہ اس شہر والی چھوکری کو دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ادا سائیں...... اس طرح...... اس طرح تو......"

"میں نے کہا نا بابا...... کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے ہدایتاں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ اب وہ کوئی غلطی نہیں کرے گی۔" سائیں رکھیو نے اسے تسلی دینی چاہی۔

"پر ادا سائیں......! ابھی اس کی پہلی غلطی کا خمیازہ سامنے نہیں آیا اور...... اور......"

"ہاں...... آئے گا بھی نہیں...... تو ڈر نہیں مولا داد...... ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا بھا رکھیو...... کہ...... اس شہر والی چھوکری کے قتل والا معاملہ فی الحال کچھ عرصے کے لئے ٹال دیا جائے۔"

"نا بابا...... یہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اچھا ہے۔ سمجھا کر...... اس میں ہمارا مفاد بھی تو ہے۔" سائیں رکھو...... بھائی کی بات پر عیاری سے بولا۔ "دیکھو...... پازیب پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد ہو سکتا ہے عاقل خان حفاظت کو مدنگاہ رکھتے ہوئے اس سے فوراً شادی کر لے۔ اگر یہ شادی ہو گئی تو آ پڑی ادی...... ہدایتاں کی

"بھٹائی ہاؤس" میں حیثیت ایک نوکرانی جیسی ہو جائے گی اور...... پھر ہماری جیبیں کون بھرے گا۔ ایک بہن کا ہی تو آسرا ہے۔"

مولا داد بھائی کی بات پر تفہیمی انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے جنبش دینے لگا۔ یہ حقیقت تھی کہ دونوں بلا کے نکھٹو اور کام چور تھے۔ ہدایتاں کے بعد زمیندار حکم داد کے یہ دونوں بیٹے تھے...... اور دونوں ہی شادی شدہ اور دو دو بچوں کے باپ تھے۔ باپ دادا کی جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان دونوں بھائیوں نے ہڈحرامی کی وجہ سے مزید کم کر دی تھیں۔ اس خطرناک کمی کو بھانپتے ہوئے ان کے باپ حکم داد نے فوراً بچی کھچی زمینوں کا حساب کتاب اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یوں دونوں مسٹنڈے اور نکھٹو اپنی ضرورتوں کے لئے باپ کے محتاج ہو گئے۔ تب ان کو اپنی شادی شدہ بہن ہدایتاں سونے کی ایک ایسی چڑیا نظر آئی جو انہیں دونوں ہاتھوں سے نواز رہی تھی۔



منصوبے کے عین مطابق سفاک موگو سائیں رکھیو کے ایماء پر اگلے دن علی الصباح لاری پکڑ کر سیدھا حیدرآباد اور پھر وہاں سے سوزوکی میں بیٹھ کر جامشورو پھاٹک پر اتر گیا۔ جون کی گرمیاں زوروں پر تھیں، دھوپ اس قدر تیز تھی کہ ہر ذی نفس کو جھلسا کر نیم جاں کئے دے رہی تھی...... اور...... ہر کوئی "العطش...... العطش" پکار رہا تھا۔

دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ پھاٹک پر آنے جانے والی بسوں اور دیگر موٹر گاڑیوں کا خاصا شور مچا ہوا تھا۔ ذرا آگے بس اسٹاپ پر بہت رش دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ہر ایک نے جان لیوا تیز دھوپ سے خود کو بچانے کے لئے سروں پہ تولیے اور بڑے رومال رکھے ہوئے تھے۔ موگو نے بھی اپنے سر پر اگرچہ اس مقصد کے تحت اپنی اجرک کو تہہ کر کے اسے رومال کی طرح سر پر ڈال رکھا تھا۔ اس طرح اس کا چہرہ بھی قدرے چھپ گیا تھا۔ اصل مقصود اس کا اپنا چہرہ چھپانا ہی تھا...... لیکن پھر بھی اسے اطمینان تھا کہ اگر کوئی اس کا چہرہ دیکھ لیتا تو پہچان نہیں پاتا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے کچھ روز پہلے ہاسٹل کی ایک لڑکی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ البتہ موگو کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل کے چوکیدار خان بابا کی طرف سے ذرا دھڑکا تھا۔ اگرچہ اس نے اس رات اس

کا پیچھا ضرور کیا تھا......لیکن موگو کا چہرہ وہ پھر بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ بہر طور موگو نے اب پہلے سے زیادہ ہوشیاری اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے بعد ہی اصل ''کارروائی'' کا ارادہ کیا تھا۔ جامشورو پھاٹک سے ذرا آگے ...... جہاں لوکل بسوں اور ٹرکوں کا اڈا تھا، وہاں کئی چھپر ہوٹل نظر آ رہے تھے۔ موگو ان میں ایک کا انتخاب کر کے اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد وہ دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے رہا تھا۔



گھنگھرو لگ بھگ گھنٹے بھر تک شمع محفل بنی اپنے سامنے بیٹھے لوگوں سے داد وصول کرتی رہی مگر وہاں موجود کچھ پرانے پاپیوں نے تاڑ لیا تھا کہ گھنگھرو کے وجود میں آج پہلے جیسا شاعرانہ اتار چڑھاؤ اور قیامت خیز لوچ نہیں ...... جو اس کا خاصا رہ چکا تھا بلکہ اس کی جگہ مشینی انداز کا ایک ایسا رقص تھا جس میں شوق وذوق کی جگہ ایک انداز بدذوق پنہاں تھا۔

ان پرانے پاپیوں کا تعلق چاندنی بی کے کوٹھے کے بڑے ''مہنگے'' لوگوں میں ہوتا تھا اور چاندنی بی بھی انہی کی دل بستگی کی تمام باریکیوں کو مدنگاہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایسا آج تک نہیں بلکہ گزشتہ کئی روز سے ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے نوٹ اچھالنے والے یہ حسن شباب کے آوارہ بیوپاری، اب جلد ہی کوٹھے سے رخصت ہونے لگے تھے اور انہیں پہلے جیسی ''گرم جوشی'' بھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔ ایک ایسے ہی پرانے پاپی نے محفل رقص وسرود کے درمیان ہی بیزاری سے اٹھ کر جاتے جاتے ......گھبرائی ہوئی چاندنی بی کے کان میں سرگوشی کر ڈالی تھی۔

''کیا بات ہے ...... چاندنی بھی ...... گھنگھرو کی آج طبیعت ٹھیک نہیں ...... یا پھر یہ رقص کرنا بھول گئی ہے؟''

مختصر پیرائے میں کہے گئے یہ الفاظ چاندنی بی کے سینے میں تیز دھار کی طرح اتر گئے۔ ابھی وہ اس وار سے سنبھل نہیں پائی تھی کہ دوسرے پاپی نے بھی وار کر ڈالا۔

''گھنگھرو کی اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اسے آرام کرواؤ چھ دن ...... چاندنی بی......! جتنے دن آرام کرے گی اتنے روپے ہم تمہیں ویسے بھی دے ہی دیں گے۔''

زہر میں بجھے ہوئے ان حقارت آمیز نشتروں نے چاندنی بی کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا

اور مارے خفت کے ......اس کے لبوں سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

محفل تمام ہونے کے بعد جیسے ہی گھنگھرو اپنے کمرۂ خاص میں آئی۔ چاندنی بی ......ملک الموت کی طرح پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے آ گئی اور غصے سے پھنکتے ہوئے وہ اسے مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ ''گھنگھرو......! ایسا آخر کب تک چلے گا......تم اپنے کام میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی ہو۔ غضب خدا کا ...... جو لوگ میرے آگے بچھے جاتے تھے وہ آج بڑی حقارت سے ایسی بکواس کر گئے ہیں کہ میری عزت تار تار ہو کر رہ گئی ہے۔''

وہ غصے سے ہانپنے لگی۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ گھنگھرو آج کل اپنی بہن پازیب کی وجہ سے پریشان تھی۔

''عزت ...... ہا......!'' جواباً گھنگھرو استہزائیہ ہنسی کے ساتھ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''یہاں ''عزت'' نام کی کوئی چڑیا بھی رہتی ہے۔ کم از کم مجھے تو اس کا علم نہیں۔''

گھنگھرو کے اس طنزیہ انداز نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چاندنی بی بھنا کر رہ گئی ......اور آگے بڑھ کر اس نے ایک زوردار تھپیڑ گھنگھرو کے چہرے پر رسید کر دیا۔

''کمینی......! بڑی زبان چلانی آ گئی ہے تجھے۔ میں سب جانتی ہوں تیرے دماغ میں ہر وقت پازیب کی فکر ہی گھسی رہتی ہے۔ اچھا ہی ہوتا جو اسے کوئی قتل کر ڈالتا۔''

''چاندنی بی......'' گھنگھرو زخمی ناگن کی طرح زور سے چلائی اور شعلہ بار نظروں سے اس کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''......اگر تو نے پھر کبھی میری بہن کے بارے میں ایسی بات منہ سے نکالی تو......''

''تو ......کیا ......تو ......کیا کرلے گی ......تو ...... بول......'' چاندنی بی اس پر چڑھ دوڑی۔ ''تیرا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔''

اثنائے راہ ...... اس کے پالتو چیلے منے خان اور گرانڈیل دبیر دادا بھی موسم ''خراب'' دیکھ کر اندر گھستے چلے آئے تھے۔

''دبیر......! اس عزت دار چھوکری کو ...... ذرا سنبھالو آج کی ذات ...... بڑی اونچی باتیں کرنے لگی ہے۔ اسے آج کی رات پوری طرح ''عزت دار'' بنا دو......''

چاندنی بی نے سفا کانہ انداز میں کہا۔

افریقی بیل جیسی جسامت رکھنے والے سیاہ بھٹ دبیر دادا کی آنکھوں میں یک دم گرسنہ چمک عود کر آئی اور وہ اپنے انڈے کے چھلکے کی طرح گنجے سر پر ایک خاص انداز سے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے سراسیمہ کھڑی گھنگھرو کو قصائیوں کی طرح گھورنے لگا۔ بے چاری گھنگھرو کی تو روح ہی فنا ہو گئی۔ احساس بے بسی کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ جھٹ آگے بڑھی اور چاندنی بی کے پیروں پر گرتے ہوئے گڑگڑا کر بولی۔ ''مجھے معاف کر دو...... چاندنی بی...... غلطی ہو گئی مجھ سے...... آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔''

''نہیں......! اب تو یہ روز روز کی جھک جھک تب ہی ختم ہو سکتی ہے جب تیرا بھی بندوبست کیا جائے اور تیری اس لاڈلی کا بھی۔'' چاندنی بی نے بڑی حقارت سے گھنگھرو کو پرے دھکیلتے ہوئے درشت لہجے میں کہا پھر قریب کھڑے منے خان سے مخاطب ہو کر بولی۔

''منے خان......! تمہارے ذمے بھی ایک اہم کام ہے، وہ یہ کہ تم چند دنوں کے اندر اندر اس بنو کی لاڈلی بہن ''پازیب'' کی اصلیت کا بھانڈا پوری یونیورسٹی میں پھوڑنا شروع کر دو تا کہ سب کو پتہ چل جائے کہ اس کا کس جگہ سے تعلق ہے۔''

مکار اور سفاک چاندنی کی یہ بات سن کر گھنگھرو کی روح فنا ہو گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ جب سے پازیب پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا...... گھنگھرو کو ہر وقت اپنی بہن پازیب کی پریشانی رہنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ''کام'' میں بھی صحیح طرح دلچسپی نہیں لے پا رہی تھی جس کی پاداش میں وہ آج ذہنی اور جسمانی طور پر زد و کوب کی جا رہی تھی۔ اسے اپنی بہن پازیب کی زیادہ فکر تھی۔ مسلسل آہ و زاری، نالہ و فریاد اور التجا کے باوجود گھنگھرو کی ایک نہ سنی گئی اور سنگ دل چاندنی بی وہاں سے چلی گئی۔ ادھر جاتے جاتے بدہیئت دبیر دادا اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے گھنگھرو سے معنی خیز لہجے میں بولا۔

''رانی......! آج ذرا بن سنور کر رہنا...... تیرا راجہ آ کر تجھے لے جائے گا۔''

جواباً گھنگھرو نے حقارت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔



زمیندار حکم داد اور اس کے گماشتے موجا خان نے قادر بخش کی شکایت اس کے باپ سردار شیر دل خان سے کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کیونکہ جب سے حویلی میں ہدایتاں کی سازش پکڑی گئی تھی تب سے زمیندار حکم داد اور سردار شیر دل خان کے خاندانوں کے بیچ سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ ہدایتاں پر اپنے میکے جانے پر بھی فی الحال پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ جب تک کہ اس کا شوہر عاقل خان شہر سے آ کر اس بارے میں پورے حالات سے آگاہی کے بعد اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔

اگرچہ زمیندار حکم داد کو اپنے سمدھی سردار شیر دل خان کی یہ بات بری لگی تھی مگر وہ سردست خاموش تھا۔ ادھر موجا خان کی خوش قسمتی اور قادر بخش کی بدقسمتی تھی کہ تقدیر اور حالات موجا خان کا ہی ساتھ دے رہے تھے۔

قادر بخش بے بس تھا۔ موجا خان اور کونجاں کی شادی رکوانے کے سلسلے میں قادر بخش کی ساری کوششیں اور تدابیر دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ سرمد کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ جان کے خوف سے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ ادھر سرمد کا باپ مٹھن ہاری اپنے بیٹے کی جاں بخشی کی خاطر اپنی بیٹی کونجاں کا رشتہ موجا خان کو دینے پر نہ صرف راضی ہو گیا تھا...... بلکہ اس نے سیدھے سادے طریقے سے اس کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔

ادھر موجا خان کے خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اگلے دن کونجاں جیسی نرم و نازک اور حسین ترین لڑکی کا وہ شوہر جو بننے والا تھا...... فتح کے نشے سے چور...... وہ اس وقت زمیندار حکم داد کے ساتھ محفل سجانے کے بعد خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

تصور میں وہ کونجاں کو اپنی دلہن کے روپ میں اپنے رقیب قادر بخش کو بال نوچتے ہوئے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

سرمئی شام کے سائے دراز ہو چکے تھے۔ وہ کھیتوں کے بیچ بل کھاتی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً فضا فائر کے زوردار دھماکے سے لرز گئی۔ موجا خان کی پیشانی پر

سرخ سوراخ نمودار ہو گیا اور وہ پہلے اپنی جگہ ساکت ہوا...... اس کے بعد تیورا کر گر پڑا۔ وہ مر چکا تھا۔

نامعلوم مقام سے آنے والی...... ایک ہی گولی نے موجا خان کا کام تمام کر ڈالا تھا۔ ذرا ہی دیر پہلے اپنی فتح پر مسرور موجا خان ...... اب پیوند خاک ہو چکا تھا۔ آس پاس دور تک سناٹا تھا۔ اطراف پھیلے ہوئے کھیتوں کے سلسلے میں شام اتری ہوئی تھی۔ فائر کی آواز پر کوئی بھی موجا خان کی لاش کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ نامعلوم مقام جدھر سے آنے والی سفاک گولی نے موجا خان کو جہنم واصل کیا تھا، ایک موٹے تنے والا پرانا برگد تھا۔ درخت کی آڑ میں ایک اجرک پوش شخص نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا پستول والا ہاتھ اجرک کے اندر کرتے ہوئے وہاں سے کھسک کر گندم کے سنہرے کھیتوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے جوش اور جذبۂ انتقام کی برق عیاں تھی۔ وہ اپنا ''کام'' بہ خوبی انجام دینے کے بعد بڑے آرام سے چلا جا رہا تھا تاہم اس کی مشکوک حرکات و سکنات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنے دیکھ لئے جانے کا خدشہ تھا۔

وہ اب کھیتوں سے نکل کر ایک سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی پر ہو لیا تھا۔ اس کے قدم تیز تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا ہو۔

شام کے سرمئی اندھیروں میں دور ہوتے بے ترتیب کچے پکے گھروں کے سوگوار ہیولے مدغم ہو گئے تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی اب کافی دور تک جانے کے بعد طویل و عریض بنجر میدانی علاقے میں بدل گیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو میل مسلسل پیدل چلتے رہنے کے بعد اچانک لئی اور کیکر کا جنگل شروع ہو گیا۔ سامنے قبرستان تھا جس کی چہار دیواری ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کے چلنے کی رفتار اب قدرے سست پڑ گئی تھی۔ وہ ہانپنے بھی لگا تھا۔ اس نے اب اجرک رومال کی طرح کاندھے پر ڈال لی تھی۔ اس کے چہرے سے پسینہ لکیروں کی صورت میں بہہ رہا تھا، تھکن کی جگہ اس کے بشرے پر جذبۂ انتقام کی تسکین چھائی ہوئی تھی۔

یہ سرمد تھا، کونجاں کا بھائی ...... قادر بخش کا گہرا دوست اور جسے مفاد پرست اور

بد طینت موجا خان نے اپنی جوان اور معصوم کنواری بہن بھاگی کے ساتھ ''کارو'' کا جھوٹا الزام لگایا تھا جس کے نتیجے میں بھاگی اپنے لالچی بھائی موجا خان کے ہاتھوں بے گناہ قتل ہو گئی اور سرمد کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ سمجھنے والے یہی سمجھ رہے تھے کہ سرمد روپوش ہو گیا اور اب اس کی کہانی ختم ...... موجا خان کو بھی یہی خوش فہمی تھی۔ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت کونجاں جیسی خوبصورت لڑکی سے دور نہیں کر سکتی مگر موجا خان ...... کونجاں سے تو دور کیا...... دنیا سے ہی دور کر دیا گیا تھا۔ روپوش ہونے کے بعد سے سرمد اپنے گھر والوں سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہا تھا۔ بالخصوص موجا خان اور زمیندار حکم داد پر تو سرمد کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ تقریباً ہر روز ہی بھیس بدل کر اپنے گوٹھ اور زمیندار حکم داد کی اوطاق کا چکر لگاتا تھا۔

اس طرح وہ ان دونوں یعنی زمیندار حکم داد اور موجا خان کے آئندہ عزائم جاننے کی خاطر ان کی سن گن لینے کی کوشش کرتا تھا۔ سرمد جانتا تھا اسے ''کارو'' قرار دے کر گھر سے دور ...... در بدر اور خاک بسر کرنے میں زمیندار حکم داد بھی برابر کا شریک ہے۔

اگر وہ موجا خان کی پشت پناہی نہ کرتا تو آج حالات کچھ اور ہوتے۔ نہ وہ جنگلوں کی خاک چھان رہا ہوتا اور نہ ہی پانی سر سے اتنا اونچا ہوتا کہ اسے آج موجا خان کو قتل کرنا پڑتا۔ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ تاریک جنگلوں کا مسافر بن چکا تھا۔

قبرستان کی شکستہ اور ٹوٹی پھوٹی دیوار اب قریب آ چکی تھی۔ سرمد اسے بآسانی عبور کر کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ قبرستان کا عقبی حصہ کہلاتا تھا۔ یہاں ہر سو پُر ہول سناٹا طاری تھا۔ جابجا شکستہ اور ٹوٹی پھوٹی قبروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

یہاں شام آن واحد میں مزید تاریک ہو گئی تھی۔ سرمد قبروں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی لکیر جیسے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اسے آس پاس کا ماحول بالکل خوفزدہ نہیں کر رہا تھا جس کے اندر خود قبرستان کے مانند ہولناک اور مہیب سناٹے آباد ہو چکے ہوں انہیں بھلا کب یہ تاریک اور ڈراؤنے مناظر خوفزدہ کرتے ہیں۔ اس قبرستان کا رقبہ خاصا وسیع تھا۔ یہ قبرستان بابا مٹھل شاہ کے نام سے موسوم تھا جن کا متروک الحال مقبرہ قبرستان کی بیرونی سمت ایک سفید سی نیم پختہ اور جگہ جگہ سے کھڑی اینٹوں والی مختصر سی چہار دیواری کے وسط میں بنا ہوا تھا جہاں خود رو جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ سرمد

قبرستان کے عقبی حصے سے اندر داخل ہوا تھا اور اب مذکورہ مقبرے سے متصل ایک لانڈھی (کسی پیر فقیر کی اوطاق) میں داخل ہو گیا جہاں مدھم سی روشنی میں شکستہ فرش پر بچھی کھجی کی چٹائی پر پانچ کے قریب ملنگ نما افراد دائرے کی صورت میں بیٹھے بڑے بڑے مٹی کے کونڈوں میں بھنگ گھوٹ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چرس بھری سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر دھواں فضا میں اگلتے ہی یہ آواز بلند کرتے۔ ''ہا...... لگے دم مٹے غم...... چرسی کبھی نہ مرسی...... مرشد سائیں کی خیر......''

اس کے ساتھ ہی بھنگ گھوٹنے کے عمل میں تیزی آ جاتی۔ ان کی پیٹھیں برہنہ اور مدقوق سی تھیں، نیچے میلا اور بوسیدہ سا تہبند باندھ رکھا تھا۔ چرس بھری سگریٹوں کے علاوہ ایک دو ہاتھوں میں سلفیاں بھی تھیں جو باری باری مٹھی میں تھامے ایک دوسرے کے ہونٹوں سے لگاتے تھے۔ ایک ناگوار سی بو اندر چھائی ہوئی تھی۔ سرمد اب اس بو...... اس ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آ کر جوتے اتار کر ایک کونے میں چپ دیوار سے پشت لگائے بیٹھ گیا۔

''ڑے چھوکرا...... کیا بات ہے بابا...... بڑا ماٹھ (چپ) کر کے بیٹھا ہوا ہے۔''

دفعتاً ایک چرسی نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے پکارا اور اس کے قریب آ گیا اور اپنی مٹھی میں دبی ہوئی چرس بھری سگریٹ اس کی کھوئی کھوئی اداس آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پھر بولا۔ ''لے...... لے...... ڑے...... چھورا...... ہک کش لگا لے...... لگے دم مٹے غم......''

سرمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سینے اور دماغ میں پہلے ہی کثیف سوچوں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے پھر کیا سوچ کر اس نے سگریٹ لی اور اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک لمبا کش لگا کر دھواں فضا میں اگلا تو جیسے وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔ وہ چرسی سرمد کو سرور میں دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف کھسک گیا۔

گوٹھ سے فرار ہونے کے بعد سرمد کو روپوشی کے لئے یہی سب سے اچھی جگہ لگی تھی۔ یہاں کی دنیا ہی الگ تھی۔ یہ لوگ خود کو بابا مٹھل شاہ کے مقبرے کے مجاور کہتے

تھے مگر درحقیقت ہر قسم کا نشہ پانی یہاں موجود رہتا تھا اور سرمد نے خود دیکھا تھا کہ اس لانڈھی میں بڑے امیر اور وڈیرے زادے اور پولیس کے گنے چنے اہلکار بھی آتے تھے۔ وہ زیادہ تر بھنگ پیتے تھے اور اپنی خوشی سے ایک کونے میں رکھی تالا بند لوہے کی زنگ آلود پیٹی میں چند نوٹ ڈال جاتے تھے۔ اس مقبرے یا لانڈھی کا اصل مجاور کون تھا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

سرمد بھی اُن کے ساتھ رل مل کر خود کو ملنگ بنا چکا تھا۔

سرمد نے انہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ سوائے اس کے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں مگر ان پانچ ملنگوں میں...... جن کی عمریں پچاس سے متجاوز تھیں۔ ایک نسبتاً ادھیڑ عمر میرو نامی ملنگ نے پہلے دن سے ہی سرمد کے بشرے سے مجرمانہ قسم کے تاثرات تاڑ لئے تھے۔ میرو اس وقت تو کچھ نہیں بولا مگر رات کے وقت جب یہ دونوں تنہا ہوئے، وہ سرمد کے قریب سرک آیا۔ پہلی بار اس نے ہی سرمد کو چرس والی سگریٹ کا عادی بنایا تھا۔

''دیکھ چھورا...... ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ دنیا سے راز تو نہیں کرنا ہوتا۔ پر ہک پر اعتماد مجبوراً کرنا پڑتا ہے...... ورنہ...... آدمی گھٹ گھٹ کر مر جاتا ہے۔ ہماری دنیا دیکھ لو...... سیدھی اور سچی ہے...... منافقت سے پاک...... جو ہے ظاہر وہی باطن...... کھول دے اپڑاں راز...... ہلکے ہو جاؤ گے...... ہو سکتا ہے...... میں تیری مدد بھی کر دوں۔''

تب پہلی بار سرمد نے اسے اپنی ساری دکھ بھری کتھا سنا ڈالی جسے سن کر میرو کو کوئی اچنبھا نہیں...... مگر ملال ضرور ہوا۔

''اب تو کیا چاہتا ہے ڑے......'' ذرا دیر بعد میرو نے اس کا عندیہ لینا چاہا۔

''جس ناپاک مقصد کے لئے اس بدذات اور بے غیرت موجا خان نے مجھ پر کارو کا جھوٹا الزام لگایا، میں اسے اس مقصد میں کامیاب ہرگز نہیں ہونے دوں گا، چاہے مجھے اس کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔'' یہ کہتے ہوئے سرمد کا چہرہ اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔ اس کے پورے وجود میں اضطراب آمیز ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی بات سن کر میرو موالی کے خاکستری ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار

ہوگئی۔ وقت گزرا...... اور سرمد رفتہ رفتہ اس ماحول میں رچ بس گیا۔ انہیں دنوں میرو کے ذریعے سرمد کو پتہ چلا کہ اس لانڈھی میں ایک نظرو نامی بدنام دھاڑیل کا بھی آنا جانا ہے...... جو رات کی تاریکی میں تنہا آتا تھا اور بھنگ اور دیگر نشہ پانی کرنے کے بعد پو پھٹنے سے پہلے خاموشی کے ساتھ لوٹ جایا کرتا تھا۔

میرو نے مذکورہ دھاڑیل سے سرمد کی ایک رازدار ملاقات کروا دی۔ نظرو دھاڑیل نے پہلے تو ایک نظر سرمد کو بہ غور دیکھا تھا پھر اس کے بعد اس نے دوٹوک لہجے میں سرمد جیسے سیدھے سادے مگر جوشیلے لڑکے کو ایک پستول دیتے ہوئے کہا کہ اسے وہ امتحان کے طور پر اپنے پاس رکھے اور اپنے دشمن پر بھی نظر رکھے۔ اگر اس پستول کا اس نے جائز استعمال کر ڈالا تو...... وہ اسے آگے بھی تحفظ دے گا۔

آج سرمد جبکہ نظرو دھاڑیل کے دیئے ہوئے پستول سے اپنے دیرینہ دشمن موجا خان کو جہنم واصل کر چکا تھا تو اب اسے بے چینی سے نظرو دھاڑیل کا انتظار تھا۔ وہ اسے اپنے کارنامے کے بارے میں بتا کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ......



”چھوٹے سائیں......! انسپکٹر صاحب آئے ہیں۔“

ایک ملازم نے صوفے سے پشت لگائے بیٹھے...... عاقل خان کو مؤدبانہ انداز میں اطلاع دی اور عاقل خان، جو اس وقت انسپکٹر چوہدری خرم کا ہی منتظر تھا، گھمبیر آواز میں بولا۔ ”بھیج دو اندر......“

ملازم کے جانے کے ذرا دیر بعد ہی انسپکٹر چوہدری اپنے مخصوص ڈیل ڈول کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ عاقل خان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور اسے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر بولا۔

”آپ نے کوئی خاص بات کرنی تھی انسپکٹر صاحب...... پوچھیے میں تیار ہوں۔“ تو انسپکٹر کے چہرے پر ایک لمحے کو روایتی سی گھمبیر سوچ کی پرچھائیاں ابھریں، اس کے بعد وہ ہولے سے کھنکار کر بولا۔

”عاقل صاحب......! جائے وقوع سے ہمیں جو آلۂ قتل یعنی خنجر ملا تھا۔ میں نے

اس کے برانڈ اور میک کے سلسلے میں خاصی دوڑ دھوپ کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ...... وہ دیسی ساخت کا خنجر تھا جو کسی دوردراز علاقے کی بھٹی میں تیار کیا گیا ہے۔“ اپنے تئیں ایک سنسنی خیز انکشاف کرنے کے بعد انسپکٹر خرم نے اپنی نظریں عاقل خان کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ عاقل خان کو...... پولیس کی اس حد تک تفتیشی پیشرفت اچھی لگی تھی لہٰذا وہ قدرے غیر یقینی سے انداز میں انسپکٹر سے بولا۔ ”کیا واقعی......؟“

”جی......! اور وہ خنجر واقعی ایسا بدہیئت سا ہے...... جو کسی شہر کی بھٹی میں تیار ہونے کی بجائے...... کسی عام سے لوہار کی چھپر نما دکان میں تیار ہوا ہے۔ اس کی فنشنگ سے یہی ظاہر ہوا ہے۔“ انسپکٹر نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں......!“ جواباً عاقل خان پُرسوچ انداز میں بولا پھر وہ انسپکٹر خرم کی جانب مزید مستفسرانہ نظروں کے ساتھ تکنے لگا۔ اسے انسپکٹر خرم کے چہرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے کھل کر...... کوئی بات کرنے سے جھجک رہا ہو...... مگر اگلے ہی لمحے انسپکٹر پُراعتماد لہجے میں کہنا شروع ہوا۔

”مسٹر عاقل......! آپ ایک پڑھے لکھے شخص ہیں...... یقیناً ہماری مجبوری شیئر کریں گے۔ درحقیقت...... پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے ایندھن کے سوا آگے نہیں بڑھتی۔ بعض مرتبہ ہمیں اتنی گہرائی تک بھی جانا پڑتا ہے کہ کسی کے خیال و خواب میں بھی وہ بات نہیں ہوتی اور میری اب تک طویل پیشہ وارانہ زندگی کا تجربہ ہے کہ عموماً مجرم...... بغل سے ہی نکلتا ہے۔ میں آپ سے بھی ایک ذاتی نوعیت کا سوال کروں گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو......“ انسپکٹر نے اچانک کہا۔ جواباً عاقل خان گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کشادہ دلی کے ساتھ بولا۔ ”انسپکٹر صاحب......! آپ بلاجھجک اور کھل کر گفتگو کریں۔ میں ضرور جواب دوں گا۔“

”یقین کیجئے، یہی بہتر ہے۔ یہ گتھی اسی طرح ہی سلجھے گی جب تھوڑا ذاتیات اور اپنے اردگرد کے ماحول میں جھانکیں گے۔“ انسپکٹر نے فوراً پُرزور انداز میں کہا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ”عاقل صاحب...... میں نے پازیب اور اس کی بہن گھنگھرو

سے بھی تفصیلی پوچھ تاچھ کی ہے۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی اپنے گوٹھ میں کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں......''

اس کی بات سن کر عاقل کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھنے لگا جیسے اس نے کوئی بچگانہ سوال پوچھ لیا ہو۔ تاہم وہ جواباً بولا۔ ''انسپکٹر صاحب......! ظاہر ہے ہم جس قبیل کے لوگ ہیں...... وہاں جھگڑے اور تنازعات تو معمول کی بات ہیں مگر پازیب پر قاتلانہ حملہ سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔''

یہ سن کر انسپکٹر خرم کے ہونٹوں پر کچھ ایسی دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے اسے عاقل خان سے اس سوال کی توقع ہو۔ اثنائے راہ ایک ملازم ٹھنڈے مشروبات سامنے ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ ذرا دیر کے لئے خاموشی چھائی رہی پھر انسپکٹر خرم بولا۔

''عاقل صاحب......! میں نے کہا کہ دوران تفتیش ہمیں مجبوراً بلکہ ضرورتاً کچھ ذاتی نوعیت کے مسائل کو بھی زیر بحث لانا پڑتا ہے۔ میرا مطلب آپ کا پازیب سے مستقبل میں شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی پہلی شادی ہو چکی ہے۔ کیا آپ نے اپنے اس مستقبل کے پروگرام کے بارے میں اپنے گھر والوں بالخصوص اپنی پہلی وائف کو آگاہ کیا تھا؟'' اتنا کہہ کر انسپکٹر خرم گہری نظروں سے عاقل خان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگرچہ عاقل خان کو اس کا یہ سوال کچھ عجیب سا لگا تھا مگر اس نے گھمبیر لہجے میں جواب دیا۔

''ہم اپنے معاملات اور فیصلے میں خودمختار ہیں اور اس کی خبر اسی وقت دیتے ہیں جب کوئی فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں...... رہا سوال میری پہلی وائف کا...... اس بارے میں ہم اپنی عورتوں کی رائے لینا ضروری نہیں سمجھتے۔''

''میرا خیال ہے عاقل صاحب......! کہ پازیب کو قتل کرنے کی سازش آپ کے گھر سے ہی شروع ہوئی ہے۔'' بالآخر انسپکٹر خرم نے اپنے خدشے کا اظہار کر ہی دیا۔

''اس کا مطلب ہے...... آپ ہمارے خاندان کے افراد کو بھی شامل تفتیش کرنا چاہتے ہیں؟'' اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے عاقل خان انسپکٹر کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......'' انسپکٹر خرم نے درمیانے لہجے میں کہا۔

''ہرگز نہیں انسپکٹر صاحب......!'' عاقل خان نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔ ماحول ایک لمحے کو مکدر سا ہو گیا تھا۔ نتیجتاً انسپکٹر خرم بھی اپنے کاندھے اچکا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ خیال آپ اپنے دل سے نکال دیں انسپکٹر صاحب......! کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد ایسی جرأت کر سکتا ہے۔''

''یہ صرف آپ کا خیال ہے۔'' انسپکٹر خرم نے متانت کے ساتھ کہا اور رخصت ہوتے ہوئے مزید بولا۔ ''جیسے آپ کی مرضی...... اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔''

انسپکٹر خرم وہاں سے چلا گیا۔ اسی اثناء میں عاقل خان کو ایک ملازم کے ذریعے اس کے پاس سردار شیر دل خان کا پیغام ملا جس میں اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً گوٹھ پہنچے۔ لگ بھگ یہ چوتھی بار اسے پیغام مل چکا تھا جسے سن کر عاقل خان کو عجیب سی الجھن اور پریشانی نے آ لیا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ ابھی کسی طور بھی گوٹھ جانے کے موڈ میں نہ تھا۔ جب تک کہ پازیب والا معاملہ نہ نمٹ جاتا مگر اس بارے اسے پیغام میں سختی سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہر حال میں ''بھٹائی ہاؤس'' پہنچے۔ اس بارے ملنے والے پیغام نے عاقل خان کو سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔



چاندنی بی کے کوٹھے کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب سے چاندنی نے گھنگھرو کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ اب نہ صرف اس کی چھوٹی بہن کا پول اس کی پوری یونیورسٹی میں کھول دے گی اور اس رات جب دبیر دادا نے گھنگھرو کے ساتھ سختی کرنی چاہی تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ نہ صرف یہ...... بلکہ اس نے اپنے گریبان سے ایک تیز دھار چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا کہ...... اگر دبیر دادا نے اس کی طرف ذرا بھی بڑھنے کی کوشش کی تو...... وہ خود کو مار ڈالے گی۔

یہ بات دبیر دادا ہی نہیں بلکہ چاندنی بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا کاروبار

گھنگھرو کے دم سے ہی آباد تھا کیونکہ گھنگھرو کی شہرت بطور ایک معروف مغنیہ کے پھیلی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ یہ نقصان برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ناچار دبیر دادا غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا گھنگھرو کے کمرے سے چلا گیا تھا اور ساری صورت حال چاندنی کو بتادی تھی۔ ''آخر یہ لڑکی ...... کس کی شہہ پر اتنا اکڑ رہی ہے؟''

اس رات چاندنی نے منے خان اور دبیر دادا کو اپنے کمرۂ خاص میں گھنگھرو کے سلسلے میں بات کرنے کو بلایا تھا اور یہ جملہ چاندنی نے اسی طرح ہی ادا کیا تھا ...... جیسے اپنے بال نوچنے کی ہی کسر باقی رہ گئی ہو۔ ''چاندنی بی! تم عاقل خان کو بھول گئیں۔ وہی وڈیرا زادہ ...... جس نے گھنگھرو کی لاڈلی پازیب کو اپنی دلہن بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ یہ سب اسی کی شہ ہے جس نے گھنگھرو کا دماغ خراب کر ڈالا ہے۔'' دبیر دادا زہرخند لہجے میں بولا تو قریب بیٹھے منخنی سے منے خان نے بھی معنی خیز لقمہ دینا ضروری سمجھا اور مکارانہ انداز میں اپنی باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''تم دونوں کو تحمل سے کام لینا چاہئے ...... اور اپنے پتے نہایت ہوشیاری اور مکاری سے کھیلنے چاہئیں۔''

''کیا مطلب منے خان ......! کیا ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے اپنے گھر کی چھت گرتی دیکھتے رہیں ......؟'' چاندنی نے منے خان کی بات پر قدرے طنزیہ آمیز انداز سے کہا تو منے خان بولا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس دو رانیوں کے پتے ہیں۔ ایک پازیب اور دوسری گھنگھرو ...... پازیب والا معاملہ ایسے ہی چھوڑ دو ...... پہلے اپنی گھنگھرو کو قابو کرو ...... لیکن سختی سے نہیں ...... تھوڑا پیار اور تھوڑا بلیک میلنگ سے ......''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو منے خان ......!'' اس بار دبیر دادا نے لب کشائی کرتے ہوئے اعتراض کیا۔ ''تمہیں شاید حقیقت کا اندازہ نہیں کہ اگر پازیب والا معاملہ چھوڑ دیا اور وڈیرے زادے عاقل خان نے اسے اپنی دلہن بنالیا تو گھنگھرو کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ وہ چاہتی ہی یہی ہے کہ اس کی لاڈلی عزت کے ساتھ بیاہ دی جائے۔ تب تو گھنگھرو کا دماغ اور خراب ہو جائے گا اور وہ ہمیں اسی طرح تنگ کرتی رہے گی جس طرح اب کر رہی ہے۔''

چاندنی دبیر دادا کے منہ سے ایسی نکتہ رس گفتگو پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ اسے

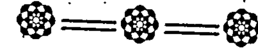
شاید دبیر دادا جیسے بدمعاش سے ایسی گفتگو کی توقع نہ تھی۔ وہ مستفسرانہ نگاہوں سے منے خان کا چہرہ تکنے لگی کہ اب وہ کیا جواب دیتا ہے۔ ادھر جواباً منے خان نے ہنوز اپنی باچھیں پھیلائے ہوئے دبیر دادا کی طرف دیکھا پھر مکاری سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع ہوا۔

''میں نے پازیب اور گھنگھرو کو ترپ کے پتوں کی مثال اسی لئے دی تھی ...... پازیب ...... بہترین اور مؤثر ذریعہ ہے گھنگرو کا دماغ درست رکھنے کا۔ تم لوگوں کو کیا ابھی تک اس کا اندازہ نہیں ہو پایا ہے کہ پازیب کو ذرا بھی خراش آتی ہے تو گھنگھرو بے چین ہو جاتی ہے اور یہ پازیب ہی ہے جس کے لئے گھنگھرو ...... ہماری سب باتیں مانتی آ رہی ہے۔ رہی بات یہ کہ تمہارا خیال ہے کہ پازیب کے پیا دیس سدھار جانے سے گھنگھرو کی زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا اور آگے چل کر اس کا دماغ مزید خراب ہو جائے گا ...... تو یہ سراسر غلط ہے ...... پازیب کے بیاہ کے بعد تو گھنگھرو کی پوزیشن اور کمزور ہو جائے گی۔'' منے خان نے یہاں پہنچ کر ذرا دم لیا پھر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''میں سو فیصد یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں۔ عاقل خان کو پازیب کی اصل حقیقت کے بارے میں علم بھی ہوگا۔ مگر چونکہ اس وقت اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے، اس لئے وہ پازیب کی یہ بات کہ اس کا تعلق ''اس بازار'' سے ہے، نظرانداز کر گیا ہوگا مگر ...... اپنے خاندان والوں کے سامنے وہ اس کی یہ برائی ...... ضرور چھپائے گا۔ یہ تو رہی یہاں تک بات ...... اب اپنی گھنگھرو کی طرف آؤ۔ اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی کئے بغیر ...... پازیب کا کارڈ استعمال کر کے اسے اور اکیلے بلیک میل کرتے رہنا چاہئے۔ میں نے دونوں بہنوں کے ایک ساتھ فوٹوگراف بھی لئے ہیں۔ جب گھنگرو اس سے برقع پہن کر ملنے جایا کرتی تھی۔''

منے خان نے اپنی بات ختم کی ...... چاندنی اور دبیر دادا کے چہروں پر مسرت دیدنی تھی۔ منے خان نے پھر کہا۔ ''...... یہ معاملہ تم اب میرے سپرد کر دو ...... گھنگھرو کو گانے اور ناچنے دو ...... وہ جیسا بھی ناچے گائے میں خود اسے آہستہ آہستہ شیشے میں اتارتا رہوں گا۔ تم دیکھنا میں ایسی بازی چلوں گا کہ پازیب بھی گھنگھرو بن جائے گی

ایک دن......"

منے خان نے اپنی بات ختم کی اور چاندنی سمیت دبیر دادا کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹیں رقصاں ہوگئیں۔ یہ حقیقت تھی کہ چاندنی منے خان کے سازشی دماغ کی معترف تھی۔ اسے اس بات پر حیرت آمیز افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے گھنگھرو جیسے گھمبیر معاملے میں اپنے اہم مہرے منے خان کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔



موجا خان کے اچانک قتل کی خبر پورے گوٹھ میں ایک ہراس کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی۔ ایسے وقت میں موجا خان کا پراسرار قتل...... جب اس کی مٹھن کی بیٹی کونجاں سے ایک دن بعد شادی ہونے والی تھی۔ سوچنے والوں کے اذہان میں مختلف و متوقع سوالات گردش کرنے لگے تھے۔

موجا خان کے قتل کے سلسلے میں جہاں لامحالہ......لوگوں کو روپوش سرمد پہ شبہ تھا...... وہاں بعض لوگ جنہوں نے...... شروع دن سے جب موجا خان نے سرمد کے ساتھ اپنی بہن بھاگی کو ''کاری'' کر کے مار ڈالا تھا اور جس کے نتیجے میں سرمد نے روپوشی اختیار کر لی تھی، اس سنسنی خیز معاملے کے بارے میں کچھ زیادہ ہی گہری سن گن اور ٹوہ رکھی تھی۔ ان کا دبا دبا سا شک سردار شیر دل خان کے بیٹے قادر بخش کی طرف بھی جاتا تھا۔ دبا دبا اس لئے قادر بخش پر شک کر رہے تھے کہ وہ سردار کا بیٹا تھا اور کھل کر اپنے اس شبے کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس چیز کو دبایا جاتا ہے، وہ اتنی شدت کے ساتھ ابھرتی بھی ہے۔ شبہ کرنے والے افراد یہ جانتے تھے کہ قادر بخش بھی کونجاں کے سلسلے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ باقی رہے وہ افراد جنہیں موجا خان کے قتل کا سرمد پر شک تھا...... وہ البتہ اِدھر اُدھر ہوٹلوں، کچہریوں میں کھل کر اپنے اس شبے کا اظہار کرتے پھر رہے تھے۔

قادر بخش کو جب موجا خان کے قتل کی اطلاع ملی تو چند ثانیے کے لئے وہ گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم اس بات کی خوشی تھی کہ معصوم کونجاں زندہ درگور ہونے سے بچ گئی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے لئے یہ بات بھی باعث تعجب رہی تھی کہ آخر موجا خان جیسے شخص کو قتل کرنے کی جرأت کس نے کی...... اور پھر دوسرے ہی لمحے خود اس کے دماغ میں اپنے دوست سرمد کا نام ابھرا اور وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ اسی کا کام ہے؟

یقیناً یہی بات ہو گی ...... اس کا مطلب تھا وہ یہاں کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ اسے اپنے گھر کے بارے میں پل پل کی خبر تھی ...... اور اسے اس بات کا بھی کسی طرح علم ہو چکا تھا کہ اس کی بہن کونجاں کا نکاح موجا خان سے ہونے والا ہے۔ دوسرا خیال قادر بخش کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ سرمد کہیں آس پاس ہی روپوش تھا مگر کہاں؟ اس نے تو آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا تھا اسے ابھی تک اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ سرمد نے ہنوز اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے دوست کے سلسلے میں تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر موجا خان کو سرمد نے قتل کیا تھا تو یہ بات اس کے حق میں بہتر نہیں تھی ...... اب اسے اس بات کی بھی ٹوہ لگی ہوئی تھی کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کارروائی کرتی ہے ...... نیز موجا خان کے قتل کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں کون درج کراتا ہے ...... اور کس کے خلاف ......؟ اس بارے میں پہلا خیال اس کے ذہن میں زمیندار حکم داد کا آیا تھا۔ قادر بخش نے سوچا کہ خود اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کرے ...... مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اس بات کا کھوج لگانے کے لئے اپنے ایک قابل اعتبار بندے وزیر علی کو لگا دیا۔ اس نے اگلے ہی دن اس کی توقع کے عین مطابق یہ اطلاع دی کہ قتل کی ایف آئی آر سرمد کے خلاف درج کروا دی تھی ...... اور اب متعلقہ تھانے کی پولیس پوری سرگرمی کے ساتھ سرمد کو موجا خان کے ممکنہ قاتل کی حیثیت میں تلاش کر رہی ہے۔ اس مخدوش صورت حال نے قادر بخش کو اپنے دوست اور کونجاں کے بھائی سرمد کے بارے میں مزید پریشان کر دیا تھا۔ وہ سرمد کو تلاش کرنے کی مہم شروع کر چکا تھا اور اس سلسلے میں اس نے وزیر علی کو بھی لگا دیا تھا۔



سازشوں بھری رات ''بھٹائی ہاؤس'' پر مسلط ہو چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ جہاں اس بات کی فکر ہدایتاں کو دن بہ دن کھائے جا رہی تھی وہاں حاکم زادی بھی بڑی پریشان تھی کہ جس وقت بھی ہدایتاں کا شوہر اور اس کا سوتیلا بیٹا عاقل خان بھٹائی ہاؤس پہنچے گا، ایک سویا ہوا طوفان پھر باز پرس ہو گی اور پتہ نہیں پھر بعد میں حالات کیا رخ اختیار کریں؟

اس کا سازشی ذہن اب اسی تانے بانے میں الجھا رہا کہ عاقل خان کے آنے سے پہلے ہی یہ خوابیدہ آتش فشاں پانی بن جائے۔ اس کے لئے اس کے عیار دماغ میں ایک انتہائی سفاک خیال آیا ...... اور تب اس نے اپنی اس خطرناک سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہدایتاں کو ہی استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور آج وہ ہدایتاں کو ایک بھیانک ترغیب دینے کے لئے ہدایتاں کے کمرے میں آئی۔ ہدایتاں جاگ رہی تھی، اس کی نیند تو کئی روز سے اڑی ہوئی تھی۔ اس فکر نے ہی اسے چند روز میں ہی بیمار بنا ڈالا تھا کہ اگر اس کا شوہر عاقل خان آ گیا اور اسے ساری صورت حال کا علم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ وہ لاکھ انکار کرتی مگر وہ جانتی تھی کہ اس پر سارا نزلہ گرے گا۔

اس کی اسی ذہنی پریشانی کو مکار حاکم زادی بھانپ چکی تھی لہٰذا اس نے ہدایتاں کے پاس آ کر کہا۔ ''ڑی ...... ہدایتاں ......! تجھے پتہ ہے اس بار سائیں وڈے نے عاقل خان کو سختی سے یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ فوراً بھٹائی ہاؤس پہنچے اور مجھے لگتا ہے کہ عاقل خان آج کل میں ہی آنے والا ہے۔''

اس کی بات سن کر ہدایتاں کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ انجانے خدشات کے زیر اثر خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اسے اپنے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد پر بھی غصہ آنے لگا تھا جو یہ سارا گل کھلانے کے بعد آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لامحالہ اب اپنی چھوٹی ساس حاکم زادی کو ہی اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی تھی۔ کیونکہ کسی حد تک وہ بھی اسی کشتی کی سوار تھی۔ ''امڑ ......! اب تو ہی بتا میں کیا کروں ...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر وڈے سائیں نے اپنے بیٹے کو ساری حقیقت بتا ڈالی تو جانے عاقل خان میرا کیا حشر کرے۔ وہ تو میری ایک بھی نہیں سنے گا۔ میں اس کی غصیلی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' اس کی بات سن کر مکار حاکم زادی نے سرگوشی میں کہا۔ ''دیکھو ہدایتاں ......! محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ...... اور مجھ سے زیادہ تو بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اگر تو میری ایک بات مانے تو یہ سارا قصہ ہی پاک ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر حاکم زادی بڑی گہری نظروں سے ہدایتاں کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اندھا کیا چاہے ...... دو آنکھیں ...... ہدایتاں اس کی بات سن کر جھٹ بولی۔

''کک ...... کون سی بات ہے ...... مجھے بتا ...... میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

”ہدایتاں……! یہی ایک حل ہے کہ……تو……تو …… عاقل خان کے آنے سے پہلے سائیں وڈے کوزہر دے دے۔“ یہ کہتے ہوئے حاکم زادی کا مکروہ چہرہ اور بھی سفاک ہو گیا تھا اور ہدایتاں کا ستا ہوا چہرہ یہ سن کر بری طرح لرزنے لگا اور اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے حاکم زادی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر خوف و دہشت سے اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

”یہی ایک طریقہ ہے…… ہدایتاں……“ مکار اور سفاک حاکم زادی نے پھر سنسنی خیز سرگوشی کرتے ہوئے اس سے کہا۔”اس بڑے طوفان سے بچنے کے لئے کہ……تو ……تو……سائیں وڈے کوزہر دے دے۔“

”کک……کیسے……“ ہدایتاں کے لبوں سے بہ مشکل نکلا۔

”زہر میں تجھے دوں گی……بس تجھے صرف اتنا کام کرنا ہو گا کہ……وڈے سائیں کے دودھ کے گلاس میں اسے گھول دینا۔“

”کسی کو……پپ……پتہ چل گیا تو……“

”دراں خاتون ……روزانہ رات کو دودھ کا ایک بھرا ہوا گلاس خود سائیں وڈے کے کمرے میں رکھنے جاتی ہے۔ بس اس سے پہلے تو بڑی ہوشیاری کے ساتھ زہر اس میں ملا دینا۔“ حاکم زادی نے کہا اور ہدایتاں اس کا چہرہ تکنے لگی۔“ یہ کام تجھے کل رات ہر حال میں کرنا ہے۔ زہر میں تجھے لا دوں گی۔“



موگو اپنا کام بڑی ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھا رہا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں کالج کی ایک کینٹین میں اس نے بہ طور پیش گار نوکری کر لی تھی۔ اس نے اپنے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں بڑھا لی تھیں تاکہ…… پازیب کو اس پر ذرا بھی شک نہ ہو۔ وہ کالج کی سینٹرل کینٹین تھی جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ برائے نام ان طالبات کے لئے تھا جو وہاں آ کر چائے وغیرہ پیتی تھیں۔ اکثر پازیب بھی وہاں چائے پینے آتی تھی مگر اس وقت وہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ہوتی تھی یا کبھی عاقل خان کے ساتھ……اور موگو کی سفاک آنکھیں ہر وقت اسے تاڑتی رہتی تھیں اور وہ اس تاک میں تھا کہ کبھی موقع ملے تو وہ اپنا کام کر کے نکل بھاگے۔ اس مقصد کے لئے

وہ ہر وقت ایک تیز دھار چھرا اپنی قمیض کے اندر رکھتا تھا اور بالآخر ایک دن اسے یہ موقع مل گیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس روز پازیب لیڈیز پورشن میں تنہا داخل ہوئی تھی۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور غالباً کوئی لیکچر فری تھا۔ وہ چائے کا آرڈر دے کر ایک کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔ اس پورشن میں موگو کی ہی چائے وغیرہ سرو کرنے کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت باقی پیش گار دوسرے پورشن میں مصروف تھے۔ پازیب کو تنہا دیکھ کر موگو کی سفاک آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ خاموشی سے چائے کا کپ تھامے پازیب کی میز کے قریب آیا۔ پازیب گم صم سی بیٹھی تھی، اس کے سان و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ موگو موت کا فرشتہ بنا اس کے قریب کھڑا ہے۔

موگو نے چائے پازیب کے سامنے رکھی اور واپس مڑ گیا۔ اس نے اپنے وجود کے ارتعاش پر قابو پایا اور باورچی خانے میں آ گیا مگر وہاں سے وہ پازیب پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پھر خاطر خواہ موقع ملتے ہی اس کا ہاتھ اپنی قمیض کے اندر رینگ گیا۔ اس وقت باورچی خانے میں سوائے چائے بنانے والے کے اور کوئی نہ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے جب پازیب چائے ختم کرنے کے بعد کھڑی ہو کر پرس سے پیسے نکالنے لگی تو اس وقت موگو چھرا لے کر پازیب کی طرف دوڑا۔ پازیب جب تک سنبھلتی وہ چھرا اس کے پیٹ میں گھونپ چکا تھا۔ پازیب کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی کربناک تھی۔

پازیب کی کریہہ انگیز چیخ پر سب سے پہلے باورچی خانے میں چائے بنانے والا مولا بخش متوجہ ہوا تھا۔ وہ ایک تنومند شخص تھا……وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس حصے میں داخل ہوا جدھر سفاک موگو پازیب کے پیٹ سے مہیب چھرا نکال کر دوبارہ وار کرنے والا تھا۔ وہ اپنے پہلے وار سے ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا…… کیونکہ کچھ عجلت اور کچھ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے چھرے کا پھل نصف ہی پازیب کے پیٹ میں اتر سکا تھا……لہٰذا سفاک موگو نے پازیب کی کرب ناک چیخ کی پرواہ کئے بغیر……خون آلود چھرے کو تولا اور ابھی چاہتا تھا کہ پوری قوت سے دستے تک ……وہ اسے پازیب کے پیٹ میں اتار دے، دفعتاً ہی تنومند باورچی مولا بخش نے

بڑی پھرتی کے ساتھ موگو کے عقب میں آ کر اس کی گردن کے گرد اپنے بازوؤں کا شکنجہ کستے ہوئے اسے ایک زوردار چکر دے کر پرے پٹخ دیا۔

ادھر زخمی پازیب اپنا پیٹ پکڑے فرش پر گرتی چلی گئی۔ اس کے حلق سے مسلسل اذیت ناک اور گھٹی گھٹی کراہیں برآمد ہو رہی تھیں۔ سفاک موگو سیمنٹ کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا...... اور چھرا ابھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن اسے باورچی مولا بخش کی ''طاقت'' کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اسی لئے اس نے مزاحمت نہ کی اور راہ فرار اختیار کرنے کا فوری ارادہ کیا اور پھر ...... دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ باورچی مولا بخش نے جیسے ہی مجرم کو فرار ہوتے دیکھا تو حلق کے بل اسے للکارتا ہوا پیچھے دوڑ پڑا۔ ادھر آن کی آن میں پازیب کے گرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان میں طلبہ اور طالبات سبھی تھے۔ پھر انہوں نے فوری طور پر پازیب کے پیٹ پر کپڑا باندھا تا کہ جریان خون قدرے کم ہو سکے۔ اس کے بعد اسے ہسپتال لے جانے کا بندوبست کیا گیا۔



''شعبۂ حادثات'' میں خاصا رش تھا۔ پازیب کو فوری طور پر ایمرجنسی منتقل کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ ان سب کے چہروں پر پریشانی اور فکرمندی کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ عاقل خان بھی وہاں موجود تھا۔ اس اندوہناک واقعے نے اسے سن کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی سوتیلی بہن سورٹھ بھی وہاں موجود تھی فوری طور پر خون کی ضرورت کے تحت پازیب کے خون کی بلڈ گروپنگ اور کسی ممکنہ ری ایکشن سے محفوظ رہنے کے لئے کراس میچنگ بھی کی گئی۔ تب تو جیسے وہاں موجود طلبہ و طالبات نے جن کے خون کا گروپ پازیب کے گروپ سے ملتا تھا، ان سب نے دھڑا دھڑ خون کی بوتلیں دینا شروع کر دیں۔ عاقل کو افسوس تھا کہ اس کا گروپ دوسرا تھا اور وہ پازیب کو خون نہیں دے سکتا تھا تاہم اسے ازحد خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اس وقت تنہا نہیں تھا...... ورنہ یہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتا۔ ساری یونیورسٹی کے دوست اس کے ساتھ تھے۔ پھر گھنٹے، ڈیڑھ کے بعد ایک سرجن نے باہر آ کر ان سب کو مژدۂ جانفزا سنایا کہ پازیب اب خطرے سے باہر ہے۔ مگر

اسے ہسپتال میں کچھ روز زیر علاج رہنا پڑے گا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ عاقل اس مشہور سرجن کو جانتا تھا...... جس کا اپنا شہر میں ایک بڑا پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ عاقل خان سرکاری ہسپتالوں کی حالت زار سے واقف تھا لہٰذا اس نے اسی وقت مذکورہ سرجن سے بات چیت کر کے پازیب کو فوری طور پر ان کے پرائیویٹ ہسپتال شفٹ کر دیا۔ بعد میں عاقل خان نے فرداً فرداً اپنے سب یونیورسٹی فیلوز کا شکریہ ادا کیا۔ اس دوران اس کی مڈبھیڑ انسپکٹر چوہدری خرم سے ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہی عاقل خان پھٹ پڑا۔

''انسپکٹر صاحب......! یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ آخر کب آپ اس نامعلوم قاتل کو گرفتار کرو گے...... جب......''

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس قاتل کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا ہے۔'' انسپکٹر نے جواباً کہا تو قریب کھڑے ایک دل جلے یونیورسٹی فیلو نے استہزائیہ لہجے میں انسپکٹر سے کہا۔

''انسپکٹر صاحب......! یہ بھی تو عاقل کو بتائیں کہ یہ کام ہماری یونیورسٹی کے ایک بہادر باورچی نے سرانجام دیا ہے۔'' اس کی بات پر انسپکٹر ذرا خفیف ہو کر رہ گیا تھا۔



وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوٹھ میں اب یہ افواہ بھی گردش کرنے لگی تھی کہ موجا خان کے قتل میں سرمد کے ساتھ قادر بخش کا بھی ہاتھ تھا نہ صرف یہ بلکہ قادر بخش، سرمد کا گہرا دوست بھی تھا اور اس کی بہن کونجاں سے شادی کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ موجا خان اور کونجاں کی شادی کا بھی شدید مخالف تھا۔ اس افواہ کو اڑانے اور ہوا دینے میں زمیندار حکم داد کے گماشتوں کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔ متعلقہ تھانے کا انسپکٹر مراد خان، زمیندار حکم داد کی شہ پر اب باقاعدہ قادر بخش کو بھی شامل تفتیش کرنا چاہتا تھا...... لیکن اس کے لئے ابھی کچھ ضابطے کی کارروائی ہونا ضروری تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قادر بخش کس کا بیٹا ہے۔ ادھر منصب خان جو قادر بخش کا سوتیلا بھائی تھا اور کافی عرصے سے اس پر ادھار کھائے بیٹھا تھا جب اس نے ان افواہوں کی خبر اپنی ماں حاکم زادی کو دی تو اس نے فوراً اپنے بیٹے سے کہا۔

"منصب پٹ......! اس سنپولیے قادر بخش کا سر کچلنے کا یہ بہترین موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا......اچھا یہ بتا کہ کیا تو زمیندار حکم داد سے ملاقات کر سکتا ہے؟"

"ہاں ...... امڑ......! کیوں نہیں ...... میرے اس کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔" منصب خان جھٹ بولا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے......تو اس سے فوراً جا کر مل ...... وہ بھی قادر بخش کے بڑے بھائی عاقل خان پر خار کھائے ہوئے ہے۔ وہ ضرور تجھے کچھ سمجھائے گا۔" اس کی ماں نے عیاری سے کہا اور منصب خان فوراً ماں کی بات پلے سے باندھ کر اسی دن زمیندار حکم داد سے ملا اور اپنی اس ملاقات کو خفیہ رکھتے ہوئے زمیندار حکم داد سے سازباز کرنے لگا۔ زمیندار حکم داد جو پہلے اس موقع کی تاک میں تھا کہ کسی طرح موجا خان کے قتل کے کیس میں قادر بخش کی گردن بھی پھنسائے۔ اس نے......اس معاملے میں منصب خان کی پوری پوری مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر یوں کچھ ہی روز بعد دونوں کی ملی بھگت سے سب سے پہلے موجا خان کے ایک فرضی چاچا گہرام خان کو منظر عام پر لا کر خود تھانے جا کر......ایف آئی آر میں قادر بخش کے خلاف رپورٹ درج کروا دیتا ہے۔

سازش کی تیلی سے سازش ہی آگ پکڑتی ہے۔ انسپکٹر مراد خان جو اب زمیندار حکم داد کا زرخرید بن چکا تھا، وہ ایک دن اکیلا سادہ وردی میں سردار شیر دل خان سے ملاقات کرنے "بھٹائی ہاؤس" پہنچا۔ قادر بخش اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ حویلی سے ملحقہ ایک اوطاق میں سردار شیر دل خان اور انسپکٹر مراد خان کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت دور کھیتوں میں دھوپ اتری ہوئی تھی اور گرم لو کے تھپیڑے چہرہ جھلسائے دے رہے تھے......نسبتاً اندر فضا ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ انسپکٹر مراد خان اپنی جیپ میں آیا تھا، جو اوطاق کے باہر کھڑی تھی۔

"ہاں بابا......! انسپکٹر صاحب کیسے آنا ہوا......؟" سردار نے گھمبیر لہجے میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا تو انسپکٹر مراد خان کے بشری تاثرات سے ظاہر ہونے لگا جیسے وہ جواباً کچھ کہتے ہوئے متردد ہو......تاہم لمحہ بھر خاموشی کے بعد ہولے سے کھنکارا پھر لہجے میں حد درجے احترام سموتے ہوئے بولا۔

"سردار سائیں......! آپ کو تو پتہ ہی ہوگا کہ کچھ روز پہلے آپ ہی کے گوٹھ کے ایک موجا خان نامی شخص کو کسی نے قتل کر ڈالا تھا، شکوک وشواہد کی بناء پر آپ کے ایک رہاک (کسان) جس کا نام سرمد ہے......کی گرفتاری کے لئے ہم اسے تلاش کر رہے ہیں جو کافی عرصے سے ایک "کارو" کی حیثیت سے روپوش ہے۔" انسپکٹر مراد خان نے یہاں تک کہا۔ سردار اس کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جانے کیوں انسپکٹر مراد خان کو اس کی اپنی جانب گھورتی ہوئی آنکھوں سے یوں لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ......"ہم یہ سب جانتے ہیں تم مطلب کی بات کرو۔" اور جو مطلب کی بات اس وقت انسپکٹر مراد خان اس سے کرنا چاہتا تھا، وہ کہنے کے لئے ابھی اسے ہمت مجتمع کرنی تھی۔

بہرطور......سردار کو استفہامیہ انداز کی خاموشی میں مبتلا پا کر انسپکٹر مراد خان نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی بات جاری رکھی جائے۔ وہ بولا۔

"سردار سائیں......! آپ کے لئے ہمارے دل میں بڑی عزت اور احترام ہے۔ آپ کو تو ہماری مجبوریوں کا اندازہ ہوگا ہی ......کسی تفتیش کے سلسلے میں یوں سمجھیں، ہمیں اپنے گھر کے لوگوں پر بھی شک کرنا پڑتا ہے......بس اسی سلسلے میں آپ کا تعاون درکار تھا۔"

"ہمارے خاندان کے کسی فرد پر تمہیں شبہ ہے؟"

انسپکٹر مراد خان کی بات پوری ہوتے ہی اور اس کا مطلب سمجھتے ہی دفعتاً سردار نے بڑے سپاٹ لہجے میں انسپکٹر کو گھورتے ہوئے کہا تو ایک لمحے کو انسپکٹر مراد خان بھی تھوڑا سا بوکھلا گیا مگر پھر فوراً ہی اپنی بدحواس کیفیت پر قابو پا کر بولا۔

"سردار سائیں......! اگرچہ ہمیں موجا خان کے قتل کے سلسلے میں سرمد پر پورا شک بلکہ یقین ہے اور ہم اسے گرفتار کرنے کے لئے اس کی تلاش میں دوڑ دھوپ بھی کر رہے ہیں۔ سرمد ایک قاتل کی حیثیت سے ہمیں مطلوب ہے......لیکن اس کے ساتھ ساتھ......کچھ لوگوں کو سرمد کے قریبی دوستوں پر بھی شک ہے کہ یہ کام سرمد نے اپنے کسی گہرے دوست کی ملی بھگت سے انجام دیا ہے اور یہ بات پورا گوٹھ جانتا ہے کہ سرمد کا صرف ایک ہی گہرا دوست ہے قادر بخش......" انسپکٹر نے اپنی بات مکمل کی۔

سردار کی طرف سے کسی ممکنہ ردعمل کے تحت اس کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سردار نے کوئی ردعمل ظاہر کئے بغیر انسپکٹر کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''قادر بخش ...... میرا بیٹا ہے ...... کیا تم اسی کی بات کررہے ہو؟''

''ج ج ...... جی ...... ہاں ......''

''میرے بیٹے قادر بخش پر شک کرنے کی کوئی خاص وجہ انسپکٹر ......؟''

''پورا گوٹھ جانتا ہے کہ ......''

''پورے گوٹھ کو گولی مارو ...... صرف اس شخص کا نام بتاؤ جس نے ہمارے پٹ پر قتل کا شبہ ظاہر کیا ہے۔'' سردار نے گونجدار لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''لیکن اتنا یاد رکھنا انسپکٹر ......! اگر ہمارے پٹ قادر بخش پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ سامنے نہ آئی تو اس شخص سے ہمیں ''اپنے طور'' پر نمٹنے کا پورا حق ہوگا۔'' سردار اتنا کہہ کر انسپکٹر مراد خان کے چہرے پر گھورتی نظروں سے تکنے لگا۔

سردار کا چہرہ اندرونی ابال اور طیش کے باعث سرخ ہونے لگا تھا۔ ادھر انسپکٹر مراد خان نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ ...... اپنی جان چھڑاتے ہوئے بالآخر سردار سے پوری بات کہہ ڈالنی چاہئے ...... لہٰذا اگلے ہی لمحے وہ بولا۔ ''سردار سائیں ......! برابر ہم ہر طرح سے حاضر ہیں۔ درحقیقت ہم پر بھی اوپر سے دباؤ ہے وہ دراصل ...... مقتول موجا خان کا ایک رشتے کا چاچا ہے۔ گہرام خان ...... اسے قادر بخش پر نہ صرف اس بات پر شک ہے کہ وہ اس کے بھتیجے موجا خان کا قاتل سرمد کا دوست ہے بلکہ قادر بخش سرمد کی بہن کونجاں سے شادی ......''

''کیا بکواس کرتا ہے ڑے تو ...... انسپکٹر ......!'' سردار شیر دل خان غصے سے دھاڑا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ پورا وجود باعث غیظ وغضب مرتعش ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سردار عالم طیش کے باعث یوں بگڑا تھا۔ وہ بھی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بات میں خاصا وزن رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ ہمت مجتمع کر کے بولا۔

''سردار سائیں ......! میں نے کہا نا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ...... جس نے بھی آپ کے پٹ قادر بخش پر شک کرنے کی جرأت کی ہے، اس پر ہم نے بھی لعن طعن کی تھی لیکن ...... قادر بخش پر شبہ کرنے کی اس کے پاس جو معقول وجہ تھی، وہ اس کے گواہ جنہوں نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ قادر بخش درحقیقت موجا خان اور کونجاں کی شادی پر خوش نہ تھا ...... اور اس نے آخر تک اس شادی میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تھی مگر خاطر خواہ کامیابی اسے حاصل نہیں ہوئی تھی ...... اور پھر عین شادی سے ایک دن قبل موجا خان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔''

انسپکٹر اتنی تفصیل بتا کر خاموش ہوگیا۔ ادھر سردار کی حالت دیدنی حد تک دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس کی غیظ آلود سانسیں پھنکاروں کی صورت میں اس کے نتھنوں سے یوں خارج ہو رہی تھیں جیسے انہیں چیر ڈالیں گی۔ انہوں نے بڑی مشکل اور کمال ضبط کا مظاہرہ کیا ہوا تھا۔

''شبہ کرنے والوں اور گواہان کے مزید نام بتاؤ ...... انسپکٹر ......'' سردار نے لفظ چبا چبا کر انسپکٹر مراد خان کو مخاطب کر کے کہا۔

''سردار سائیں ...... ایک تو گہرام خان ہی ہے ...... مقتول کا چاچا ...... باقی آپ کے سدھی ...... زمیندار حکم داد اور ......''

''ک کیا ...... زمیندار حکم داد نے بھی ہمارے پٹ پر شبہ کیا ہے۔'' سردار نے چونک کر پوچھا۔ اسے انسپکٹر کی بات پر جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

''اچھا ...... اچھا ...... چنگا ...... اور نام بتاؤ ......'' دوسرے لمحے سردار شیر دل خان پرسکون رہنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ اسے مخاطب کر کے بولا۔

''دوسرے گوٹھ کے چند لوگ ہیں جو سرمد کے پڑوسی ہیں جبکہ سرمد کا باپ مٹھن بھی اس بات کا اعتراف کر چکا ہے کہ قادر بخش کسی قیمت پر بھی کونجاں اور موجا خان کی شادی پر خوش نہ تھا۔''

''مگر انسپکٹر ...... ان باتوں سے کیا ہمارا پٹ مجرم ثابت ہوسکتا ہے؟'' بالآخر سردار نے متحمل رویہ اختیار کرتے ہوئے انسپکٹر مراد خان سے پوچھا۔

''بالکل نہیں ...... سردار سائیں ......!' وہ جھٹ بولا۔ ''درحقیقت یہ ...... یہ سب

ضابطے کی کارروائی ہے...... مخالف کو دکھانا ہے اور تھوڑا کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے بس ...... میں نے کہا نا سائیں بھوتار ...... یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ...... بس آپ خود ہی ان باتوں کی تصدیق قادر بخش سے کرلیں تو......''

''نہیں......! وہ خود تھانے آئے گا ...... تم وہیں اس سے پوچھ لینا جو پوچھنا چاہو۔'' سردار نے نہایت بردبارانہ انداز میں کہا اور انسپکٹر مراد خان سردار شیر دل خان کی اس صاف گوئی اور وضعداری پر ششدر رہ گیا۔ لہٰذا دوسرے ہی لمحے باچھیں پھیلا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''سائیں بھوتار...... وڈی مہربانی ...... یقین کرو سائیں ...... آپ نے مجھ مجبور انسان کی عزت رکھ لی۔ آپ نے قانون سے تعاون کر کے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ آپ کو ہر حال میں قانون کی پاسداری عزیز ہے۔'' انسپکٹر مراد خان اتنا کہہ کر باادب طریقے سے رخصت ہوگیا۔

اسی رات سردار شیر دل خان نے اپنے بیٹے قادر بخش کو اپنے کمرے میں بلایا۔

''جی بابا سائیں......'' باپ کے سامنے حاضر ہوتے ہی قادر بخش باادب ہو کر بولا۔

''سرمد تمہارا دوست تھا؟'' سردار اس کے چہرے پر اپنی برماتی ہوئی نظریں مرکوز کرتے ہوئے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''ہماری زمینوں پر کام کرنے والا ہر کسان میرا دوست ہے بابا سائیں......''

قادر بخش نے ہولے سے مگر پراعتماد لہجے میں کہا۔ تاہم اس نے پانی کے سر سے اونچا ہونے کا اندازہ اپنے باپ کے مرتعش چہرے سے کسی قدر لگا لیا تھا اس لئے وہ محتاط رویہ اختیار کئے ہوئے تھا۔

''ہم......'' ایک گھمبیر ہنکاری سردار کے حلق سے خارج ہوئی۔ ''سرمد کی بہن کونجاں سے بھی تمہاری دوستی تھی بلکہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سردار نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی تیز نگاہیں بیٹے کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں جیسے وہ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی بیٹے کے اندر کا اصل جواب پڑھ لینا چاہتا ہو۔

''میں سمجھا نہیں بابا سائیں؟'' قادر بخش نے تجاہل عارفانہ کی روش اختیار کرنی

چاہی۔ اسے اپنے پورے وجود میں سرسراہٹ سی اترتی محسوس ہو رہی تھی اور پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرات کی ہلکی چبھن حالانکہ کمرے میں اے سی چل رہا تھا۔

''انجان بن کر پہیلیوں والے جواب مت دو مجھے قادر بخش......! میں صرف دو ٹوک جواب چاہتا ہوں۔ اب محتاط رہنا...... ہاں ...... یا ناں......'' سردار نے لمحہ بھر توقف کیا پھر پوچھا۔ ''کیا سرمد کی بہن کونجاں سے تم ملتے رہتے ہو۔''

''ہاں...... بب...... بابا سائیں......''

''اور...... تم...... موجا خان اور کونجاں کی شادی کے خلاف تھے جسے رکوانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے تم نے بعض عملی طور پر بھی قدم اٹھائے۔''

قادر بخش کو اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے سنا تھا کہ محبت انسان کو بہادر اور نڈر بناتی ہے...... مگر بہادری کی بجائے وہ ایک کڑے امتحان کی زد میں آ جائے گا، یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ باپ کے دوٹوک اور بھانپتے ہوئے لب و لہجے نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کے اور کونجاں کے بیچ تعلق کی کہانی مشک بن کر باپ تک پہنچ چکی ہے، جواب بھی دوٹوک دینا تھا اور اس دوٹوک جواب سے ہی اس کے اور کونجاں کے بیچ برسوں کی تعلق داری لمحوں میں آشکارا ہو جاتی۔

''تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں؟'' دفعتاً باپ کی آواز قادر بخش کو اپنی سماعتیں چیرتی محسوس ہوئیں۔

''یہ سچ ہے...... بابا سائیں...... لیکن......''

''بس...... دوٹوک لفظوں میں جو حقیقت ہوتی ہے وہ لیکن ویکن، اگر......مگر ...... جیسی لمبی چوڑی فضول بحث میں نہیں ہوتی۔'' سردار نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ سردار کا چہرہ شدت جوش اور غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر ناقابل بیاں ژولیدگی اور طیش جیسی ملی جلی کیفیات سے گزر رہے تھے۔ جب وہ دوبارہ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے بولے تو واضح طور پر ان کی آواز جوش غضب سے کپکپا رہی تھی۔

''سنا تھا...... جوان کڑیل پٹ (بیٹے) باپ کا بازو ہوتے ہیں ...... پر...... تم دونوں نے تو میرے اپنے ہی بازو کاٹ دیئے ہیں۔ ایک وہ عاقل ہے کہ جس کی وجہ

سے بھٹائی ہاؤس میں طوفان آتے آتے رہ گیا مگر اب بھی خاندان کی عزت اسی کی وجہ سے داؤ پر لگی ہے اور وہ شہر کی بھول بھلیوں میں گم ہے دوسرے تم ہو کہ......'' سردار نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پریشان کن خاموشی اختیار کر لی۔

قادر بخش باپ کو خفیف اور سنجیدہ خاطر دیکھ کر چند قدم آگے بڑھا۔ سردار اب چوڑے پایوں والی اونچی آرام کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔

''بابا سائیں......!'' قادر بخش ان کے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ باپ کے کاندھے پر دھرتے ہوئے رسان سے بولا۔ ''مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں بابا سائیں......''

''تمہاری غلطی کو گوٹھ والے کیا رنگ دیں گے تم نہیں جانتے اور پولیس مجھ سے تمہارے سلسلے میں ایسی گفتگو کر کے گئی ہے کہ ہماری عزت نفس مجروح ہوئی۔'' سردار نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ قادر بخش کو وزیر علی کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ آج متعلقہ تھانے کا انسپکٹر مراد خان اسی سلسلے میں یہاں آ چکا تھا۔

''بابا سائیں......! لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے ہماری عزت پر حرف آتا ہو...... رہی بات گوٹھ والوں کی...... یہ ان لوگوں کی فطرت ہے...... اگر آپ ایک نرم مزاج اور ہمدرد انسان کی بجائے ایک سخت گیر وڈیرے ہوتے تو یہی لوگ ہمارے آگے ہاتھ جوڑے خوشامدی ٹٹو بنے واہ...... واہ کر رہے ہوتے۔''

''مگر...... پولیس کو تم کس طرح مطمئن کرو گے؟'' سردار نے پوچھا۔

''آپ گڑتی (فکر) نہ کریں بابا سائیں...... میں خود تھانے جا کر انسپکٹر مراد خان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

''یہی بہتر اور مناسب رہے گا۔'' سردار نے گھمبیر لہجے میں کہا اور اپنی آنکھیں موند کر پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا دیا۔



صبح لگ بھگ دس بجے قادر بخش اپنی بغیر ہڈ والی جیپ پر متعلقہ تھانے پہنچا۔ اس کے ہمراہ وزیر علی بھی تھا۔ تھانے کے احاطے کی پیلی اور سالخوردہ سی دیوار پر نصب

ٹوٹے گیٹ سے وہ سیدھا جیپ اندر لے گیا اور شکستہ سی عمارت کے برآمدے کے قریب ہی جیپ ایک جھٹکے سے روک دی۔ برآمدے میں تقریباً چھ سات محرابی سیمنٹ کی چوکھٹیں بنی ہوئی تھیں، ان پر چقیں تھیں جو اس وقت لپیٹ کر گولائی میں اوپر کی سمت بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ وردی پوش سپاہی بھی نظر آئے۔ قادر بخش اور وزیر علی نیچے اتر آئے۔ پھر ایک پولیس والے کی رہنمائی میں وہ انسپکٹر مراد خان کے کمرے میں آئے۔ اندر پہنچ کر وہ بری طرح ٹھٹکے تھے۔ انسپکٹر مراد خان کے علاوہ چار افراد اور بھی موجود تھے۔ وہ بھی قادر بخش کو دیکھ کر ایک لمحے کو چونکے تھے۔ ان میں ایک زمیندار حکم داد، اس کے دونوں بیٹے سائیں رکھیو اور مولا داد کے علاوہ چوتھا شخص گہرام خان تھا۔ ان چاروں پر نظر پڑتے ہی قادر بخش کی آنکھوں میں ناگواری سی اتر آئی مگر ان چاروں میں سے کسی نے بھی قادر بخش کو پہچاننے کے باوجود اس سے کوئی لفظ تک نہ کہا البتہ انسپکٹر مراد خان نے فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔

''آؤ...... سائیں...... آؤ...... بھلی کار...... (خوش آمدید) میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔'' قادر بخش نے سرد مہری سے انسپکٹر کے ساتھ مصافحہ کیا تو...... تب کہیں جا کر زمیندار حکم داد نے اپنی کرسی پر بیٹھے قادر بخش کو مخاطب کیا۔

''کیسے ہو بابا...... قادر بخش......! آج تم نے بھی یہاں کی سیر کر ہی ڈالی۔''

اس کے لہجے میں چھپا استہزاء قادر بخش کو صاف محسوس ہوا تھا۔ پھر وہ قادر بخش کا جواب سنے بغیر ہی اپنا روئے سخن انسپکٹر مراد خان کی طرف موڑ کر ہنسی اڑانے والے لہجے میں بولا۔ ''تم پولیس والے بھی سائیں...... بڑے حضرت ہوتے ہو...... اپنی پر آتے ہو تو...... بڑے بڑے اونٹ پہاڑ کے نیچے آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔'' قادر بخش اس کا طنز سمجھ چکا تھا اور پھر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ اس کے بڑے بھائی عاقل خان کا سسر تھا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہ ظاہر انسپکٹر کو مخاطب کر کے جواباً بولا۔ ''انسپکٹر صاحب......! آپ لوگ واقعی حضرت ہوتے ہو۔ جنگل کے گیدڑوں کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتے ہیں اور گوٹھ کی کالی بھیڑیں، مکھیوں کی طرح مسکین بنی آپ کے اردگرد بھنبھناتی ہیں۔'' قادر بخش کی اس جوابی

کارروائی پر نہ صرف زمیندار حکم داد تلملا کر رہ گیا بلکہ اس کے دونوں بیٹے اور گہرام خان کے چہروں پر بھی خفت آمیز سرخی پھیل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ ذومعنی لفظوں کی یہ سرد جنگ طول پکڑتی انسپکٹر نے بلند آواز سے اردلی کو مخاطب کر کے دو کرسیاں لانے کو کہا تو زمیندار حکم داد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ تینوں بھی۔ ''اچھا انسپکٹر صاحب......! اب ہمیں اجازت دو مگر یاد رہے مجرم بچ کر نہ جانے پائیں۔ دوسرے مجرم کی نشاندہی ہم نے ہی نہیں بلکہ پورے گوٹھ کے لوگوں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے جانے کے بعد آپ بہتر طریقے سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔'' آخری جملہ حکم داد نے قادر بخش کی طرف گھورتے ہوئے ادا کیا تھا اور پھر وہ سب قادر بخش کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

''بیٹھو......بیٹھو......سائیں......'' انسپکٹر دوستانہ لہجے میں قادر بخش سے بولا اور خود بھی اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''آپ......بابا سائیں سے ملے تھے کل......'' کرسی پر بیٹھتے ہی قادر بخش نے سوال داغا۔ ''میں سادہ وردی میں یونہی سردار سائیں کے ہاں حاضری بھرنے گیا تھا اور لگے ہاتھوں ایک خبر سے بھی مطلع کرنا چاہتا تھا۔'' انسپکٹر نے چالاکی سے کہا۔ وہ بات کو گھمانے کے چکر میں تھا۔

''کیا پولیس......موجا خان کے قتل کے کیس میں مجھے بھی ملوث کرنا چاہ رہی ہے؟'' قادر بخش نے اپنی نظریں انسپکٹر مراد خان کے چہرے پر مرکوز رکھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کیا ہے سائیں کہ جب لوگوں کے شکوک وشبہات دباؤ بن کر ہمیں پریشان کرنے لگتے ہیں تو محض ان کا منہ بند کرنے کے لئے ہمیں مجبوراً تھوڑی سی ضابطے کی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ اسے آپ دکھاوا ہی سمجھ لیں۔''

''بھلے......ایک شریف انسان کی عزت......آپ کی دکھاوے کی کارروائی کے پیچھے رل جائے۔'' قادر بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ناں سائیں......آپ اسے میری مجبوری......''

''رہنے دیں انسپکٹر صاحب......اپنی مجبوریاں......بوجھ ہمیشہ سیدھی لکڑی پر ہی ڈالا جاتا ہے۔ میں اپنے بابا سائیں کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ سب لوگ بھی

کہ وہ روایتی وڈیروں کی طرح نہ سخت مزاج ہیں اور نہ کسی کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی کرتے ہیں۔ ان کی اسی طبیعت سے آپ کو اتنی ہمت ہوئی کہ آپ بڑے دھڑلے کے ساتھ انہیں تفتیشی عمل میں کھینچنے کی جرأت کر بیٹھے۔''

''ہالا بابا ہالا......آپ تو ناراض ہو گئے سائیں......''

''آپ نے جو مجھ سے پوچھنا ہے پوچھیں......'' قادر بخش نے آخر میں بے اعتنائی سے کہا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ موجا خان کے قاتل سرمد کو ہم تلاش کر رہے ہیں۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ کیا سرمد آپ کا دوست رہ چکا تھا؟''

''ہاں......!'' قادر بخش نے متانت سے مختصراً کہا پھر اگلے ہی لمحے مزید بولا۔ ''ویسے انسپکٹر......! آپ کو سرمد پر موجا خان کے قتل کا شبہ ہے یا یقین......؟''

''سو فیصد یقین......سائیں......! سارے شواہد یہی بتاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ موجا خان نے اسے اپنی بہن کے ساتھ ''کارو'' قرار دیا تھا۔'' انسپکٹر نے یاد دلایا۔

''خیر......کسی کو مجرم ثابت کرنا آپ کا کام ہے۔ مجھ سے اور کچھ پوچھنا ہے؟'' قادر بخش نے کہا اور انسپکٹر مراد خان اس کے لہجے میں چھپی طنز کی کاٹ کو سمجھے بغیر بولا۔

''ہاں......ایک آخری سوال......کیا آپ موجا خان اور سرمد کی بہن کونجاں کی شادی کے خلاف تھے؟''

''موجا خان......ایک غلط کردار کا آدمی تھا۔'' قادر بخش نے کہا اور پھر معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مزید بولا۔ ''انسپکٹر صاحب......! کمال ہے آپ نے سرمد کے بارے میں تو اِدھر اُدھر سے شواہد اکٹھے کر لئے جس کی بناء پر آپ نے سرمد کو موجا خان کا قاتل قرار دے ڈالا اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ شواہد لوگوں کی افواہوں کا نتیجہ ہیں......لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ آپ کو موجا خان کی اصلیت کے بارے میں ذرا بھی علم نہیں۔''

''مثلاً......؟''

"گوٹھ کے آدھے سے زیادہ لوگوں کی موجا خان سے متعلق یہی رائے ہے کہ وہ اچھے کردار کا انسان نہیں تھا۔ نیز زبردستی سرمد کی معصوم اور بھولی بھالی بہن کونجاں سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر کونجاں کے بھائی سرمد ہی نے نہیں، اس کے ماں باپ نے بھی موجا خان کو...... کونجاں کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں موجا خان نے بڑی مکروہ چال چلتے ہوئے سرمد کو اپنی بہن بھاگی کے ساتھ بے گناہ "کارو" کر کے دانستہ اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ اس کی راہ کا واحد کانٹا سرمد ہی تھا۔ موجا خان نے بعد میں "تاوان" کے طور پر سرمد کی جان بخشی کے لئے اس کے بوڑھے ماں باپ سے کونجاں کا ہاتھ مانگ لیا، جو بے چارے پہلے ہی سرمد کی جان کے خوف میں مبتلا تھے۔" قادر بخش نے اپنی بات ختم کی تو اس بار انسپکٹر بھی اسے قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "سائیں معاف کرنا...... یوں تو گوٹھ میں ایک یہ خبر بھی گردش کر رہی ہے کہ درحقیقت کونجاں سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے اور موجا خان کو آپ اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے۔"

قادر بخش کو انسپکٹر کے لہجے برتاؤ تو آیا مگر وہ اپنا غصہ کھا کر...... بات کا مزید بتنگڑ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ کبھی یہاں آنا پسند نہ کرتا مگر...... وہ اپنے شریف اور وضعدار باپ کی وجہ سے یہاں انسپکٹر کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے آیا تھا تا کہ اس کے باپ کے دل میں بیٹے کی طرف سے کوئی ایسی خلش اسے بے چین نہ کرتی رہے کہ کیا واقعی ...... اس کا بیٹا قادر بخش مجرم تھا۔ وسند خان کا پوتا اور سردار شیر دل خان کے بیٹے نے ایک معمولی "رہاک" (کسان) کی چھوکری کی خاطر...... دھبہ لگا دیا۔ قادر بخش جانتا تھا کہ اس معاملے میں اس کا باپ کتنا حساس تھا۔ لہٰذا وہ عیار انسپکٹر مردا خان کی بات کا جواب دینے کے لئے لمحہ بھر خاموشی کے بعد اس پر اپنی چبھتی ہوئی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے انسپکٹر صاحب یوں قیاس آرائیوں کی بجائے آپ عملی طور پر حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ افواہوں کو آدمی کسی بھی وقت اپنے حق میں یا مخالفت میں کرسکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ایک مثال پیش کی تھی آپ کے سامنے......" قادر بخش نے آخر میں یہ توجیہہ دینی ضروری سمجھی کہ

کہیں یہ انسپکٹر...... اس کی بات سے یہ نہ سمجھے کہ وہ پہلو تہی کرنا چاہ رہا ہے۔ تاہم قادر بخش کے اس وار نے انسپکٹر کو چند ثانیوں کے لئے گومگو میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔ آپ کی اب کافی تسلی ہوگئی ہوگی۔"

اتنا کہہ کر قادر بخش رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسکے ساتھ وزیر علی بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

انسپکٹر مراد خان کی پیشانی پر کچھ ایسی سلوٹیں نمودار ہوگئی تھیں جیسے وہ قادر بخش کی طرف سے مطمئن ہونے کی بجائے مزید الجھن کا شکار ہو گیا ہو۔ تاہم وہ ناچار ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر قادر بخش کی طرف مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے گہرے اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ "سائیں......! بات میرے مطمئن ہونے کی نہیں ...... بس! وہ لوگ مطمئن ہو جائیں ...... جنھوں نے سرمد کے خلاف ایف آئی آر کٹوائی ہے اور آپ کا شبہ کے طور پر اس میں نام درج کروایا ہے۔" انسپکٹر مراد خان کی بات پر قادر بخش ذرا چونکا۔

"کیا...... زمیندار حکم داد نے......"

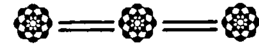
"نہیں ...... اس نے صرف سرمد کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی جبکہ شبے کے طور پر گہرام خان نے آپ کا نام لکھوایا تھا جو مقتول موجا خان کا چاچا ہے۔"

انسپکٹر نے قادر بخش کی بات اچکتے ہوئے فوراً کہا تو قادر بخش ایک لمحے کو چونکا۔ اس کے بعد پرسوچ انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے اور اسی کے خلاف گہری چال چل رہے تھے۔ زمیندار حکم داد، سائیں رکھیو، موالا داد اور گہرام ...... یہ چاروں نہ صرف بیرونی طور پر بھی اپنی بیٹی اور بہن ہدایتاں کے ذریعے بھٹائی ہاؤس کی زندگی میں دھیرے دھیرے اپنا زہر انڈیلنا چاہ رہے تھے، جس کی ایک مثال قادر بخش نہیں بھولا تھا۔ جب اس کی بھابھی ہدایتاں نے اس کی سوتیلی ماں حاکم زادی سے ملی بھگت کر کے اس کے بڑے بھائی اور اپنے شوہر عاقل خان کی کسی کلاس فیلو لڑکی کے خلاف سازش کی تھی جو بعد میں آشکارا ہوگئی تھی۔ مگر اس واقعے کے بعد سے ایک باپ سردار شیر دل خان ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اوپر سے عاقل کی بے اعتنائی اور پھر اب خود اس کی

موجا خان قتل کیس میں نامزدگی ...... زمیندار حکم داد سمیت اس کے دونوں بیٹوں سائیں رکھیو، مولا داد اور حواری گہرام خان کے نام زہریلے سانپوں کی طرح قادر بخش کے ذہن میں چسپاں ہو گئے تھے۔ قادر بخش محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے اب اندرونی و بیرونی معاملات زندگی میں خود کو اور پورے خاندان کو ان چاروں خطرناک سانپوں کے زہر سے محفوظ رکھنا تھا۔ اکیلا قادر بخش جیسے خواب سے بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تنہا ان حالات کا مقابلہ کرے گا۔ تاہم اسے اپنے بھائی عاقل خان کا بھی انتظار تھا۔ وہ اب اپنے بڑے بھائی کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔



رات کے دس بج چکے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ سردار شیر دل خان اپنی بھاری بھر کم مسہری پر نیم دراز کسی سوچ میں غلطاں تھا۔ پے در پے حالات دگرگوں نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بڑے بیٹے کی مسلسل بے اعتنائی اور چھوٹے بیٹے قادر بخش کی پریشانی نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذرا دیر پہلے ان کی بڑی بیوی دراں خاتون دودھ کا گلاس رکھ کر خاموشی سے لوٹ گئی تھی۔ دوسرے کمرے میں حاکم زادی اور ہدایتاں پسینے میں نہائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سردار کے دودھ کے گلاس میں زہر ملا دیا تھا۔ ان کے چہرے مکروہ حد تک ڈراؤنے ہو رہے تھے۔ ادھر اپنے کمرے میں سردار شیر دل خان نے ذرا دیر بعد وہ دودھ والا گلاس اپنے لبوں سے لگا لیا تھا جس میں حاکم زادی اور ہدایتاں زہر کی پڑیا گھول چکی تھیں۔



سردار شیر دل خان زہر ملا دودھ کا گلاس ختم کر کے اپنی مسہری پر سو گیا اور پھر کبھی نہیں جاگ سکا۔ اس دن حاکم زادی اور ہدایتاں جنہیں ساری رات اپنی گناہ آلود سازش کی وجہ سے نیند نہیں آ سکی تھی، وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں سوئی ہوئی تھیں...... ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

حاکم زادی ایک گھاگ اور خرانٹ عورت تھی، اس نے احساس گناہ کے باعث پیدا ہونے والے ارتعاش پر قابو پا لیا تھا مگر ہدایتاں کی حالت دیدنی تھی...... اسے اپنا پورا وجود لرزتا، کانپتا سا محسوس ہو رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی اس کا دل یکبارگی احساس جرم کے زیر اثر بڑی زور سے دھڑکا تھا...... وہ جانتی تھی کہ یہ صبح کسی کی زندگی میں ایک ایسی بھاری اور کبھی ختم نہ ہونے والی رات تھی جس کی واقعی کوئی سحر نہ تھی۔ کہتے ہیں عموماً انسانوں کو جرم کرنے کے بعد ایک نفسیاتی خوف آ لیتا ہے...... اسے اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ کوئی بڑا اور جان لیوا مجرمانہ قدم اٹھا لیتا ہے۔ ہدایتاں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا...... اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیوں کی جیسے رگیں پھول گئی تھیں اور اس کا پورا وجود سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یوں تو اس نے حاکم زادی کے ترغیب دینے پر اپنے سسر سردار شیر دل خان کے دودھ کے گلاس میں زہر ملا دیا تھا لیکن اب جانے کیوں اسے بے نام وسوسوں اور تشویشناک سوچوں نے بے چین کر دیا تھا۔

”اگر یہ بات آشکار ہو گئی تو کیا ہو گا......؟“ اس نے سہم کر سوچا...... کاش وہ اس سلسلے میں اپنے بھائیوں سے مشورہ کر لیتی اور مزید اس مسئلے پر سوچ بچار کر لیتی پھر وہ اپنے بدحواس اور سراسیمہ دل کو تاویل پیش کرتے ہوئے تسلی دیتی۔ ”جو کچھ ہوا، صحیح ہوا...... سوچنے سمجھنے کا بھلا کسے وقت تھا، اگر ایسے میں عاقل خان شہر سے آ جاتا اور

سردار اسے ان کے کرتوتوں کے بارے میں اس کے شوہر کو ساری حقیقت بتا ڈالتا تو پھر کیا ہوتا...... وہ بھی تو ایک عذاب ناک گھڑی ہوتی۔"

"مگر ہدایتاں......! صرف سردار کی زندگی کا چراغ گل کرنے سے یہ معاملہ کس طرح ختم ہوسکتا ہے...... کیا دوسرے افراد نہیں ہیں جو حویلی میں...... عاقل خان کو ساری حقیقت بتا سکتے ہیں؟" معاً ہدایتاں کے دماغ نے دل کی طفلانہ تاویلوں کو رد کرتے ہوئے اسے کچوکا لگایا تو ہدایتاں دہل کر رہ گئی تب اس نے دل کا سہارا لیا۔

"سردار کے بتانے اور کسی اور کے حقیقت حال بتانے میں زمین سمان کا فرق ہے اور تو اس سازش میں اکیلی تھوڑی ہے، حاکم زادی بھی تو تیرے ساتھ ہے...... بس تجھے مضبوط بنے رہنے کی ضرورت ہے ورنہ تیری طرف پرتشویش نگاہیں جم کر رہ جائیں گی۔" دل کی اس آخری تاویل نے ہدایتاں کو قدرے مطمئن سا کر دیا۔

صبح ہو چکی تھی مگر وہ ہنوز دم سادھے مسہری پر اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو دائیں بائیں پہلو میں سلائے لیٹی ہوئی تھی کہ دفعتاً اس کی سماعتوں سے ایک لرزہ خیز اور گھٹی گھٹی چیخ ٹکرائی اور پھر تو جیسے پورے "بھٹائی ہاؤس" میں بھونچال آ گیا، درو دیوار چیخ و پکار، ماتم اور آہ زاری سے لرز اٹھے۔

ہر طرف "قہر تھی ویو"۔ (غضب ہوگیا) "قہر تھی ویو" کی فغاں گونجنے لگی تھی۔

ہدایتاں شور سن کر جلدی سے مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی...... اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا تھا پھر ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا...... ہدایتاں نے دروازہ کھول دیا...... سامنے حاکم زادی اور چند دوسرے لوگ آنسوؤں بھرا چہرہ لئے کھڑے تھے، حاکم زادی ایک دھاڑ مار کر ہدایتاں سے لپٹ گئی...... ہدایتاں نے اپنے چہرے کو پریشان کن حد تک سوالیہ بنا ڈالا تھا۔

"ہائے ہدایتاں! ڑی ہم یتیم ہو گئے، آپڑاں وڈا سائیں گزر گیا۔"

پھر حاکم زادی کے اس رقت آمیز نعرے میں ہدایتاں بھی اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرتے ہوئے ایک ہذیانی چیخ "نہیں" مارتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی اور لگی پھوٹ پھوٹ کر مگرمچھ کے آنسو بہانے۔



سورج دور مغرب میں نارنجی افق تلے غروب ہو رہا تھا، سائیں رکھیو اور مولا داد اپنی اوطاق میں بیٹھے تھے...... ان دونوں کے چہروں سے پریشانی اور اضطراب مترشح تھا...... موگو کی کامیابی اور اس کی گرفتاری، اس کے علاوہ پازیب کا موت کے منہ سے واپس لوٹنے کی خبر نے دونوں کو ازحد فکرمند اور جھنجھلا کر رکھ دیا تھا، ان تمام باتوں کی خبر ان کے آدمی نے دی تھی جسے ان دونوں نے موگو کی خبر گیری کے لئے شہر بھیجا تھا، خالق نام تھا اس کا۔

"اب کیا ہوگا...... ادا رکھیو......! یہ تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔" مولا داد نے اپنے بھائی سے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش کی نمایاں جھلک تھی۔

"فوری طور پر کچھ کرنا پڑے گا کیونکہ موگو وہاں کی پولیس کے قبضے میں ہے اور دوسرے عاقل خان اس کے منہ سے سچ اگلوانے کی خاطر اس کی کھال کھنچوا دے گا۔" سائیں رکھیو نے جواباً پرسوچ لہجے میں کہا۔

"تو کیوں نا اس سے پہلے حوالات میں ہی موگو کو مروا دیا جائے۔" مولا داد کے لہجے میں سفاکی تھی۔

"ہوں...... یہی کرنا پڑے گا۔" سائیں داد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصراً کہا اور پھر دونوں سر جوڑے ہوئے مسئلے کے حل کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرنے لگے۔



پازیب تیزی کے ساتھ صحت یاب ہو رہی تھی...... عاقل خان کی چھوٹی سوتیلی بہن یعنی حاکم زادی کی چھوٹی بیٹی سورٹھ بھی وہیں تھی جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ وہ بھی یونیورسٹی میں اپنے بڑے بھائی عاقل خان کے ساتھ زیر تعلیم تھی اور پازیب کی کلاس فیلو تھی۔ گھنگھرو بھی تقریباً روز اور کافی دیر تک کین جھرولا میں آتی اور قیام کرتی تھی۔

پازیب پر دوسری بار قاتلانہ حملے نے جس میں وہ مرتے مرتے بچی تھی، گھنگھرو کا سکون غارت کر دیا تھا۔

اب وہ سنجیدہ ہو کر اس بات پر غور کرنے لگی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن کی جان

کے جو لوگ دشمن ہیں، وہ ہوں نہ ہوں عاقل خان کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے ہیں جنہیں شاید اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ عاقل خان، پازیب سے دوسری شادی کرنے کا خواہاں ہے اور یہ بات گھنگھرو نے انسپکٹر خرم کے منہ سے سنی تھی۔ ایک تفصیلی ملاقات میں اس نے ہی گھنگھرو کے سامنے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا جس پر گھنگھرو کو اب متفق ہونا پڑ رہا تھا۔ اس خدشے پر پختہ یقین ہونے کے بعد سے اب وہ اس کے بھی حق میں نہ تھی کہ پازیب مزید کین جھرولا میں رہے۔ تمام حالات و واقعات کے تناظر میں پازیب کو یونیورسٹی سے زیادہ یہاں بھی جان کا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اگرچہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ پازیب پر قاتلانہ حملہ کرنے والے ملزم کو پولیس نے گرفتار بھی کر لیا ہے مگر تب بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

گھنگھرو ان ساری نازک اور تشویشناک صورت حال سے بہت پریشان ہو چکی تھی ...... پازیب کی جان کے خوف نے اسے بری طرح ذہنی اور جسمانی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

دونوں بہنیں اس وقت بھی کین جھرولا کے ایک آراستہ کمرے میں موجود تھیں، پازیب کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد عاقل خان اسے بصد اصرار یہاں لے آیا تھا اور آج پازیب کو مکمل طور پر بیڈ ریسٹ لئے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے جبکہ سرجن صاحب نے دو مہینوں تک بیڈ ریسٹ لینے کی سختی سے تاکید کی تھی۔

یونیورسٹی فیلوز اگرچہ پازیب کی مزاج پرسی کے لئے آتے رہتے تھے، پازیب نے جب سے کین جھرولا میں رہائش اختیار کی تھی، تب سے عاقل اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹ کر یونیورسٹی کیمپس میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگا تھا البتہ اس نے اپنے کچھ آدمی بطور مسلح گارڈ کوٹھی میں متعین کر دیئے تھے۔ وہ ولا آ جاتا اور رات گئے وہاں سے واپس کیمپس سونے کے لئے چلا جاتا تھا۔ ولا میں رات کو سورٹھ اور کبھی کبھار گھنگھرو بھی رہتی تھی۔

''عاقل صاحب ......! آپ کے مجھ پر ہی نہیں میری بہن پازیب پر بھی بہت احسانات ہیں جو شاید میں ساری زندگی نہ اتار پاؤں۔'' گھنگھرو نے ایک دن عاقل سے اظہار تشکر کے انداز میں کہا۔

مگر درحقیقت وہ اس سے ایک اہم بات کرنے والی تھی۔ وہ شام کا وقت تھا سورٹھ موجود نہیں تھی، کوٹھی کے وسیع لان میں تین کرسیاں بچھائے وہ تینوں براجمان تھے ...... پازیب اب چلنے پھرنے کے قابل ہو چکی تھی لیکن اب بھی اسے زیادہ چلنے کی سختی سے ممانعت تھی ...... باہر بڑی دلفریب ہوا چل رہی تھی اور فضا میں خوش رنگ گل بوٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی ...... سامنے ایک چھوٹی سی میز پر چائے کے برتن موجود تھے۔

گھنگھرو کی بات سن کر عاقل خان ایک نظر پازیب اور پھر گھنگھرو کے چہرے پر جماتے ہوئے متانت سے بولا۔ ''گھنگھرو صاحبہ ......! آپ غیریت والی باتیں نہ کیا کریں ...... اس طرح بلاوجہ ایک اپنائیت بھرا ماحول مکدر اور ذہنی کوفت کا سا شکار ہونے لگتا ہے۔''

''لیکن ...... عاقل صاحب ......! اس میں کوئی شک بھی تو نہیں کہ......!'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''پلیز گھنگھرو! لیو اٹ ......'' عاقل نے خفیف سے اشارے سے کہا۔

چند ثانیے سکوت چھایا رہا ...... پازیب اب تک خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ آپریشن کے بعد سے وہ خاصی کمزور ہو گئی تھی، اس کے چہرے پر ایک مغموم سی سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔

گھنگھرو، عاقل کی بات پر چپ تو ہو گئی تھی مگر اس کی الجھن آمیز پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی جبکہ خاموش بیٹھی پازیب نے اپنی بہن گھنگرو کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر لئے تھے کہ وہ درحقیقت عاقل سے کیا کہنا چاہتی تھی، دفعتاً ہی دو تین ملازم روتے پیٹتے ہوئے عاقل خان کے قریب آئے۔

''قہر تھی دیو ...... چھوٹے سائیں (غضب ہو گیا) آپڑاں وڈا سائیں گزر گیا ...... ہم یتیم ہو گئے ...... سائیں ......!'' یہ کہتے ہی وہ ادھر ہی گھاس پر گر کر دھاڑیں مارتے ہوئے رونے لگے۔

عاقل خان کی حالت دگرگوں ہونے لگی ...... ایک لمحے کو تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ...... گھنگھرو اور پازیب کے بھی دل دھک سے رہ گئے۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم ...... کیا کہہ رہے ہو......؟" عاقل خان نے چلا کر کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

زمین پر بیٹھے دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

"سائیں ......ابھی ابھی گوٹھ سے اطلاع آئی ہے، سائیں ہم سے کچھ نہ پوچھو ......کچھ نہ پوچھو۔" اس میں مزید کچھ بتانے کی ہمت نہیں تھی۔

ملازموں کا اپنے وڈے سائیں سردار شیر دل خان کے لئے اس قدر رنجیدہ ہونا کوئی حیرت کی بات نہ تھی ...... یہ سب سردار کے اپنے نوکروں سے اولادوں جیسے رویے کا اثر تھا......وہ اپنے وڈے سائیں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔

عاقل خان شدید صدمے کے باعث دوبارہ کرسی پر گر گیا اور گھنگھرو اور پازیب اسے سنبھالنے کو لپکیں۔



اسی وقت عاقل خان اپنے دل پر ایک بوجھ اور خلش لئے گوٹھ روانہ ہو گیا تھا، کین جھرولا میں گھنگھرو اور پازیب دونوں بہنیں تنہا رہ گئی تھیں سوائے چند ایک ملازموں کے ......اس رات گھنگھرو وہیں پازیب کے پاس رہ گئی تھی......عاقل خان کے باپ کے انتقال پر انہیں بھی دکھ ہوا تھا، اب عاقل خان کے اچانک گوٹھ روانہ ہونے کی وجہ سے پازیب تنہا رہ گئی تھی، اگرچہ کین جھرولا میں چوبیس گھنٹے مسلح گارڈ تعینات رہتے تھے مگر عاقل خان کی موجودگی بہرحال ان دونوں بہنوں کو حوصلہ دیئے رکھتی تھی۔

یہ اسی رات کا ذکر تھا، کھانے وغیرہ کے بعد دونوں بہنیں خواب گاہ میں موجود تھیں اور محو گفتگو تھیں۔

"باجی......! عاقل خان اپنے دل پر بڑا بوجھ لے کر گوٹھ گئے ہیں۔" پازیب نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیسا بوجھ......؟" گھنگھرو نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"کب سے ان کا گوٹھ سے بلاوا آ رہا تھا...... جانے کیا مسئلہ تھا......کیا بات

تھی مگر عاقل خان محض میری وجہ سے گوٹھ جانے کے اپنے ارادے کو مسلسل ٹالتے آ رہے تھے ...... پتہ نہیں ان کے دل پر اب کیا بیت رہی ہوگی۔" پازیب کے لہجے میں سوگواریت اور انجانے احساس جرم کی جھلک نمایاں تھی۔

گھنگھرو بڑے غور سے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے اس کی بات سن رہی تھی۔

"باجی......! پتہ نہیں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے عاقل کے باپ کی موت کا باعث میں بنی ہوں ...... نہ جانے وہ عاقل سے کیا بات کہنا چاہتے تھے جواب ہمیشہ کے لئے ان کے سینے میں دفن ہو چکی تھی ...... اور ......اور اگر ان کے مرنے سے قبل عاقل گوٹھ چلے جاتے تو شاید ان کے بابا نہیں مرتے۔"

"پازیب......! تم بلاوجہ ہی ہر بات کو اپنے سر نہ لے لیا کرو...... جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔" گھنگھرو نے بے اختیار جھنجھلا کر کہا اور اس کا دھیان ایک اہم بات پر بٹاتے ہوئے مزید بولی۔ "پازیب......! سارے حالات تمہارے سامنے ہیں...... وہ حالات بھی جن سے تم خود بھی گزری ہو...... کیا تم نے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اچانک تمہاری جان کے دشمن بن جانے والے وہ کون لوگ ہیں؟"

بہن کی بات سن کر پازیب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا...... وہ کسی حد تک اپنی بہن کی بات سمجھ رہی تھی مگر بدستور اسے مستفسرانہ نگاہوں سے تکنے لگی۔ گھنگھرو نے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔ "پازیب......! تم معصوم ہو...... تمہیں اس ظالم دنیا کے منافقوں کا علم نہیں...... میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور برے بھلے حالات میں فوری اور درست فیصلہ کرنا مجھے انہی لوگوں نے سکھایا ہے...... عیار اور مکار لوگ کس طرح اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کیسے کیسے چکر چلاتے ہیں، تم ابھی ان سے واقف نہیں ہو مگر پڑھی لکھی ہو، اب شاید تم حالات کے در پردہ عوامل کا اندازہ بخوبی لگا سکتی ہو ......کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں کہ تمہارے دشمن کون ہو سکتے ہیں......؟"

اس کی بات سن کر پازیب کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

"ان لوگوں کا تعلق عاقل خان کے گھر والوں سے ہی ہو سکتا ہے۔" گھنگھرو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پرزور لہجے میں کہا۔ "یہ صرف میرا ہی خیال نہیں انسپکٹر خرم کو بھی اس بات کا یقین کی حد تک شبہ ہے ...... یہی نہیں اس نے اس کا ذکر عاقل خان سے بھی کیا تھا۔" وہ خاموش ہوئی تو پازیب نے ذرا چونک کر گھنگھرو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی جہاندیدہ بہن کی باتوں میں وزن محسوس ہو رہا تھا، گھنگھرو اپنی گفتگو کی اثر پذیری کا اندازہ پازیب کے چہرے سے لگاتے ہوئے مزید بولی۔

"مجھے تمہاری اور عاقل خان کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں اب تمہیں اپنا یہ ارادہ بدل دینا چاہیے کیونکہ اس طرح تم اور زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤ گی۔"

پازیب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر اپنی نگاہیں جھکا لیں ...... وہ شدید الجھن اور تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ یہ سچ تھا کہ جتنی محبت عاقل خان اس سے کرتا تھا، پازیب کو بھی اس سے اتنی ہی محبت تھی مگر وہ اپنی بہن گھنگھرو کی بات بھی رد نہیں کر سکتی تھی۔ تب پھر پہلی بار پازیب نے لب کشائی کرتے ہوئے اچانک نظریں اٹھا کر اپنی بہن گھنگھرو سے کہا۔

"باجی ......! میں نے سنا ہے مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا شخص گرفتار کر لیا گیا ہے ...... کیا ...... کیا اس سے کچھ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟"

"یہ پولیس والوں کا کام ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کا بھی سراغ لگا لے گی لیکن تمہیں میری باتوں پر بھی غور کرنا چاہیے۔" گھنگھرو نے کہا تو پازیب پھر بولی۔

"باجی ......! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پہلے اس بات کا پتہ چل جائے کہ یہ کن لوگوں کی کارستانی ہے؟"

گھنگھرو اپنی سادہ لوح بہن کی بات سن کر بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ اسے شاید اس بات کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ اس کی معصوم بہن ایک تلخ حقیقت کو ماننے سے انکاری ہے، عاقل کی محبت نے اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تھا ...... اس نے ہر وقت اپنی بہن پر دباؤ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور چپ

سادھ لی۔



سرمد اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا ...... اس کے رازداں ملنگ دوست میرو نے اسے اس بات سے بھی باخبر کر دیا تھا کہ متعلقہ تھانے کی پولیس اسے موجا خان کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار کرنے کے لئے پوری طرح سرگرم ہو چکی ہے لہٰذا اب ان مخدوش حالات میں اسے مستقل پناہ کی تلاش تھی اور وہ اس علاقے سے ہی بہت دور نکل جانا چاہتا تھا جس کے لئے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بدنام دھاڑیل نظرو کے گروہ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لے۔

ایک روز پہر رات میں جب لانڈھی میں نظرو دھاڑیل آیا تو سرمد نے بلا تامل اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ...... بس پھر کیا تھا، نظرو دھاڑیل اسے اسی وقت اپنے ساتھ اپنے جنگل ڈیرے میں لے گیا۔

"شاباش میڈا بہادر سنگت ......! یہ تو نے بالکل سچل فیصلہ کیا۔" نظرو دھاڑیل خوشی سے سرمد کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

سرمد کے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ "تو بالکل گڑتی (فکر) نہ کر ...... میڈے یار ......! پولیس تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" نظرو دھاڑیل، سرمد کے متانت بھرے چہرے کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے دوبارہ اس سے بولا تو سرمد سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے پولیس کی پرواہ نہیں نظرو! مجھے بس اپڑیں ماں اور ادی کونجاں کی پریشانی ہے، کہیں مردود پولیس والے انہیں تنگ نہ کریں۔"

"اس کی تو گڑتی (فکر) نہ کر میڈے شیر ......! میں انسپکٹر مراد خان سے نمٹ لوں گا ...... پر تو یہ بتا تو دل سے ہمارے گروہ میں شامل ہوا ہے نا ...... میرا مطلب ہے تجھے کوئی پچھتاوا تو نہیں ہو رہا، اگر تو کہے تو تجھے ابھی واپس لانڈھی چھوڑ آؤں؟" نظرو دھاڑیل نے سرمد سے کہا تو سرمد نے اچانک ایک چونکتی ہوئی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی، جب وہ بولا تو اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"بھا نظرو ......! پچھتاوا ان لوگوں کو ہوتا ہے جو بلا سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھاتے

ہیں۔ ویسے یہ بات بھی درست ہے کہ کوئی بھی ذی ہوش آدمی غلط راہ کا انتخاب دل سے نہیں کرتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات اور ناانصافی کی چکی میں پسنے والے ایک معصوم شخص کو درندہ بنانے میں اس معاشرے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔"

نظرو دھاڑیل، سرمد کے منہ سے ایسی مدبرانہ گفتگو سن کر بھونچکا رہ گیا...... دوسرے ہی لمحے نظرو دھاڑیل کو سرمد کی آواز اپنے دل کی آواز محسوس ہوئی...... پل بھر میں اس کے سخت گیر چہرے پر ایک لمحے کو مغمومیت کے آثار نمودار ہو گئے اور جب وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے سرمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو اس کے لہجے میں ماضی کے کھنڈروں کی گونج تھی۔

"تو صحیح بولتا ہے میڈے یار! میں بھی ایک عام اور غریب ہاری تھا...... مجھے دھاڑیل (ڈاکو) بنانے میں ایک وڈیرے اور پولیس کا ہاتھ تھا...... تجھے شاید یقین نہ آئے کہ میں نے بھی کوئی خوشی سے اس راہ کا انتخاب نہیں کیا تھا، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں ایک عام آدمی سے ایک بدنام اور خطرناک دھاڑیل بن جاؤں گا......تو اگر میری کہانی سنے تو تجھے بتاؤں۔"

وہ رکا تو سرمد اسے ذرا چونک کر دلچسپ نگاہوں سے تکنے لگا جیسے کہتا ہو ہاں سناؤ۔

"میری دردانگیز کہانی زیادہ لمبی چوڑی نہیں۔" سرمد کو آمادہ پا کر نظرو دھاڑیل اس کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمہاری طرح میں ایک غریب ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، میری ایک جوان بہن تھی...... ایک عمر رسیدہ وڈیرا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، ہمارے انکار پر اس نے ہم پر ظلم کی انتہا کر دی، طرح طرح سے ہمیں تکلیفیں پہنچانے لگا پھر بھی ہماری "نا" "ہاں" میں نہ بدلی تو اس خبیث وڈیرے نے میری بہن کو اٹھوا لیا اور ہمارے گھر کو آگ لگوا دی۔ خوش قسمتی سے میں بچ گیا مگر میرے بوڑھے ماں باپ جل کر مر گئے...... میں غم و غصے سے پاگل ہو گیا اور دیوانہ وار کلہاڑی تھامے وڈیرے کی اوطاق پہنچا تو اس کے حواری مجھ پر پل پڑے اور شدید زخمی کر کے دور جنگل میں پھینک دیا...... یہاں کئی دن زخموں سے نڈھال پڑے رہنے کے بعد میں زخمی شیر کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد میری زندگی کا رخ ہی

بدل گیا...... کھیتوں میں ہل چلا کر روزی روٹی کمانے والا نظر محمد...... نظرو دھاڑیل بن کر ابھرا...... میرے ہاتھوں میں کلاشنکوف آتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے دشمن وڈیرے سے بھیانک انتقام لیا...... اس دوران میری معصوم بہن نے بھی احساس ذلت سے خودکشی کر لی تھی۔" وہ اپنی مختصراً کتھا سنا کر خاموش ہو گیا۔

ہر سے کرختگی لئے اس کی آنکھوں میں اب نمی کی جھلک نظر آ رہی تھی، سرمد کا دل بھی پسیج گیا تھا...... کافی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ چھایا رہا۔

جنگل ڈیرے پر رات کی پرسکوت چادر تنی ہوئی تھی...... یہ جنگل ڈیرا، آبادی سے میلوں دور لئی اور کیکر کے گھنے جنگلوں کے دامن میں واقع تھا۔ عام آدمی تو کجا پولیس کے اہلکار تک اس خطرناک جنگل میں داخل ہونے سے کتراتے تھے۔

نظرو دھاڑیل کا گروہ تیس، چالیس ڈاکوؤں پر مشتمل تھا اور بدنام و خطرناک گروہ کہلاتا تھا۔ ڈیرے میں گھاس پھونس کی چھوٹی چھوٹی عارضی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جن میں یہ لوگ رہتے تھے۔

گروہ کا سرغنہ نظرو کی نسبتاً الگ تھلگ اور بڑی جھونپڑی تھی جہاں وہ اور جانو ماچھی ساتھ رہتے تھے۔ گروہ میں نظرو دھاڑیل کے بعد دوسرے نمبر پر سردار کی حیثیت جانو ماچھی کو حاصل تھی مگر اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھا صرف نظرو اور سرمد دم بخود ہیولوں کی مانند آمنے سامنے مڑی (جھونپڑی) کے اندر زمین پر رلی بچھائے بیٹھے تھے۔

قریب کی کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی لرزاں تھی...... کافی دیر دونوں کے بیچ خاموشی چھائی رہنے کے بعد نظرو ماحول کی رقت دور کرنے کی خاطر سرمد سے دوستانہ خوشدلی کے ساتھ بولا۔ "اچھا چھوڑ یار! یہ رونے دھونے کی باتیں، یہ ہمارے حوصلوں کو کمزور کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیتیں...... تو مجھے یہ بتا کہ کوئی بندوق، کوئی ہتھیار وغیرہ چلانا جانتا ہے یا سکھانا پڑے گا؟"

اس کی بات سن کر سرمد نے ہولے سے مسکرا کر کہا "ایسے ہی ہلکی پھلکی ایک نال والی بندوق چلائی ہے اور شاید ایک ادھ پستول بھی......"

"ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں اور بھی تجھے مزید سکھا دیں گے مگر اصل اہمیت

بندوق چلانے کی نہیں بلکہ نشانے پر گولی داغنے کی ہوتی ہے۔'' نظرو دھاڑیل نے بتایا اور سرمد نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''پر تو اس کی فکر نہ کر...... جانو ماچھی ہے ناں آپڑاں ...... یہ بڑے غضب کا نشانہ باز ہے......تھوڑے ہی دنوں میں تیکوں ماہر کردے گا۔''

پھر سرمد نے محسوس کیا کہ نظرو کے چہرے پر پرسوچ لکیروں کا جال سا پھیل گیا ہے...... بظاہر اس کا چہرہ خاموش تھا مگر سرمد کو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے نظرو کچھ کہنا چاہ رہا ہو تب سرمد قدرے چونک کر بولا۔ ''بھا نظرو! خیر تو ہے، کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے...... بول۔''

''ہاں یار......! دراصل میں چاہتا ہوں تجھے گروہ میں شامل ہونے سے پہلے کچھ اور ضروری باتیں بھی بتا دوں۔'' نظرو نے کہا۔

''ہاں...... ہاں ...... بتاؤ میں سن رہا ہوں۔'' سرمد نے کہا۔

''سرمد......! ہم دھاڑیل تو ضرور ہیں مگر ہمیں اپنی ''سرگرمیوں'' کے لئے ترکے لوگوں کی پٹھ (پشت پناہی) کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے، اس سلسلے میں پتھاریدار قسم کے لوگ اپنے مفاد کی خاطر ہماری مدد بھی کرتے ہیں۔'' پھر دفعتاً نظرو دھاڑیل نے اپنی بات کاٹی اور سرمد کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا چھوڑ ان باتوں کو...... آہستہ آہستہ تجھے خود ہی سب باتوں کا اندازہ ہو جائے گا...... چل آرام کر لیتے ہیں۔'' سرمد نے بغور نظرو کے چہرے کی طرف دیکھا، جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس سے کوئی خاص بات کہتے ہوئے کترا گیا ہو۔



پورا بھٹائی ہاؤس اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا تھا ...... سردار شیر دل خان کی اچانک موت نے سبھی کو رنجیدہ کر ڈالا تھا ...... یہ حقیقت تھی کہ سردار کی ناوقت اور اچانک رحلت سے گوٹھ کے لوگوں نے باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر اس طرح رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا جیسے ان کا باپ فوت ہو گیا ہو اور یہ تھا بھی سچ کہ وہ اب خود کو یتیم محسوس کرنے لگے تھے ...... دور پرے کے گوٹھوں کے لوگ، امراء، زمیندار اور وڈیروں نے بھی بھٹائی ہاؤس آکر عذر خوئی (پرسہ) کی تھی......اوطاق اور حویلی کے

احاطے میں اندر کیا باہر دور تک صف ماتم بچھائی جا چکی تھی اور ایک جانب دیگیں بھی پک رہی تھیں۔

باقی حویلی کے اندر اہل خانہ بالخصوص زنان خانے میں موت کا سا سماں محسوس ہو رہا تھا، تینوں بھائی عاقل خان، قادر بخش اور منصب خان بار بار اپنی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے...... عاقل خان اور قادر بخش کے دل و دماغ میں غم واندوہ کی آندھیاں سی چل رہی تھیں ...... ان کے دل یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے کہ ان کے بابا سائیں دنیا سے روٹھ کر بہت دور جا چکے ہیں۔ اگر اپنے بابا سائیں کے جسد خاکی کو انہوں نے خود کاندھا دینے کے بعد اپنے آبائی قبرستان لے جا کر اپنے ہاتھوں سے لحد میں نہ اتارا ہوتا لیکن باوجود اس کے ان کے دماغ میں یہ بات سما ہی نہیں پا رہی تھی کہ اس قیامت خیز گھڑی سے وہ گزر چکے ہیں......کیا حادثے اس طرح اچانک بھی ہوتے ہیں......؟ ہاں یہی سچ ہے اگر حادثے اچانک نہ ہوں تو حادثے ہی کیوں کہلائیں ...... یہی تقاضائے محدث زمانہ ہے۔

پھر یوں ہوا کہ بھٹائی ہاؤس سے خوشیاں روٹھ گئیں اور صرف سسکیاں باقی رہ گئیں ...... اہل خانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی آنکھوں میں محض دکھاوے کے آنسو تھے مگر درپردہ ان کے دل سردار کی موت پر خوش تھے ...... ہر کوئی سردار کی موت کو طبعی موت قرار دے رہا تھا مگر قادر بخش کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا، اگرچہ ہنوز اس نے یہ بات ظاہر نہیں کی تھی البتہ جب اس کے بڑے بھائی عاقل خان نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تو اس نے اپنے بڑے بھائی کے سامنے اس بات کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا مگر اس سے پہلے عاقل خان نے اس سے پوچھا۔ ''قادر......! کیا بابا سائیں کی طبیعت پہلے سے خراب تھی؟''

''ادا سائیں! ایسی تو کوئی بات نہ تھی مگر بابا آپ کی وجہ سے ضرور پریشان تھے۔'' قادر بخش نے بتایا۔

''کیوں یار! ایسی کیا بات تھی؟'' عاقل خان نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ اس وقت ان دونوں کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہ تھا۔ جواباً قادر بخش کے چہرے پر کچھ تذبذب کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنے

بڑے بھائی سے کچھ نہیں چھپائے گا، تب وہ ذرا کھنکار کر بولا۔

''ادا سائیں......! بابا سائیں کی موت سے کچھ روز پہلے حویلی میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا تھا جس سے بابا سائیں کو بڑا دکھ پہنچا تھا...... بابا سائیں نہیں چاہتے تھے کہ وہ بات خاندان سے باہر نکلے...... وہ کوئی اہم فیصلہ کرنا چاہتے تھے جس کے لئے آپ کی موجودگی انتہائی ضروری تھی مگر آپ کی طرف سے خاموشی پا کر بابا سائیں پریشان رہنے لگے تھے۔''

''ہاں قادر......! اس کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا...... یہ بات اب ہمیشہ کے لئے میرے ضمیر پر بوجھ بنی رہے گی۔'' عاقل خان کے لہجے میں احساس ندامت تھا اور اس کی آواز احساس غم کے باعث بوجھل سی تھی...... وہ پھر مستفسر ہوا۔ ''مجھے بتاؤ قادر......! وہ کیا بات تھی جو بابا سائیں صرف مجھ سے ہی کرنا چاہتے تھے......؟''

قادر بخش نے ایک مغموم سی نگاہ اپنے بھائی کے چہرے پر ڈالی اور پھر اس کے بعد اس نے وہ ساری بات اسے بلا کم و کاست بتا دی کہ کس طرح اس کی بیوی ہدایتاں اور سوتیلی ماں حاکم زادی نے مل کر ایک ایسی لڑکی کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی جو اسکے ساتھ شہر میں پڑھتی ہے اور جس سے وہ عاقل خان عنقریب دوسری شادی کرنے والا تھا۔

عاقل خان نے بھائی کی زبانی یہ سنا تو دنگ رہ گیا اور تب اچانک اس کے ذہن میں انسپکٹر چوہدری خرم کی وہ بات گردش کرنے لگی جو ایک دن کین جھرولا میں آ کر اس نے عاقل خان سے شبے کے طور پر کہی تھی کہ پازیب کے قاتلانہ حملے میں اس کے خاندان کے کسی فرد کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔

عاقل خان کو اب وہ بات درست ثابت ہوتی محسوس ہونے لگی...... وہ یکدم غصے سے لال پیلا ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور غیظ آلود لہجے میں دانت پیس کر بڑبڑایا۔

''ہوں......! تو یہ بات ہے...... میں ابھی اس ناگن ہدایتاں کی گردن مروڑتا ہوں۔''

بڑے بھائی کے خطرناک تیور دیکھ کر قادر بخش اسے روکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں

ادا سائیں......! خدا کے لئے خود پر قابو رکھو...... بات آپ کی سوچ سے بھی آگے جا چکی ہے۔'' قادر بخش کے لہجے کی سنسناہٹ نے ایک لمحے کو عاقل خان کے وجود میں سرسراہٹ دوڑا دی اور وہ عجیب پھٹی پھٹی نظروں کے ساتھ قادر بخش کا چہرہ تکنے لگا۔

''آپ بیٹھو آرام سے ادا سائیں......! احالات اس وقت بہت نازک رخ اختیار کر چکے ہیں۔'' قادر بخش نے کہا۔ ''ابھی بابا سائیں کا غم تازہ ہے اور پوری حویلی میں اس وقت بھیانک سازشوں کے سانپ رینگ رہے ہیں......ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے ان خراب حالات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔''

بھائی کی بات پر عاقل خان بمشکل اپنی کھولتی ہوئی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کرسی پر گر گیا۔

''ادا سائیں! کیا یہ بات درست ہے کہ آپ اپنی کسی کلاس فیلو سے دوسری شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' لمحہ بھر توقف کے بعد قادر بخش نے ہولے سے پوچھا۔ ''ہاں......! اور یہ بھی میں تمہیں بتا دوں کہ اس پر دو بار قاتلانہ اور جان لیوا حملہ بھی ہو چکا ہے۔'' عاقل خان نے کچھ سوچ کر بالآخر جواب دیا تو قادر بخش کی پیشانی پر گہری سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

عاقل خان دوبارہ یکدم بولا۔ ''اس نامعلوم ملزم کو پولیس گرفتار بھی کر چکی ہے۔'' اس کی بات سن کر قادر بخش بری طرح چونکا اور پھر پرجوش لہجے میں بولا۔

''کون تھا وہ...... پولیس نے اس کے منہ سے کچھ اگلوایا......؟''

''نہیں ابھی تک اس مردود نے اپنی زبان نہیں کھولی ہے۔'' عاقل خان نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے اب یقیناً وہی ملزم ہی اس بھیانک سازش سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔'' قادر بخش پرجوش ہو کر بولا۔

''مگر اس سازش سے پردہ تو اٹھ چکا ہے قادر......!'' عاقل خان غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

''یہ بات تو ظاہر ہو چکی ہے، بقول تمہارے کہ ہدایتاں اور چھوٹی امڑ (ماں) کا ہی یہ سارا جال بچھایا ہوا تھا مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ان دونوں ناگنوں نے

میلوں دور رہتے ہوئے اس حویلی میں ایسی خطرناک سازش کی کھچڑی کس طرح تیار کی......!!''

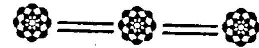
''اس سازش کی بنیاد بھاجائی (بھابھی) ہدایتاں کے دونوں بھائی یعنی آپ کے سالوں سائیں رکھیو اور مولا داد نے ڈالی تھی اور ان دونوں نے ہی اس ''کام'' کے عوض اپنی بہن سے دو لاکھ روپے مانگے تھے۔'' قادر بخش نے بتایا۔

عاقل خان کا چہرہ ایک بار پھر غصے کے مارے سرخ ہونے لگا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں ملتے ہوئے بولا۔ ''کاش......! میں نے بابا سائیں کا حکم مان لیا ہوتا اور......اور فوراً ان سے ملنے چلا آتا......کاش......!''

بھائی کو کف افسوس ملتے دیکھ کر قادر بخش اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''ادا سائیں......! اب افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں...... آگے کی سوچو......اب کیا کرنا ہے؟''

''مجھے تو اس بات کی بھی حیرت ہے کہ جب بابا سائیں کو اتنی بڑی بات کا پتہ چل چکا تھا تو انہیں اسی وقت......'' عاقل خان اچانک یہ کہتے کہتے رک گیا جیسے وہ اپنے باپ کی مجبوری کا سبب جان گیا ہو...... وہ جانتا تھا کہ ان کا باپ ذرا مختلف طبیعت کا مالک تھا اور جوش کی بجائے ہوش سے کام لیتا تھا اور بعض ایسے معاملات جن کی وجہ سے خاندان کی عزت پر حرف آتا ہو، ہمیشہ سوچ سمجھ کر فیصلے کیا کرتا تھا اور شاید اسی لئے ہی وہ اس کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔

''ادا سائیں ......! مجھے یقین ہے اگر آپ بروقت بابا سائیں کا کہا مان کر یہاں آ جاتے تو شاید وہ قتل ہونے سے بچ جاتے۔'' قادر بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا اور عاقل خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ یک ٹک اپنے چھوٹے بھائی کا چہرہ تکنے لگا۔



''یہ کیا کہہ رہے ہو تم ...... کک ......کیا بابا سائیں کو......'' عاقل خان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکلے۔

''ہاں ...... ادا سائیں......!'' قادر بخش نے ہولے سے کہا اور مزید گہرے لہجے میں بولا۔ ''ادا سائیں! جو لوگ یہاں بھٹائی ہاؤس میں رہ کر میلوں دور شہر میں ایک معصوم لڑکی کے قتل کی سازش کر سکتے ہیں تو کیا گھر کے فرد کو......''

قادر بخش نے اتنا ہی کہا تھا کہ عاقل خان اس کی بات کاٹ کر غصے سے بڑبڑایا۔ ''اگر یہ بات سچ نکلی تو میں دونوں کو نہیں چھوڑوں گا...... چھوٹی آمڑ (ماں) کا بھی لحاظ مجھے نہ ہو گا۔''

قادر بخش چپ رہا۔

اگلے دن عاقل خان نے سب سے پہلے اپنی بیوی ہدایتاں سے پوچھا۔ ''ہدایتاں! تم نے کچھ عرصے پہلے جو نیچ حرکت کی تھی اس کے بارے میں مجھے سب پتہ چل گیا ہے اور تم اپنی اس گھٹیا حرکت کا اعتراف بابا سائیں کے سامنے بھی کر چکی ہو...... میں اب اس کی اصل وجہ جاننا چاہتا ہوں......تم نے ایسا کیوں اور کس کی ایماء پر کیا؟''

ہدایتاں نے بغور اپنے شوہر کی بات سنی......سردار شیر دل خان کے انتقال کے بعد سے اس کے اندر ڈر اور خوف عنقا ہو چکا تھا......اس کی اہم وجہ وہ شہ تھی جو سردار کے مرتے ہی اس کے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد نے ہدایتاں کو دی تھی کہ وہ کسی صورت بھی اپنے شوہر سے نہ ڈرے کیونکہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... یہی وجہ تھی عاقل خان کی بات پر ہدایتاں سرسری لہجے میں مگر پُراعتماد رہنے کی سعی کرتے ہوئے جواباً بولی۔

"آپ کو جس نے بھی میرے خلاف ورغلایا ہے، وہ یقیناً ہماری خوشیوں سے جلتا ہوگا ...... میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی مجھے سائیں وڈے سے معافی مانگنے کی ضرورت پڑی ہو ...... مجھے تو آج تک اپنے اوپر لگائے گئے اس الزام پر حیرت اور دکھ ہوتا ہے مگر میں خاندان کی عزت کی وجہ سے سب کچھ برداشت کرتی چلی آئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے بار بار نشانہ بنایا جاتا رہے۔"

عاقل خان اپنی بیوی ہدایتاں کے لہجے پر متحیر سا ہوا......اچانک اس کے لہجے کی تبدیلی اس کے لئے باعث حیرت تھی، اس کا ثبوت ہدایتاں کے ساتھ پانچ سالہ رفاقت تھی، اس دوران عاقل کو اپنی بیوی ایک سیدھی سادی اور گھریلو عورت کے روپ میں ہی نظر آتی رہی تھی تو پھر آخر کیا وجہ تھی کہ وہ آج کچھ اور ہی قسم کی عورت دکھائی دے رہی تھی ...... جانے کیوں عاقل خان کی چھٹی حس اسے کچھ بیدار کرتی محسوس ہونے لگی۔ بہر طور بیوی کی بات پر اس کے چہرے پر اپنی برماتی ہوئی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے پھر بابا سائیں کے سامنے اپنی کون سی غلطی کا اعتراف کیا تھا؟"

"میری کوئی غلطی نہیں تھی مگر اللہ سائیں ...... سائیں وڈے کو جنت نصیب کرے، وہ طبیعت کے بہت گرم تھے ...... میں نہیں چاہتی تھی کہ بات خاندان سے باہر نکلے لہٰذا معاملہ دبانے کی خاطر میں نے ناکردہ گناہ کا الزام اپنے سر لے لیا تھا اور معاف بھی مانگ لی تھی۔" ہدایتاں نے مکاری سے جواب دیا۔

عاقل خان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ اس کی بیوی ہدایتاں کے لب و لہجے میں اس کے سازشی بھائیوں کا سکھایا ہوا سبق موجود تھا جو وہ پہلے ہی اسے پڑھا چکے تھے ...... پہلی بار عاقل خان کے چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ تذبذب کا شکار ہو جس نے اس کے اندرونی غیظ آلود ابال کو کم کر دیا ہو ...... ہدایتاں کی بھانپتی نظروں نے شوہر کی یہ کیفیت تاڑ لی تھی اور پھر ایک نیا چلتر چلتے ہوئے وہ اپنے لہجے میں دنیا جہاں کا پیار سموتے ہوئے بے اختیار بولی۔ "سائیں ......! میں آپ کی بانی (باندی) ہوں ...... آپ کی خوشی میری خوشی ہے ...... میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے مرد کی دوسری شادی پر جلتی کڑھتی ہیں ...... آپ کی اگر خوشی دوسری

شادی میں ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہم تو سوکن کے آنے سے اپنی قدر و قیمت کو بجائے کم محسوس کرنے کے اور زیادہ ہی سمجھتے ہیں ...... سائیں وڈے کی مثال ہمارے سامنے ہے ...... چھوٹی آمڑ (حاکم زادی) سے دوسری شادی کرنے کے باوجود ہم نے وڈی آمڑ (دراں خاتون) کی عزت کو سائیں وڈے (سردار شیر دل خان) کے سامنے کبھی کم نہ پایا ...... اللہ، سائیں کو جنت نصیب کرے ...... آپڑیں سائیں وڈے کو وہ پہلے سے زیادہ اپنی پہلی بیوی سے محبت کرتے تھے ...... ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔" ہدایتاں اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔

عاقل خان نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر کچھ ایسا تاثر دینے لگا جیسے وہ بیوی کی باتوں سے متاثر ہونے لگا ہو۔

ادھر ہدایتاں، شوہر کے چہرے پر اپنی دور رس کلامی کی اثر پذیری دیکھتے ہوئے خوش اور مطمئن نظر آنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں؟" دفعتاً عاقل خان نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر ہدایتاں بھی ایک کائیاں تھی ......اس کی سوتیلی ساس حاکم زادی پہلے ہی اسے سکھا پڑھا چکی تھی ...... اک ادائے دلبرانہ انداز میں نغمہ ریز ہو کر بولی۔ "سائیں......! اب یہ بھی کوئی چھپنے والی بات ہے جو بیوی آپڑیں مڑس سے ٹوٹ کر سچی محبت کرتی ہے، اسے سب پتہ چل جاتا ہے۔"

جواباً عاقل خان کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات ابھرے پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے منقش پایوں والی ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھ گیا ...... ہدایتاں کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔



"شاباش ڑی ہدایتاں! تو نے صحیح کیا، اپنے مڑس (شوہر) سے ...... مرد کے سامنے کبھی ضد نہیں دکھاتے ورنہ وہ وہی کرتے ہیں جس سے انہیں روکا جاتا ہے۔"

حاکم زادی، ہدایتاں کی زبانی ساری کارگزاری سننے کے بعد مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "عاقل سے بھی منہ ماری مت کرنا ...... اس کے ساتھ اس طرح ہی پیش آتی رہو جیسے تم ہی اس کی ہمدرد ہو اور یہی ظاہر کرتی رہو کہ تم اس کی ہر خوشی کے لئے خود کو

قربان کرسکتی ہو...... اگر تمہیں اس کی دوسری شادی کے سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کرنا پڑ تو بے دریغ کرنا...... تم نے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہدایتاں! جو کہ عاقل خان جیسے آتش فشاں کو پیار اور چالاکی سے تھپک کر سلا دیا۔''

''مگر عاقل دوسری شادی کر لے گا پھر......؟'' ہدایتاں کے لہجے میں تشویش عود کر آئی تھی۔

''اس کی گڑتی نہ کر تو ...... اس چڑیل کو آنے تو دے ذرا بھٹائی ہاؤس میں......'' حاکم زادی نے کہا اور پھر اپنا منہ ہدایتاں کے کانوں کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ''اڑی تو دیکھتی تو جا میں کرتی کیا ہوں ...... یہاں تو سردار بھی ہمارے زہر سے نہ بچ سکا تو وہ چھوکری کیا شے ہے؟'' حاکم زادی کی بات پر ہدایتاں کے ہونٹوں پر سفا کانہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی اور وہ ہولے ہولے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگی۔

''سن......! اب تجھے ایک اور کام کرنا ہوگا۔'' چند لمحے توقف کے بعد حاکم زادی نے ہولے سے کہا۔

''ہاں بول آ مڑ سائیں......! سن رہی ہوں میں......'' ہدایتاں نے کہا۔

''دیکھ اب تو اس طرح اپنی وفاداری اور فرمانبرداری کا اثر عاقل خان کے دل و دماغ میں بٹھاتی رہنا، کبھی منہ ماری نہ کرنا اس کے ساتھ ...... بڑی مشکل سے اس کا تیری طرف سے دل صاف ہوا ہے ...... اسے ہر وقت اس بات کا یقین دلاتی رہ کہ تجھے اس کی ہر خوشی عزیز ہے ...... دوسری شادی کرنے سے تو وہ باز آ نہیں سکتا پھر تو کیوں خود کو برا بنائے بلکہ الٹا اس کی حوصلہ افزائی کر بلکہ اگر وہ شہر والی چھوکری سے شادی کر بھی لیتا ہے تو آ پڑیں سوکن کا پہلے دن سے ہر طرح کا خیال رکھ...... اس طرح کیا ہوگا تیرے شوہر کے دل میں تیرا اعتبار بیٹھتا چلا جائے گا تب پھر تو رفتہ رفتہ اسے اس کے چھوٹے بھائی قادر بخش کے بارے میں ورغلانا شروع کرنا بلکہ یہ بات تو تو ابھی سے ہی عاقل خان کے کان میں ڈالنا شروع کر دے کہ سائیں وڈے کی اصل پریشانی کا سبب قادر بخش تھا جو ایک ''رہاک'' (کسان) کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس کے بھائی کو ''کارو'' قرار دیا جا چکا ہے اور یہی نہیں قادر بخش کی وجہ سے زندگی

میں پہلی بار بھٹائی ہاؤس میں پولیس نے آ کر سائیں وڈے سے باز پرس بھی کی تھی اور قادر بخش کو موجا خان کے قتل میں ملوث بھی قرار دیا تھا۔'' حاکم زادی نے اپنی صراحت آمیز گفتگو ختم کی تو ہدایتاں کی آنکھیں یکدم یہ سب سن کر چمک اٹھیں۔

عاقل خان اور قادر بخش دونوں بھائیوں کے درمیان نفرت پیدا کرنا اب ضروری ہو گیا ہے ہدایتاں......!'' لمحہ بھر توقف کے بعد حاکم زادی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''اگر دونوں بھائی ساتھ مل گئے تو سمجھو سب کچھ ختم ہو جائے گا اس لئے جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو اور اپنے مڑس (شوہر) کے کان اس کے چھوٹے بھائی قادر بخش کے خلاف خوب بھرو تا کہ دونوں میں ان بن ہو جائے تا کہ ہمارا کام ''بن'' جائے۔'' ہدایتاں دھیرے دھیرے سب کچھ سمجھتی چلی گئی۔



اس دن کے بعد سے یہ بات دب گئی ...... ہدایتاں کے میکے آنے جانے اور ان کے بھٹائی ہاؤس آنے جانے کی پابندی عاقل خان نے ختم کر دی تھی اور حیرت انگیز طور پر عاقل خان کے دونوں سالے سائیں رکھیو اور مولا داد تو اپنے بہنوئی کے آگے بچھے چلے جا رہے تھے۔ ذرا موقع پاتے ہی انہوں نے پھر بہن کے ساتھ مل کر لگائی بجھائی شروع کر دی ...... انہوں نے بھی ہدایتاں کو اسی بات کی تلقین کی کہ ''جیسے حاکم زادی بولتی ہے، ویسے ہی کر مگر بہرحال اس سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ...... رہی بات دوسری شادی کی تو وہ وقت آنے پر اس سے بھی نمٹ لیں گے۔'' درحقیقت ان لوگوں کی تو جان میں جان آئی تھی کہ پازیب کو قتل کرنے والا معاملہ دب گیا تھا ...... وہ سب اپنی چھریوں کو تیز مگر میٹھا رکھنا چاہتے تھے اور یہی وقت کا تقاضا بھی تھا۔

ادھر قادر بخش کو یہ بات محسوس ہوگئی تھی کہ کچھ عرصہ قبل حویلی میں اس کے باپ سردار شیر دل خان نے جو سازش سرنگوں کی تھی اور جس کا آخری فیصلہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے عاقل خان کے شہر سے لوٹنے تک محفوظ رکھا تھا، وہ دبا دی گئی ہے ...... حیرت اسے اپنے بڑے بھائی عاقل خان پر ہو رہی تھی کہ آخر اس کی بیوی ہدایتاں نے اس پر ایسا کون سا جادو چلا دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں چپ ہو رہا تھا حالانکہ

بعدازاں قادر بخش نے اپنے بڑے بھائی عاقل خان کو اشاروں کنایوں میں یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ سردار کی موت کا تعلق بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے۔

''قادر......! تم کیا سمجھتے ہو میں اتنا ہی بے خبر ہوں؟''

چھوٹے بھائی قادر بخش کی روز بروز دکھ آمیز بے چینی کو بڑھتا ہوا محسوس کرتے ہوئے بالآخر عاقل خان نے قدرے پراسرار اور گھمبیر لہجے میں قادر بخش سے کہا تو قادر بخش چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگا......اس وقت دونوں بھائی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھے تھے...... یہ کمرہ ان کے بابا سائیں کا تھا......تنہائی کے چند لمحات گزارنے کو جب ان کا جی چاہتا تھا تو وہ ادھر کچھ دیر کے لئے بیٹھ جایا کرتے تھے۔

''تم میری خاموشی کو چشم پوشی سمجھ رہے ہو گے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں باریک بینی سے حالات کا جائزہ لینے میں منہمک ہوں۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد عاقل نے پھر ہولے سے کہا تو قادر بخش کے چہرے سے اب جوش آمیز مسرت مترشح ہونے لگی...... وہ جس مخفی اور گہری چال سے بھائی کو آگاہ کرنا چاہتا تھا، وہ اس سے بے خبر نہ تھا...... وہ بے اختیار ایک طمانیت بھری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''ادا سائیں......! اللہ کا شکر ہے ورنہ میں آپ کی طویل خاموشی کو جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ کو غلط سلط باتیں بتا کر قائل نہ کر دیا گیا ہو۔''

چھوٹے بھائی کی بات پر عاقل خان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ غیر مرئی نقطے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''قادر بخش......! حویلی میں کالی بھیڑوں کا گروہ سرگرم عمل ہے اور دکھ کی بات یہی ہے کہ ان لوگوں کا تعلق بھی ہمارے ہی خاندان سے ہے...... ان میں چھوٹی آمڑ حاکم زادی اور میری بیوی ہدایتاں اور اس کے بھائی وغیرہ شامل ہیں۔''

''بالکل درست کہا آپ نے ادا سائیں......!'' قادر بخش یک بیک جوش سے بولا۔

''پتہ نہیں ہم سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے جو یہ ہماری جان کے بیری ہو گئے ہیں اور بابا سائیں کو بھی نہیں بخشا ان ظالموں نے......'' یہ کہتے ہوئے قادر بخش کا لہجہ

مغموم ہو گیا اور آنکھوں میں نمی کی جھلک نمایاں ہو گئی تھی۔

چھوٹے بھائی کو روہانسا محسوس کر کے عاقل خان کا دل بھی بے اختیار پسیج گیا تھا......سردار شیر دل خان کی موت کے بعد اصولی طور پر خاندان کا سربراہ عاقل خان ہی تھا مگر اسے یہ تلخ گھونٹ پینا پڑ رہا تھا...... وہ بے بس تھا...... چاہتا تو بھٹائی ہاؤس کو دیمک کی طرح چاٹنے والی کالی بھیڑوں کا صفایا کر سکتا تھا لیکن خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے اندازہ ہوا تھا کہ درحقیقت وہ کتنا مجبور تھا...... وہ کمزور نہ تھا مگر اس خاندان سے تعلق رکھنے والی کالی بھیڑوں نے اسے کمزور بنا ڈالا تھا...... معاملہ اگر حویلی کی چار دیواری سے باہر کے لوگوں کا ہوتا تو وہ ان سے اچھی طرح نمٹ لیتا مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا...... تب اسے احساس ہونے لگا کہ اس کے بابا سائیں اسے کیوں شہر سے جلد بلانا چاہتے تھے۔

''ادا سائیں......! اس معاملے میں ہمیں کچھ کرنا پڑے گا...... خاموش رہنے سے سازشوں کے تار عنکبوت دراز تر ہوتے چلے جائیں گے۔'' ذرا دیر توقف کے بعد قادر بخش نے اپنے بھائی کو گہری سوچوں میں غلطاں پا کر کہا۔

''ہوں......تم صحیح کہتے ہو قادر......!'' عاقل خان جواباً تائیدی لہجے میں بولا۔

''بابا سائیں کی موت اگر قتل ثابت ہوئی تو میں قاتل کو کسی صورت بھی نہیں بخشوں گا، چاہے اس کا تعلق خاندان کے کسی بھی فرد سے کیوں نہ ہو۔'' بڑے بھائی کے اٹل جوشیلے فیصلے نے قادر بخش کو بھی یک گونہ حوصلہ عطا کیا...... وہ خود اپنے دل میں یہ پرزور خواہش بلکہ عزم مصمم رکھتا تھا کہ حویلی سے کالی بھیڑوں کا نہ صرف صفایا ہو بلکہ بابا سائیں کے قاتل کو بھی بے نقاب ہونا چاہئے ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ یہی تار سازش انہیں بھی آگے چل کر اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔

''تو ادا سائیں......! اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کوئی لائحہ عمل ہے؟''

قادر بخش، عاقل خان سے مستفسر ہوا...... چھوٹے بھائی کی ترغیب آمیز بات پر عاقل خان کی پرسوچ نظریں چند ثانیے کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رہیں پھر وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''اس کے لئے ہمیں پہلے تھانے میں یہ رپورٹ درج کروانی ہو گی کہ بابا سائیں کی موت طبعی نہیں بلکہ قتل تھا تاکہ نامعلوم افراد کے خلاف

ایف آئی آر کٹ جائے۔ پولیس اس سلسلے میں سب سے پہلی کارروائی یہ کرے گی کہ بابا سائیں کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے انہیں بابا سائیں کی قبر کھودنا پڑے گی۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''اور اس سلسلے میں پولیس سب سے پہل ہماری حویلی سے تفتیش کی ابتداء کرے گی۔''

قادر بخش نے بڑے بھائی کی بات کو بغور سنا...... معاملہ باپ کے قتل کا تھا اس لئے دونوں بھائی اب مزید درمیان میں کوئی مصلحت لانا نہیں چاہتے تھے۔

''ادا سائیں......! یہ ساری باتیں تو ہمیں برداشت کرنا ہی پڑیں گی...... پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اب کوئی مصلحت آڑے نہیں آنی چاہئے ہمیشہ کے لئے یہ قضیہ نمٹ جانا چاہئے۔'' قادر بخش نے حتمی لہجے میں کہا اور عاقل خان پرسوچ انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔



دونوں بہنوں کی پریشان کن بے چینی دن بدن فزوں تر ہوتی جا رہی تھی...... اگرچہ انہیں عاقل خان کے باپ کی اچانک وفات کا سن کر قلق ہوا تھا اور ظاہر ہے وہ اسے گوٹھ جانے سے روک بھی نہیں سکتے تھے مگر جانے کیوں گھنگھرو اور پازیب کین جھرولا میں عاقل کی غیر موجودگی سے پریشان سی ہوئی جا رہی تھیں...... اگرچہ یہاں مسلح گارڈز بھی موجود تھے...... عاقل خان کو اپنے گوٹھ گئے چار پانچ روز سے اوپر ہو چلے تھے...... اس دوران گھنگھرو نے پازیب کو بالکل تنہا نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی وہ چاندنی بی کے کوٹھے پر گئی تھی ہاں البتہ اس نے فون پر چاندنی بی کو موجودہ صورت حال کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''اڑی میری بنو......! تم دونوں اکیلی اتنی بڑی کوٹھی میں کیسے رہ رہی ہو...... اس طرح تو تم دونوں کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے...... تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ...... جب تک اصل مجرموں کا پتہ نہ لگ جائے۔ کہو تو ڈیرے کو بھیج دوں؟'' فون پر چاندنی بی نے بڑی چالاکی کے ساتھ گھنگھرو سے کہا تو گھنگھرو اپنے لہجے کی تلخی دبانے کی سعی کرتے ہوئے جواباً بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں، بس عاقل خان آنے ہی والا ہے اور بہت جلد مجرم بھی

گرفتار ہونے والے ہیں...... ایک کو تو پولیس نے گرفتار کر رکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور چشم تصور میں چاندنی بی کو غصے سے پھنکتا ہوا دیکھنے لگی۔ دن بھر جلنے والی گرم لو شام میں جب نرم نرم ٹھنڈ میں بدلنے لگی تو دونوں بہنیں کین جھرولا کے وسیع لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئیں...... ابھی دونوں باتوں میں ہی مصروف تھیں کہ ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ انسپکٹر چوہدری خرم کا فون آیا ہے۔ گھنگھرو لپک کر اندر ڈرائنگ روم میں آئی اور جھٹ سے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو...... انسپکٹر صاحب! میں پازیب کی بڑی بہن بول رہی ہوں گھنگھرو......''

''جی......! مجھے پتہ چلا عاقل صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ گوٹھ جا چکے ہیں۔'' دوسری طرف سے انسپکٹر کی آواز ابھری۔

''جی گوٹھ سے اچانک اطلاع آئی تھی اور انہیں فوراً نکلنا پڑا۔'' گھنگھرو نے کہا۔

''کیا ہوا تھا ان کے والد صاحب کو...... کیا بیمار تھے پہلے سے......''

''اس کا مجھے علم نہیں...... عاقل خان آئیں گے تو صحیح پتہ چلے گا۔'' گھنگھرو نے کہا اور فوراً اس قاتل کے بارے میں استفسار کیا جو ان کی تحویل میں تھا۔ گھنگھرو کی بات پر دوسری طرف ایک اندیشوں بھرا گھمبیر سناٹا چھایا پھر اگلے ہی لمحے انسپکٹر کی آواز ابھری۔

''ایک افسوسناک خبر ہے اسے حوالات میں کسی نے گولی مار کر قتل کر دیا ہے۔''

''کک...... کیا......؟'' گھنگھرو کو جیسے یقین نہ آیا...... اس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ ''یہ کیسے ہو گیا انسپکٹر صاحب!'' گھنگھرو کے لہجے میں ایک خوف آمیز استعجاب تھا۔

''مجھے اس کا دکھ ہے بلکہ اس سے زیادہ اپنی کوتاہی پر غصہ بھی آ رہا ہے۔'' انسپکٹر خرم کے لہجے میں حد درجے کی شرمساری تھی۔

''اس کا مطلب ہوا انسپکٹر صاحب کو مجرم قانون سے زیادہ طاقتور ثابت ہو رہے ہیں۔'' گھنگھرو کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"آپ حق بجانب ہیں ایسا کہنے میں لیکن ہم بھی تو آخرانسان ہیں، ہم سے بھی غلطی ہوسکتی ہے۔"

"بات غلطی کی نہیں ہے انسپکٹر صاحب! ایک ملزم کا پولیس کی کسٹڈی میں قتل یا تو ملی بھگت کا تاثر دیتی ہے یا پھر انتہا درجے کی غیر ذمہ داری...... کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ جو مجرم اس طرح بڑے آرام سے قانون کے رکھوالوں کی صفوں میں گھس کر مجرمانہ کارروائی کرگزرتے ہیں، ان کے لئے بھلا عام شہریوں کے درمیان یہ کارروائی کرنا کتنا آسان ہوتا ہوگا...... اس کا مطلب ہے ہم یہاں کین جھرولا میں بھی غیر محفوظ ہیں؟" گھنگھرو کے لہجے میں ہنوز طنز تھا مگر انسپکٹر بدستور اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھئے بی بی! میں نے کہا نا کہ آپ ایسا سب کچھ کہنے میں حق بجانب ہیں لیکن ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ بہرحال میں آپ کی حفاظت کے لئے پولیس گارڈ تعینات کردوں گا۔" پھر لحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ "مجھے عاقل صاحب سے بہت جلد اور ضروری طور پر ملنا ہے...... میرا خیال ہے وہ کئی روز تک تو شہر نہیں آسکیں گے لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ ان کے گوٹھ میں ہی ان سے بالمشافہ ملاقات کرلوں مگر اس کے لئے مجھے کین جھرولا سے عاقل صاحب کا کوئی فرد ساتھ لے جانا پڑے گا۔"

"آپ ایسا کریں ادھر ہی آجائیں اور دوست محمد سے اس سلسلے میں بات کرلیں، وہ عاقل صاحب کا ہی آدمی ہے۔" گھنگھرو نے کہا۔

"ٹھیک ہے، یہی بہتر رہے گا۔" انسپکٹر چوہدری خرم نے کہا اور پھر مزید چند جملے تسلی کے بول کر سلسلہ منقطع کردیا۔



"منے خان تم تو کہتے تھے کہ میں ایسی چال چلوں گا کہ دونوں بہنیں گھٹنے ٹیکے ہمارے سامنے آموجود ہوں گی مگر وہ تو یہاں کا راستہ ہی بھلا بیٹھی ہیں۔" چاندنی بی نے اپنا ہاتھ نچاتے ہوئے خاصے جلے کٹے لہجے میں سامنے صوفے پر بیٹھے پان چباتے منے خان سے بولیں تو اس نے پان کی پیک نگلتے ہوئے الوؤں جیسی آنکھوں والی گول شیشوں کی عینک کو ذرا درست کیا پھر باریک باریک سے مکارانہ ہونٹوں کو پھیلاتے

ہوئے بولا۔ "چاندنی بی......! ہم تو کب کی اپنی بساط بچھا کر سمیٹ بھی چکے۔"

"منے خان! ہم پہلے ہی پریشان ہیں...... پہیلیاں مت بجھواؤ، صاف صاف بتاؤ...... اب تک وہ دونوں بہنیں کمبخت اس وڈیرے زادے کے ساتھ کیوں چپکی ہوئی ہیں؟" چاندنی بی نے جھلا کر کہا۔ اس کے ساتھ ذرا فاصلے پر اس کا چہیتا دبیر دادا بھی بیٹھا تھا، اس نے حسب عادت بڑی ٹائٹ قسم کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور چست پتلون جس کی مہریاں ٹخنوں تک جاکر بند ہوگئی تھیں۔ وہ سامنے بیٹھے منے خان کو کچھ ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے اس پر ادھار کھائے بیٹھا ہو وہ ادھار بھی کوئی ایسا ویسا...... گھنگھرو جیسی حسینہ کا قرب پاتے پاتے رہ گیا تھا کہ عین وقت پر منے خان نے چاندنی بی کو یہ ظلم کرنے سے منع کردیا تھا مگر آج چاندنی بی کے ساتھیوں نے منے خان کو آڑے ہاتھوں لیتے دیکھ کر دبیر دادا دل ہی دل میں خوشی محسوس کررہا تھا۔

چاندنی بی کی جھنجلاہٹ کو مدنگاہ رکھتے ہوئے منے خان نے اپنے منہ میں بھرے ہوئے پان کو کلے میں دبایا اور یکدم بولا۔

"چھوٹی بنو پازیب کے لئے تو اب یونیورسٹی کے دروازے بند ہوچکے ہیں...... میں نے پوری یونیورسٹی میں خاص طور پر اس کی قریبی سہیلیوں میں اس کی اصلیت کا پول کھول دیا ہے، ادھر اپنی بڑی بنورانی گھنگھرو بھی اب خود کو بے بس سمجھنے لگی ہے کیونکہ اس کی چھوٹی بنورانی کا ہیرو وڈیرازادہ اپنے خاندانی جھمیلوں میں کھوچکا ہے اور اپنے باپ کی پراسرار اور اچانک موت کا سن کر پازیب اور گھنگھرو کو تنہا اپنی کوٹھی کین جھرولا میں چھوڑ کر غیر معینہ مدت کے لئے اپنے گوٹھ سدھار چکا ہے، ادھر تھانے میں پازیب پر قاتلانہ حملہ کرنے والے اس ملزم کو بھی جیل کی چاردیواری میں ہی کسی نامعلوم شخص کی گولی کا نشانہ بننے کی وجہ سے اس کیس کو مزید الجھا ڈالا ہے جس نے ان دونوں بنورانیوں (گھنگھرو اور پازیب) کو پریشان کر ڈالا ہے۔" منے خان اتنا بتا کر چپ ہوا...... چاندنی بی یک ٹک جیسے سانس روکے منے خان کا چہرہ تکے جارہی تھی...... اس کے تھلتھلاتے ہوئے وجود نے مسرت آمیز جنبش لی پھر اپنے گریبان میں جلدی سے ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی منے خان کی طرف اچھال دی اور پھر خوشی سے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے لہک کر بولی۔ "منے خان......! میں تو شروع

ہی سے تمہاری عقلمندی کی قائل ہوں ...... ویسے کیا یہ سب خبریں درست ہی ہیں ناں......؟'' اسے جیسے اب تک منے خان کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ادھر منے خان نوٹوں کی گڈی کو جلدی سے اپنے کرتے کی جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو چاندنی بیگم......! بھلا منے خان کی خبریں کبھی آج تلک غلط ثابت ہوئی ہیں کوئی......!'' اس نے خالص دلالوں والے انداز میں ہاتھ نچا کر کہا اگر یہ سچ ہے تو گھنگھرو کے ساتھ ساتھ اب پازیب کو ادھر ہی (کوٹھے) کا راستہ دیکھنا پڑے گا۔'' چاندنی بی مسرت آمیز انداز میں جیسے خودکلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''اور یہی سب سے بہتر موقع ہے کہ اسی وقت ہم کین جھرولا میں جا کر ان دونوں چڑیوں کو بہلا پھسلا کر ادھر ہی لے آئیں۔'' منے خان نے پرزور لہجے میں جیسے سجھائی دی جس کی چاندنی بی نے فوراً تائید کے بعد دبیر دادا کا چہرہ بجھ چکا تھا۔



کچھ روز سے پازیب نے اچانک ایک بات نوٹ کی تھی جسے وہ پہلے اپنا واہمہ قرار دیئے ہوئے تھی لیکن جب ایک روز اس پر کچھ زیادہ جھنجلاہٹ اور افسردگی بھری قنوطیت نے حملہ کیا تو اس نے یونیورسٹی کیمپس میں اپنی ایک سہیلی کو فون کر ہی ڈالا۔ یہ سیکنڈ ایئر کی شمسہ تھی۔ ''ارے بھئی کیا ہو گیا ہے تم سب کو، اتنے بے مروت کیوں ہو گئے ہو کہ آنا تو درکنار فون تک نہیں کیا مجھے...... کس حال میں ہوں...... کیسی ہوں...... یہ تک بھی نہ پوچھا......'' نوک زبان پر اگرچہ گلے شکوے تھے لیکن ان میں ایک دوستانہ رمز بھی تھا...... ایک انسیت بھی تھی لیکن اس وقت پازیب ششدر رہ گئی جب فوری طور پر جواب ملنے کی توقع کو کچھ اس انداز کا جھٹکا لگا کہ شمسہ جو اتنی باتونی اور فوراً جوابی حملے کے لئے بے تاب رہنے والی مشہور تھی ...... پازیب کی بات سن کر چپ رہی۔ ''ہیلو شمسہ......! تم میری بات سن رہی ہو ناں......؟'' پازیب کو جیسے شمسہ کی خاموشی پر یقین نہ آیا تھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اس کی آواز شاید اس کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پا رہی ہو۔ ''ہا...... ہاں سن رہی ہوں میں......'' دوسری طرف سے اتنے ہولے انداز میں کہا گیا جسے پازیب نے بہ وقت تمام سنا...... اسے شمسہ کے لہجے نے جھٹکا پہنچایا تھا، وہ سمجھی شاید شمسہ کو اپنی کوئی پریشانی آن پڑی تھی لہٰذا پازیب نے

پوچھا۔ ''خیریت تو ہے شمسہ......! تم چپ چپ ہو...... میری بات کا جواب بھی نہیں دیا؟'' جواباً دوسری طرف پھر اندیشوں بھری چپ سی طاری رہی...... ادھر پازیب ذہنی اتھل پتھل کا شکار ہونے لگی...... شمسہ اس کی گہری سہیلی تھی اور پازیب جانے کیوں چشم تصور میں شمسہ کو ایک الجھن آمیز خاموشی میں محسوس کر رہی تھی...... اسے یوں لگا دوسری طرف شمسہ جیسے تذبذب کا شکار ہو...... پھر چند ثانیے پازیب کو ریسیور میں شمسہ کے ایک گہرا سانس لینے کی ہنکاری سنائی دی اور ساتھ ہی وہ بولی۔

''دیکھو پازیب......! اب کیا جھوٹ ہے، کیا سچ......؟ لیکن بہرحال مجھے یقین ہے کہ تم کم از کم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔'' اس کی بات پر تو جیسے پازیب کو سانپ سونگھ گیا تھا...... چلبلی شمسہ کو اس قدر سپاٹ اور سنجیدہ پہلے کبھی اس نے نہیں پایا تھا...... آج اس کے بدلے بدلے لہجے نے تو پازیب کو ہولا سا دیا...... وہ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ''ہاں...... ہاں کیا بات ہے، بتاؤ مجھے...... میرا وعدہ ہے میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔''

''پازیب......! تمہاری بہن گھنگھرو کا تعلق ایک کوٹھے سے ہے؟'' دوسری طرف شمسہ نے جیسے پازیب کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا...... ایک لمحے کو تو اس کے دماغ میں سکتہ چھا گیا اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے...... کافی دیر تک تو وہ کچھ بول ہی نہ پائی...... وقفۂ سکوت طویل ہوا تو شمسہ کی معنی خیز آواز ابھری...... وہ پازیب کو مخاطب کر کے دوبارہ بولی۔ ''تمہاری خاموشی کو میں کیا سمجھوں پازیب......! کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ تم بھی......!'' دفعتاً ہی پازیب بھی اپنے وجود میں بتدریج بڑھتی ہوئی لرزشوں پر قابو نہ پا سکی اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا...... دماغ سن ہونے لگا پھر اگلے ہی لمحے شمسہ کا تیز کٹیلا جملہ پورا سنے بغیر ہی ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تار کے سہارے تپائی سے نیچے لڑھکنے لگا جبکہ وہ خود دبیز قالین پر اپنی دونوں کنپٹیوں پر ہتھیلیاں رکھے نیچے گرتی چلی گئی۔



دن بھر چلنے والی پرتپش ہواؤں کی حدت میں اب رفتہ رفتہ کمی واقع ہونے لگی تھی...... دور چاولوں کے کھیتوں سے پرے ڈوبتے سورج سے افق لال گلگوں ہو رہا تھا

......فضا میں حبس کم ہو چکا تھا...... دور کھجوروں اور سریں کے بلند و بالا پیڑوں کے اوپر تھکے ہارے پرندوں کی چال مست ڈاریں اپنے آشیانوں کی طرف محو پرواز تھیں...... زمیندار حکم داد کی اوطاق کے باہر پانی کا تازہ چھڑکاؤ کیا جا چکا تھا، اوطاق کے باہر چھپر سائبان تلے دو نقشین پایوں والی رلی بچھی چار پائیوں پر آمنے سامنے وہ چاروں بیٹھے تھے۔ یہ حکم داد، اس کے دونوں بیٹے، سائیں رکھیو، مولا داد اور ایک زرخرید اور جہنم واصل موجا خان کا نام نہاد عزیز گہرام خان تھا...... زمیندار حکم داد کے علاوہ باقی تینوں کے بشروں سے ایک عجیب سی خوشی ٹپک رہی تھی جبکہ زمیندار حکم داد کا چہرہ سپاٹ کسی سوچ میں غلطاں تھا۔

''ہم تو شیر آیا...... شیر آیا والی بات سمجھ بیٹھے تھے...... یہ تو گیدڑ والی ثابت ہوئی۔'' سائیں رکھیو اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے قدرے استہزائیہ انداز میں بولا تو مولا داد گہرام خان نے کچھ سمجھ میں آنے والے انداز سے چونک کر سائیں رکھیو کی طرف دیکھا مگر جہاندیدہ زمیندار حکم داد نے اپنے بیٹے کے استہزائیہ تبصرے میں چھپے ایک اطمینان کو بھانپتے ہوئے ایک نگاہ اس پر ڈالی جیسے وہ چالیس سالہ سائیں رکھیو ابھی طفل مکتب تھا...... وہ اس کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا لہٰذا کھر کھراتے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''عاقل خان کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں پٹ رکھیو......! تمہاری نگاہ طفل میں اگر وہ شیر سے گیدڑ بن گیا ہے تو یہ مت بھولو زخمی اور بھوکا گیدڑ بھی کبھی کبھی شیر سے جا بھڑتا ہے۔'' زمیندار حکم داد کی کھری گفتگو میں ایک تادیب تھی...... مولا داد اور گہرام خان اب بات کی تہہ تک پہنچے تھے لہٰذا مولا داد نے بھی لب کشائی کرتے ہوئے باپ سے کہا۔

''پر بابا سائیں......! عاقل خان اب ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے...... ہم تو سمجھے تھے کہ عاقل خان کے آتے ہی ہمارے اور اس کے بیچ ایک جنگ کا آغاز ہو جائے گا مگر آپڑیں ادی ہدایتاں تو تیار ہی تھی کہ اس نے اپنے مڑس (خاوند) کو اعتماد میں لے لیا ہے جبھی تو اسے یہاں آپڑیں میکے آنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔''

''لیکن باوجود اس کے میرا خیال ہے سائیں وڈے کی بات صحیح ہے۔'' مولا داد کی

بات سن کر گہرام نے اچانک زمیندار حکم داد کی دور اندیشانہ بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ قادر بخش کو کیوں بھول رہے ہو......؟ جس کے سینے پر اس وقت ہم سب حتیٰ کہ ادی ہدایتاں بھی سانپ کی طرح لوٹ رہے ہوں گے...... کہنے کا مطلب یہ کہ وہ کسی بھی وقت آپڑیں وڈے بھرا عاقل خان کو ہمارے خلاف ورغلا سکتی ہے۔''

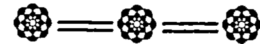
''بالکل درست کہا تم نے گہرام۔'' زمیندار حکم داد اس کی طرف دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں بولا۔ ''بلکہ مجھے تو اس بات کا بھی شک ہو چکا ہے کہ دونوں بھائی کوئی میٹھی چال چلنا چاہتے ہیں۔''

زمیندار حکم داد نے اپنی بات مکمل کی تو وہ تینوں تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلانے لگے۔ پھر چند ثانیے کے بعد بالآخر سائیں رکھیو ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے معنی خیز ''ہوں'' کا لاحقہ نتھی کر کے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے پھر ہمیں اپنی سازش کے تار کو وہیں سے جوڑنا پڑے گا جہاں سے توڑا تھا یعنی قادر بخش کو موجا خان والے قتل کیس میں پھنسا کر دونوں بھائیوں کو الجھائے رکھنا۔'' اس بار بیٹے کی بات پر زمیندار حکم داد نے اتفاق کیا اور تائیدی لہجے میں بولا۔ ''ہاں......! ایسا ہی ٹھیک رہے گا لیکن چونکہ جس طرح وہ دونوں بھائی میٹھی چھری تانے ہم سے تعلقات بحال رکھنا چاہ رہے ہیں اس طرح بظاہر ہم بھی ان کے خلاف کوئی کارروائی کرتے ہوئے خود کو سامنے نہ لائیں مگر ہمارے کمر کے پیچھے ہاتھوں کی مٹھی میں خنجر ضرور دبا ہوا رہنا چاہئے۔'' اس کی بات کا مفہوم وہ تینوں اچھی طرح جان گئے تھے بالخصوص گہرام خان کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی اور تب جیسے زمیندار حکم داد اسے خاص ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ ''گہرام خان......! اب کھلے بندوں خود کو ہمارے قریب مت رکھو اور جتنا ہو سکے سوائے ضروری کام کے قاتلوں سرمد اور خاص طور پر قادر بخش کے خلاف کارروائی جاری رکھو مگر در پردہ ہم بھی ڈوریاں ہلاتے رہیں گے...... انسپکٹر مراد خان اب آپڑاں ماڑوں (اپنا آدمی) بن گیا ہے۔'' یہ سن کر گہرام خان کے باریک ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔



قادر بخش کے دل و دماغ سے اب ایک بوجھ اتر گیا تھا...... بڑے بھائی عاقل

خان کے برتاؤ سے پہلے وہ یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ خواب غفلت میں کھو گیا ہے مگر ایسی بات نہ تھی، اس کی طرح وہ بھی بھٹائی ہاؤس کے اندر اور باہر ہونے والی مخالف سازشوں کے باریک تاروں کو تاڑ چکا تھا اور جیسی غیظ وغضب، تاسف اور ملال کی آگ قادر بخش کو اپنے سینے میں محسوس ہوتی تھی، وہی اب اس نے بھی اپنے بڑے بھائی عاقل خان کے اندر بھی سلگتی محسوس کر لی تھی ...... اس طرف سے قدرے بے فکر ہوا تو اسے کونجاں کا خیال آیا اور ساتھ ہی یہ تلخ بات بھی اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آئی کہ جو حرکت بدطینت اور جہنم واصل موجا خان زمیندار حکم داد کے ساتھ مل کر کر رہا تھا، اب وہی گھناؤنی اور ذلیل حرکت گہرام خان کر رہا تھا۔ یعنی معصوم کونجاں کا رشتہ لینے کے لئے وہ اب اس کے بوڑھے باپ مٹھن ہاری پر دن بدن دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا ...... قادر بخش جانتا تھا کہ گہرام خان جس نے خود کو موجا خان کا نام نہاد عزیز شو کر رکھا تھا، درحقیقت وہ زمیندار حکم داد کا ہی آدمی تھا البتہ قادر بخش کو اس بات پر حیرانگی ضرور ہوئی تھی کہ آخر زمیندار حکم داد معصوم کونجاں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا تھا، اس کا آخر کیا مقصد تھا......؟ وہ موجا خان کے ایک فرضی عزیز کے روپ میں گہرام خان کو معصوم کونجاں کا شوہر کیوں بنانے پر تلا ہوا تھا......؟ یہ سارے رمز ابھی پردے میں تھے۔ بہرطور کچھ بھی تھا، قادر بخش اب پکا تہیہ کر چکا تھا کہ وہ ہر قیمت پر کونجاں کو حاصل کر کے ہی رہے گا تاکہ اس کے خلاف پے در پے کھیلے جانے والے گھناؤنے ڈراموں کا خاتمہ ہو سکے ...... وہ اپنی بغیر ہڈ والی جیپ میں سوار ہو کر بھٹائی ہاؤس کے کوٹ نما احاطے سے باہر نکلا اور جیپ ایک کچے راستے پر ڈال دی، ابھی وہ بمشکل تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ دفعتاً سامنے سے پولیس کی گاڑی دھواں اڑاتی ہوئی اس کا راستہ روکے آن کھڑی ہوئی ...... گرد وغبار کے بگولے ذرا تحلیل ہوئے تو قادر بخش، انسپکٹر مراد خان کو پھرتی سے اترتے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔



انسپکٹر مراد خان کے جوشیلے انداز میں جیپ سے کودتے ہی تین منحنی سے پولیس والے بھی کدکڑا مار کر نیچے اتر آئے۔ ان تینوں میں سے ایک کے ہاتھ میں آہنی ہتھکڑیاں سوئمبر کے ہار کی طرح جھول رہی تھیں۔

قادر بخش ہنوز اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر جما بیٹھا تھا اور آنکھیں سکیڑے انسپکٹر کو اپنی جانب آتے ہوئے گھور رہا تھا۔ البتہ اس کے اندر اندیشناک دھکڑ پکڑ جاری تھی۔

''نیچے اترو قادر بخش......'' مراد خان نے اس کے چہرے پر تیز نظریں جماتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ قادر بخش کو نہ صرف اس کا انداز تخاطب اور لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا بلکہ اس کی کینہ توز انداز میں سکڑی ہوئی آنکھوں میں عجیب معاندانہ چمک بھی دکھائی دی۔

قادر بخش کے ہونٹ بھنچے ہوئے اور دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ تاہم وہ اپنی برماتی ہوئی نظریں انسپکٹر مراد خان پر مرکوز رکھے نیچے اتر آیا اور اسی لمحے ہتھکڑیاں تھامے ہوئے ایک مذکورہ سپاہی نے آگے بڑھ کر قادر بخش کو گرفتار کرنا چاہا قادر بخش نے بھنا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور قدرے درشت لہجے میں انسپکٹر کو گھورتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے...... جانتے نہیں میں کون ہوں؟''

''کوئی فائدہ نہیں اب...... اس اکڑفوں کا سائیں قادر بخش...... تمہیں اب خود کو قانون کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔'' انسپکٹر زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''میرا قصور کیا ہے؟'' قادر بخش نے پوچھا۔

''اتنے تو بھولے نہ بنو سائیں......! چلو کم از کم ہمیں اپنے یار غار کے بارے میں بتا دو۔ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟'' انسپکٹر کے لہجے میں استہزا تھا۔

قادر بخش کھول اٹھا......مگر وہ انسپکٹر مراد خاں کی آنکھوں میں فیصلہ کن اور فوری عمل کی ایسی چمک بھانپ چکا تھا جس نے اسے معتدل رہنے پر مجبور کئے رکھا۔ وہ بولا۔

''یہ پتہ چلانا تم لوگوں کا کام ہے۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔'' انسپکٹر اس کی بات سن کر بہ غور سنسنی خیز لمحاتی انداز میں چند ثانیے اس کی طرف گھورتا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کندھے اچکا کر بولا۔

''اچھا......ٹھیک ہے پھر......آپ......ایسا کریں ہمارے ساتھ تھانے چلیں۔ مزید باتیں وہیں ہوتی رہیں گی۔ خیال رہے مجھے تمہیں قانونی زیور پہنا کر تھانے لے جانے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ میں آج بھی مرحوم سردار شیر دل سائیں کی عزت کرتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں حد درجے مکاری تھی۔

قادر بخش جانتا تھا، کل تک اسے ہاتھ لگانے سے کترانے والا ہڈی خور انسپکٹر آج اس کے باپ کے مرتے ہی اس کے سامنے دانت نکوسے کیوں کھڑا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ...... میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔'' قادر بخش نے مصلحت آمیز حکمت عملی اپنائی اور پھر وہ اپنی جیپ میں سوار ہو کر ان کے ہمراہ تھانے کی طرف ہو لیا۔



سرمد نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ سیدھی سادی شریفانہ اور غریبانہ زندگی گزارتے گزارتے اچانک جرائم کی راہ پر چل نکلے گا۔ ایک عام اور غریب ہاری سے نامی گرامی بدنام ڈاکو نظرو کے خطرناک گروہ میں شامل ہو کر انہی کی طرح لوٹ مار کا بازار گرم کر دے گا۔

اس میں اس کا کیا قصور تھا...... یہ تو حالات کا وہ دھارا تھا جس نے سرمد جیسے عام دیہاتی نوجوان کو تیز و تند لہروں کے سپرد کر ڈالا تھا۔ وہ اب باقاعدہ اس گروہ میں شامل ہو کر...... ہر طرح کی تربیت حاصل کر چکا تھا۔ چاہے وہ انڈس ہائی وے میں کسی لگژری مسافر کوچ کو لوٹنا ہو...... یا کسی بھاری شخصیت کو بھاری تاوان کے عوض یرغمال بنانے کا کام ہو۔

ایک دو بار ان کا پولیس مقابلہ ہوا۔ انہیں دوبارہ اپنا ٹھکانہ بدلنا پڑا۔ بہر حال اب وہ ایک پختہ کار دھاڑیل (ڈاکو) بن چکا تھا۔ مجبور اور بے بس انسان کو یکدم طاقت نصیب ہو جائے تو یہ بھی ایک المیہ ہوتا ہے کہ پھر وہ معاشرے سے دل کھول کر انتقام لیتا ہے...... سرمد بھی یہی چاہتا تھا۔ موجا خان کو قتل کرنے کے بعد بھی اس کے انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔

زمیندار حکم داد کو وہ بھلا کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی کو تند خو موجوں کے حوالے کرنے والا اصل شخص تو وہی تھا۔ موجا خان تو اس کا ایک عام مہرہ تھا۔ اس نے ابھی نظرو دھاڑیل کو اپنے ''اصل'' دشمن زمیندار حکم داد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ نظرو دھاڑیل یہی سمجھ رہا تھا کہ سرمد نے اپنے دشمن موجا خان کو ہلاک کر کے اپنا انتقام لے لیا ہے۔

زمیندار حکم داد کا چہرہ ذہن میں ابھرتے ہی جانے کیوں اسے ایک بے نام سی بے چینی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ موجا خان کو قتل کرنے کے بعد بے فکری کی نیند سو گیا ہو۔ اس نے قتل کے بعد سے اپنے گھر کا بھی رخ نہیں کیا تھا۔ آج جبکہ بار بار اس کے چشم تصور میں بدطینت زمیندار حکم داد کا چہرہ گردش کرنے لگا کہ بے اختیار اس نے رات کے تاریک نصف پہر میں اپنے گھر جا کر باپ مٹھن اور بہن کونجاں کی خیر خیریت معلوم کرنے کا ارادہ کیا۔

''اکیلا نہ جا تو اچھا ہے۔ اپڑیں ساتھ......صوبے کو لے جا......'' نظرو دھاڑیل کو جب اس کے ارادے کا پتہ چلا تو اس نے سرمد کو مشورہ دیا۔

''نہیں......! میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ کون سا دھاڑا (ڈاکا) ڈالنے جا رہا ہوں۔ ویسے ڈھاٹا باندھ کر جاؤں گا۔ بپو اور ادی کونجاں کی خیر خیریت معلوم کر کے فوراً لوٹ آؤں گا۔'' سرمد نے کہا تو نظرو چپ ہو رہا۔ اس میں یہ ایک اچھی بات تھی۔ وہ سرمد کو زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

اس کے بعد سرمد جنگل ڈیرے سے نکل پڑا۔

اس نے سیاہ رنگ کی قمیض اور کھلے پائینچوں اور گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ چہرے پر اس نے اب داڑھی اور گھنی مونچھیں بھی سجا لی تھیں۔ اس وقت وہ کاندھوں پر

اجرک اوڑھے ہوئے تھا جس کے افقی سرے سے 32 بور بندوق کی سرونال کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

وہ گھوڑے پر نکلا تھا۔ گوٹھ وسند خان گورکھ ہل اور ڈبلائی کی پہاڑیوں کے پیچھے تھا ...... جبکہ خود اس کا جنگل ڈیرا ...... دریائے سندھ کے بائیں کنارے وہ آگے بڑھنے لگا۔ چاروں طرف تاریک رات کا سائیں سائیں کرتا سناٹا طاری تھا۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ فضا بڑی دلفریب اور راحت آمیز ہواؤں میں گندھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر سرمد گھوڑے کو روک کر خود نیچے اتر آیا۔ گھوڑا بالکل سیاہ اور صحت منداصیل تھا۔ سرمد نے پہلے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا پھر اس کی پیشانی پر مخصوص انداز میں ہاتھ گھماتے ہوئے بولا۔ ''ٹکری ......! ادھر سے ہلنا مت ...... میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہنے کے بعد سرمد نے ایک توبڑا ...... گھوڑے کے تھوتھنے پر باندھ دیا۔ اس کے اندر چارہ تھا۔ گھوڑا آرام سے توبڑے کے اندر جگالی کرنے لگا۔

سرمد نے آخری الوداعی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر نیم باز انداز میں مسکراتا ہوا تاریکی میں گم ہوگیا۔

نصف فرلانگ کے بعد وہ اپنے گوٹھ کی عقبی سرحد کے قریب کھڑا تھا۔ اب وہ اپنے قرب و جوار سے محتاط ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے کسی بات کا خدشہ نہ تھا ماسوائے جنگلی کتوں کے ...... جو اسے دیکھتے ہی بھونک بھونک کر آسمان سر پہ اٹھا لیتے ...... لیکن وہ بھی اس گوٹھ اور دھول اڑاتے کچے راستوں کا پروردہ تھا۔ جانتا تھا ...... کتوں کے بدمست غول کدھر ...... نیم غنودہ تھوتھنیاں دبکائے بیٹھے ہوں گے۔ وہ ''پرامن'' راستہ اختیار کرتے ہوئے بوسیدہ اور کچے مکانوں کی بے ترتیب قطاروں والی تاریک گلی میں آن گھسا۔

دو گھر چھوڑ کر ...... تیسرا گھر اس کا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پیوند زدہ ٹاٹ اٹھا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیسری بار کھٹکھٹانے پر اندر کسی کے کھانسنے کی آواز کے ساتھ ہی بہ آواز بلند کسی نے پوچھا۔ ''کیرآ ...... بابا......؟ (کون ہے بھئی)''

''بابا ...... در کھول ...... میں ہوں ...... سرمد......'' سرمد اپنے باپ مٹھن کی آواز پہچان کر بولا اور تب جیسے اچانک ہی کسی نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے نیم تیرگی میں اس کے باپ کا جھریوں بھرا متحیر چہرہ جس پر غم اور ژولیدگی کی چھائیاں اس کے بڑھاپے کو مائل بہ لحد کرتی محسوس ہو رہی تھیں ...... نظر آیا بیٹے کو دیکھ کر اس کے نحیف وجود میں ارتعاش ابھرا۔

''پپ ...... پٹ ...... سرمو......!'' وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ سرمد ...... غڑاپ سے اندر آ گیا۔

بوسیدہ صحن ویران تھا، صرف ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی ...... جھلنگا سی ...... اوپر میلی چیکٹ رلی ......

''آ ...... آ ...... اندر ...... آ جا......'' مٹھن کپکپاتی آواز میں سرمد کا بازو پکڑے کوٹھڑی میں لے آیا۔ اندر دو چارپائیوں پر ایک بوڑھی عورت اور جوان لڑکی رلی اوڑھے سو رہی تھیں۔ ان دونوں کو پرسکون نیند میں ڈوبا دیکھ کر سرمد کے حلق سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوئی۔

یہ اس کی بوڑھی ماں اور بہن کونجاں تھیں۔ مٹھن نے اپنی بیوی کو جگانا چاہا مگر سرمد نے ہاتھ کے اشارے سے باپ کو منع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے پہلے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا اور یہی عمل اپنی بہن کونجاں کے ساتھ دہرایا۔

پھر باپ سے بولا تو اس کی آواز میں رقت تھی۔ ''آؤ ...... بابا ...... باہر بات کرتے ہیں ...... میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ حیران و پریشان کھڑے باپ کا جواب سنے بغیر اجرک کاندھے پر درست کرتا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

مٹھن کو جانے کیوں بیٹے کی آواز میں ایک عجیب جوش آمیز سنجیدگی محسوس ہوئی۔ وہ ہونق سا بنا اپنی بوسیدہ لاک سنبھالتا ہوا صحن میں آ گیا۔

سرمد وہاں پہلے ہی چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ اپنی بندوق اس نے اپنے قریب ہی پٹی سے ٹکا دی تھی۔ اس کے باپ کی ابھی نظر بندوق پر نہیں پڑ سکی تھی۔ پڑتی بھی کیسے وہ بیچارہ تو اتنے عرصے بعد بیٹے کی ترسی ہوئی صورت دیکھ کر گرد و پیش سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ بیٹے کے سوا اس کی بوڑھی اور کمزور آنکھوں میں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

تب پھر کیا ہوا...... بے اختیار مٹھن کا دل بھر آیا۔ وہ آگے بڑھا، سرمد کے قریب ہی چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہی بیٹے کو گلے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

سرمد بھی اپنے سینے میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بحرِ غم کی منہ زور لہروں جیسے آنسوؤں کو نہ روک سکا...... اور پھر مٹھن کو اپنا کاندھا...... آبِ اشک سے گیلا ہوتا محسوس ہوا۔

''تو...... کدھر چلا گیا تھا...... سرمو...... اب نہ جانا...... اس بڈھے میں اب اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ اپنے کڑیل پٹ کی پھر جدائی سہے۔'' مٹھن گلوگیر لہجے میں بولا۔

دردِ نہاں کے وہ سارے زخم جو اس نے جانے کس طرح اپنے بوڑھے وجود کے پنجر میں خار کی طرح پیوستہ رکھے تھے، اب آنسوؤں کی صورت ایک ایک کر کے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ سرمد باپ کی آزردگی محسوس کر کے کٹ کٹ سا گیا۔ وہ اب الگ ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔

''بابا...... تو میرا غم نہ کیا کر...... میں اب آتا رہوں گا ملنے...... دیکھ...... مجھے تیرے سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں...... مجھے جلدی ہے۔'' سرمد نے کہا۔

''ک...... کیا...... تت...... تو پھر چلا جائے گا۔'' مٹھن اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے دکھ آمیز لہجے میں بولا۔

''میں نے کہا نا...... میں آتا رہوں گا۔ میری گڑتی نہ کیا کر......''

''پر تو جا کیوں رہا ہے۔ اب واپس...... اور...... اور کہاں......'' مٹھن رکا پھر جلدی سے خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''تت...... تو...... اب آ جا...... تیکوں (تجھے) اب چھپنے کی لوڑ (ضرورت) نہیں...... اس مردود موجا خان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پر......'' اتنا کہتے ہوئے ایک بار پھر مٹھن اپنی بات کاٹ کر چپ ہو رہا اور بیٹے سے اپنے چہرے پر ایکا ایکی ابھر آنے والی پریشانی کو چھپائے خاموش ہو رہا۔

سرمد کے دل پر گھونسا سا لگا۔ ''موجا خان قتل ہو گیا تھا تو پھر...... پھر اس کا باپ خوش ہوتے ہوئے اچانک مغموم ہو کر چپ کیوں ہو گیا تھا۔'' اس سوال نے سرمد کی تمام حسیں بیدار کر دیں جو اس کے پورے وجود میں لاوے کو اچھالنے لگیں۔

''کیا بات ہے...... بابا...... تو چپ کیوں ہو گیا۔''

''کچھ نہیں...... بس ویسے ہی میں پریشان ہو گیا تھا ذرا...... کیونکہ...... موجا خان کے قتل میں پولیس کو تجھ پر شبہ ہے...... اور وہ...... تیرے کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے...... پر تو...... گڑتی نہ کر...... تو آ جا ادھر...... پولیس سے بھی معاملہ طے کر لیں گے۔''

''نہیں...... بابا...... اب میرا لوٹنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس مردود موجا خان کو میں نے ہی جہنم واصل کیا۔'' سرمد نے سرد لہجے میں کہا تو اس کا باپ منہ کھولے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

بیٹے کی آنکھوں میں قہرِ انتقام کی کڑکتی بجلیوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے تو......؟''

اسے اپنے کانوں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ موجا خان کے قتل کے بعد سے ہی مٹھن نے گوٹھ میں اڑتی ہوئی یہ افواہیں سنی تھیں کہ موجا خان کو سرمد نے ہی قتل کیا ہے۔ اسے توقع نہ تھی کہ...... سرمد یوں بے دھڑک اس قتل کا اعتراف کر لے گا۔

ادھر جواباً سرمد چپ رہا۔

مٹھن اپنا ماتھا مسلنے لگا تو سرمد گمبھیر لہجے میں باپ سے بولا۔ ''بابا......! یہ باتیں رہنے دے...... مجھے بتا...... تم لوگوں کو پھر وہ کمینہ زمیندار حکم داد تنگ تو نہیں کرتا۔''

بیٹے کی بات پر مٹھن کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا...... اور ساتھ ہی اس کے نئے چیلے جس نے موجا خان کی جگہ سنبھال لی تھی، وہ گہرام خان...... یہ وہ شخص تھا جو خود کو موجا خان کا عزیز ظاہر کرتے ہوئے اب کونجاں کے رشتے کا دعویدار تھا۔ اگرچہ باقاعدہ طور پر اس سلسلے میں زمیندار حکم داد اور گہرام خان نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی...... البتہ کچھ روز پہلے اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اسے یہ پیغام بھیجا تھا کہ وہ کونجاں کا رشتہ محفوظ رکھے۔ یہ پیغام سن کر مٹھن سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کونجاں کی حالت بھی دگرگوں ہو گئی تھی لیکن اب مٹھن کو یہ تلخ حقیقت اپنے کڑیل اور جوشِ غیرت کی آگ میں جلتے ہوئے بیٹے کو بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ شاید اس امر کا اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کے بیٹے پر ''کارو'' کا جو جھوٹا الزام کسی مہر کی طرح ثبت

ہو چکا تھا...... اس نے اس کی زندگی کا انداز ہی بدل دیا تھا۔ موجا خان کو قتل کرنے کے بعد وہ گم کردہ راہوں کا مسافر بن چکا تھا۔ لہٰذا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک نئے کردار کے بارے میں بیٹے کو بتا کر اس کے ہاتھ کی لکیروں میں ایک اور قتل کی لکیر کھینچے۔

"پٹ...... ! ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ زمیندار حکم داد خاموش ہے...... دوبارہ وہ یہاں نہیں آیا ہے۔" خاصے طویل وقفے کے بعد بھی باپ کے ہونٹوں سے یہ بات سن کر سرمد کی تیز نظروں نے اس کے جھریوں بھرے چہرے کا رمز دروں بھانپ لیا تھا کہ اس کا باپ سچ نہیں بول رہا تھا مگر سرمد کو اس کی بھی خاص پرواہ نہیں تھی۔

وہ ایک لمحہ تو اپنے گھر والوں بالخصوص اپنی جوان بہن کونجاں کے سلسلے میں بے خبر نہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا باپ لاکھ چھپائے مگر...... اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

وہ یکدم جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی اپنی بندوق کمر پر چڑھا لی اور باپ کو سلام کر کے باہر نکل گیا۔ عقب میں مٹھن ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔

باہر پہر رات کا سناٹا جوں کا توں موجود تھا۔ سرمد اجرک کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے نیم تیرگی میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں کی رفتار سست تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ کونجاں کے مستقبل کے بارے میں پریشان تھا۔ وہ جلد سے جلد کسی شریف لڑکے سے اپنی بہن کا بیاہ کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا بہ صورت دیگر اس کے گھر کی چہار دیواری کے گرد غلیظ گدھ منڈلاتے رہیں گے۔

یہ خیال آتے ہی سرمد کے دل میں اچانک اپنے دوست قادر بخش کی شبیہ ابھری۔ اسے ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے دوست سے شرمندہ تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ قادر بخش کتنا اس کے لئے پریشان ہو رہا ہوگا...... اور یقیناً اس سے ملنے کے لئے بے چین بھی ہوگا۔ تب سرمد نے قادر بخش سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھیس بدل کر اس سے دن میں ملنا چاہتا تھا۔ رات تیزی سے اپنا سفر انجام تک پہنچا رہی تھی۔

❀

اس رات بے چارہ مٹھن دوبارہ نہیں سو پایا تھا۔ رات کا بقیہ نصف حصہ اس نے پریشان کن سوچوں میں بتا دیا تھا۔ اس کے گھبرو اور غیرت مند بیٹے نے جس انداز میں اس سے یہ سوال پوچھا تھا کہ "بابا وہ مردود زمیندار حکم داد یا اس کے گماشتے تم لوگوں کو ستاتے تو نہیں ہیں۔" یہ سن کر مٹھن نے جھوٹ بول کر انکار تو کر دیا تھا...... لیکن اس کا ادراک اسے بھی تھا کہ سرمد تاریک جنگلوں کا باسی ضرور بن چکا ہے مگر وہ ان سے ایک لمحہ بھی بے خبر نہیں رہا۔ لہٰذا اس سے یہ بات بھی زیادہ دیر نہیں چھپی رہ سکتی تھی کہ اب موجا خان کے بعد بد باطن زمیندار حکم داد نے گہرام خان کو میدان میں اتار دیا تھا۔ کونجاں کا رشتہ ہر قیمت میں لینا اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا...... یا پھر اس کا کوئی مفاد تھا کہ ہر صورت کونجاں کا رشتہ لینا چاہتا تھا۔

"بابا...... تو سویا نہیں...... لگتا ساری رات جاگتا رہا ہے؟" کونجاں نے اچانک پوچھا تھا۔ وہ منہ اندھیرے ہی اٹھنے کی عادی تھی۔ آج کل کھیتوں میں دونوں باپ بیٹی جایا کرتے تھے۔ اس کی ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ بیٹے کی وجہ سے اس کی مستقل رہنے والی پریشانی نے اسے بیمار کر دیا تھا۔

"آں...... نا...... نہیں...... بس...... یونہی پٹ سرمد......" اس نے چونک کر بے ربط الفاظ میں کہا اور پھر سرمد کا نام لیتے لیتے رک گیا۔ وہ کچھ بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔ کونجاں یہی سمجھی تھی کہ بیٹے کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے نیند نہیں آ گئی ہوگی۔ اس کے نازک چہرے پر بھی بھائی کا نام اداسی بکھیر گیا تھا۔

"بابا......! تو پانی کے چھینٹے مار لے...... میں تیرے لئے مانی (روٹی) لاتی ہوں۔" کونجاں اپنے دکھ کو گہرائی سے بچاتے ہوئے بات پلٹ کر بولی۔

"نا دھیئے......! بس تو صرف چاں (چائے) لے آ......" مٹھن نے چارپائی سے بمشکل اٹھتے ہوئے کہا اور پھر جب وہ منہ ہاتھ دھو کر کاندھے پر دھرے اپنے میلے چیکٹ انگوچھے سے منہ وغیرہ پونچھتے ہوئے دوبارہ چارپائی پر بیٹھا تو اتنے میں کونجاں ایک بوسیدہ سے پیالے میں چائے اور بڑا سا چھابہ لے آئی۔ اس میں رات کی بچی چاولوں کی روٹی تھی جسے تھوڑا دیسی گھی لگا کر کونجاں نے توے پر گرم کر دیا تھا۔

"آ جا...... تو بھی میرے ساتھ بیٹھ کر مانی کھا......" مٹھن نے چائے کی چسکی

بھرتے ہوئے کہا۔ ناچار کونجاں بھی وہیں بیٹھ کر ''ناشتہ'' کرنے لگی۔

''دھیئے......! رات سرمد آیا تھا۔'' مٹھن نے ہولے سے کونجاں بتایا۔

''کک......کیا......بابا......ادا سرمو چاک ٹھیک تو تھا نا......تو نے تو...... نے مجھے کیوں نہیں جگایا بابا......'' کونجاں غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے روہانسی ہو گئی۔

''وہ جلدی میں تھا۔ ویسے بھلا چنگا تھا۔''

''کک......کیا کہہ رہا تھا۔ ادا سرمو...... وہ...... وہ اب ہمارے ساتھ...... رہے گا پہلے کی طرح......؟''

''ہاؤ...... اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔ اتنا کہہ رہا تھا کہ ہمیں کوئی پریشان تو نہیں کرتا۔''

کونجاں نے یہ سنا تو باپ کے چہرے پر نظریں جما کر گہرے لہجے میں بولی۔

''پھر......تو نے کیا جواب دیا؟''

''کیا جواب دیتا...... اسے بتا دیا کہ اس مردود زمیندار حکم داد نے ابھی تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑا ہے تاکہ سرمو موجا خان کی طرح اسے بھی قتل......''

''بابا......آہستہ بول...... میرا ادا خونی نہیں ہوسکتا۔'' کونجاں نے باپ کو ٹوکا۔

باپ کی بات سن کر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے سرمد کو یہ حقیقت نہیں بتائی تھی۔

ذرا دیر کو دونوں خاموش رہے۔ فضا میں صبائے سحر خیزی رچنے لگی تھی۔ آسمان ملگجا ہونے لگا تھا۔ فجر کی اذان قریبی مسجد سے بلند ہو رہی تھی۔ دور کہیں آٹے کی چکی کی پک...... پک...... پک کی آواز شروع ہو چکی تھی۔ ساری رات ویران پڑے دھول اڑاتی کچی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں آباد ہونے لگی تھیں۔ مرد، عورتیں حتیٰ کہ بچے بوڑھے سبھی کھیتوں میں مشقت کے لئے نکل پڑے تھے۔

دونوں باپ بیٹی خاموشی سے ''ناشتہ'' ختم کر کے چارپائی سے اٹھے تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز اس قدر اچانک تھی کہ ایک لمحے کو دونوں باپ بیٹی کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' مٹھن بڑبڑایا اور پھر ساتھ ہی چلا کر بولا۔

''کیرآ...... بابا......؟'' (کون ہے بھئی)

''اڑے در کھول مٹھن...... آ پڑاں بھوتار سائیں آیا ہے۔'' دوسری طرف سے کرخت آواز ابھری تو مٹھن کا دل اندیشناک انداز میں یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کونجاں بھی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اگلے ہی لحظہ مٹھن نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

سامنے ایک گھنی داڑھی مونچھوں والا شخص بڑے کروفر کے ساتھ کھڑا مٹھن کو گھورے جا رہا تھا۔ اس نے اجلا سفید کرتہ اور گھیر والی کاٹن کی شلوار پہن رکھی تھی۔ کاندھوں پر اجرک اور بغل میں ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک منحنی سا شخص بھی کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں شکرے ایسی چمک تھی۔ تیسرا شخص منشی ٹائپ نظر آ رہا تھا۔ یہ زمیندار حکم داد اور گہرام خان تھے۔

''س...... سائیں وڈا...... آ...... آپ......'' مٹھن کے ہونٹ کپکپائے۔ اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔

''اڑے مٹھن...... پرے ہو...... سائیں بھوتار کو اندر آنے تو دے'' معاً نوکر ٹائپ شخص نے کڑک دار لہجے میں کہا اور مٹھن یوں پرے ہٹ گیا جیسے نوکر کی آواز نے اس میں بجلی سرایت کر دی ہو۔

''بھب......بھلی کرے آیو سائیں بھوتار...... اچو...... اچو......'' یہ کہتے ہوئے مٹھن نے ہاتھ جوڑ دیئے اور زمیندار حکم داد اور گہرام خان بڑے طنطنے کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ سامنے کونجاں کی ان پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے سر پر اجرک درست کرتی ہوئی اندر کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اندر سے دروازہ بند کرتے ہی وہ بند دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر چپک گئی۔ دوسری چارپائی پر اس کی ماں ہنوز بے سدھ لیٹی خراٹے لے رہی تھی۔

''اڑے مٹھن......! تو بڑا مغرور ہو گیا ہے ڑے...... ہمارے پیغام کا تو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ہمیں خود آنا پڑا۔'' زمیندار حکم داد مٹھن کے چہرے کی طرف گھور کر گونجیلی آواز میں بولا۔ وہ کھڑے کھڑے ہی لرزتے کانپتے مٹھن سے مخاطب

تھا۔ نا ہی مٹھن کو ہمت پڑ رہی تھی کہ وہ زمیندار حکم داد جیسے شخص کو میلی کچیلی اور جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھنے کا کہتا۔ تاہم حکم داد کی بات اور لہجے کی کاٹ نے اسے لرزا دیا۔ وہ بدستور اپنے دونوں ہاتھ جوڑے گڑگڑانے کے سے انداز میں بولا۔

''بس...... سائیں بھوتار......! ہم گریبوں کے پاس غرور کرنے کے لئے بھلا ہے ہی کیا...... آ...... آپ کا پیغام میکوں مل گیا تھا۔ میں ذرا سوچنے کی مہلت......''

''اڑے بابا...... کیا بکواس کرتا ہے تو......'' زمیندار گرجدار لہجے میں دھاڑ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو ایک ساعت کو بے چارے مٹھن کو اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ''سوچنا کس بات کا بابا...... موجا خان کو تو...... تیرے اس ''کارے'' (بدکار) پٹ سرمو نے قتل کر دیا ہے۔ پر تو کیا سمجھتا ہے...... معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔ سرمو کو پولیس تلاش کر رہی ہے اور بہت جلد وہ گرفتار بھی ہو جائے گا مگر اب تو یہ مت سمجھ کہ...... کونجاں والے رشتہ کی بات ختم ہو گئی ہے۔'' زمیندار نے ایک سفاکانہ انکشاف کیا۔

پھر مٹھن کی توجہ گہرام خان کی طرف دلانے کے لئے تحکمانہ لہجے میں اس سے بولا۔ ''اسے دیکھ رہا ہے ناں بابا...... یہ مرحوم موجا خان کا سگا چچازاد ہے۔ اب اصولی طور پر...... موجا خان کے بعد یہی تیری کونجاں سے بیاہ کا حق رکھتا ہے۔'' اس نے اتنا کہا تو بے چارے مٹھن کی جو حالت ہوئی سو ہوئی اندر کوٹھڑی کے دروازے کی جھری سے اپنی آنکھ چپکائے کونجاں بھی بری طرح دہل کر رہ گئی۔ بے چارے مٹھن سے تو جواباً کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ البتہ...... زمیندار از خود ہی اپنا فیصلہ مسلط کرتے ہوئے بولا۔ ''تو ٹھیک ہے پھر...... ہم چاند کی ستائیس تاریخ کو جنج (بارات) لے کر آ جائیں گے۔ سمجھ گیا نا بابا تو......'' اتنا کہہ کر وہ گم صم کھڑے مٹھن کا کوئی جواب سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔



دونوں بھائی خاموش نظروں سے سامنے بیٹھے ہوئے انسپکٹر چوہدری خرم کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس سے کچھ سننے کو منتظر تھے۔ انسپکٹر چوہدری صبح گیارہ بجے اپنی سرکاری جیپ میں بھٹائی ہاؤس پہنچا تھا۔ اس وقت عاقل خان تھانے اپنے چھوٹے بھائی قادر

بخش کو چھڑانے کے لئے گیا ہوا تھا۔ لگ بھگ دو گھنٹوں کے بعد عاقل خان کی واپسی ہوئی تو اس کے ہمراہ قادر بخش بھی تھا۔ عاقل خان انسپکٹر چوہدری خرم کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا، چھوٹتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

''انسپکٹر صاحب...... بھلی کرے آیو...... اس مجرم کا کیا بنا...... اس نے کچھ بتایا۔'' اس کا مطلب موگو سے تھا جس نے پازیب پر دو مرتبہ جان لیوا قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

''ارے عاقل صاحب...... چھری کے نیچے ذرا دم تو لینے دو...... ابھی بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر چوہدری خرم نے گویا اپنی خجالت کو مذاق کی تہہ میں چھپانے کی کوشش کی لیکن عاقل خان بدستور استفسار طلب نظروں سے اس کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا...... اور پھر جب دوپہر کے کھانے کا دور ختم ہوا تو وہ تینوں نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گئے۔

ذرا دیر بعد انسپکٹر چوہدری خرم نے دھیمے دھیمے لہجے میں انتہائی معذرت کے ساتھ عاقل خان کو بتایا کہ ملزم موگو کو حوالات میں کسی نامعلوم فرد نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔

عاقل خان کو غصہ تو بہت آیا مگر چونکہ انسپکٹر چوہدری خرم مہمان بن کر آیا تھا اسی لئے وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے چپ ہی رہا۔

''اس کا مطلب ہے اب پولیس پھر اندھیرے میں بھٹکتی رہے گی۔'' ضبط کے باوجود عاقل خان نے دل کی تھوڑی بھڑاس نکالتے ہوئے انسپکٹر سے کہا تو انسپکٹر بھی شاید آج تمام جوابی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آیا تھا، کھنکارتے ہوئے بولا۔

''عاقل صاحب......! میں نے ایک دن کہا تھا ناں کہ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔ مجرم کی بو میں یہیں ہی سونگھ رہا ہوں۔'' عاقل خان قدرے چونکتی نگاہیں اس کے چہرے پر مرتکز کرتے ہوئے کسی گھمبیر سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ الفاظ اس نے پہلے بھی انسپکٹر کی زبانی سنے تھے مگر اس بار وہ اس بات پر تلملایا نہ تھا۔ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہی حال قادر بخش کا بھی تھا۔

انسپکٹر دونوں بھائیوں کے بشرے سے اپنی بات کی اثر پذیری کو بھانپتے ہوئے

مزید بولا۔ ''آپ کے والد گرامی سردار صاحب کی وفات کا بھی مجھے افسوس ہے۔ آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ میں آپ کے ہاں آنے سے پہلے متعلقہ تھانے بھی گیا تھا۔ وہاں انچارج انسپکٹر مراد خان میرا دوست ہے۔ اگرچہ کچھ اڑتی اڑتی افواہ میں نے تھانے میں بھی گردش کرتی سنی تھی کہ آپ کا زمیندار حکم داد سے بھی کوئی جھگڑا چلا آ رہا ہے جس کی بنیادی وجہ آپ کی متوقع دوسری شادی کا ارادہ ہے کیونکہ حکم داد آپ کی بیگم کے والد گرامی ہیں......'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہوا۔ عاقل اور قادر بخش بھونچکے سے رہ گئے۔

''آپ اب کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' لحظہ بھر خاموشی کے بعد بالآخر عاقل خان سپر ڈالنے کے سے انداز میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''تفتیش......'' انسپکٹر چوہدری خرم...... پراسرار لہجے میں مختصراً بولا۔

''کس سے......؟''

''زمیندار حکم داد کی بیٹی...... یعنی آپ کی بیگم سے...... اگر آپ برا نہ منائیں تو......'' عاقل خان اس کی بات پر چند ثانیے متذبذب رہا پھر ایک نظر قریب بیٹھے بھائی کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے...... میں اندر پردے کا انتظام کراتا ہوں۔ آپ نے جو سوال کرنے ہیں وہ سوچ لیں۔''

''میں سوچ چکا ہوں...... اور کوشش یہی کروں گا کہ کم سے کم سوال کروں۔'' انسپکٹر کھل اٹھا۔

''مگر انسپکٹر صاحب......! ہماری ایک شرط ہے۔'' دفعتاً قادر بخش نے لب کشائی کی اور انسپکٹر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف تکنے لگا۔

''یہ بات میرا مطلب ہے...... تفتیش والی کارروائی...... آپ کو راز میں رکھنی ہو گی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں...... ایسا ہی ہو گا۔ اگر خدانخواستہ کسی قسم کی ''انوالومنٹ'' آپ کے گھر سے نکل بھی آئی تب بھی میں بھرپور کوشش کروں گا کہ یہ بات راز میں ہی رہے۔ بشرطیکہ کوئی میجر انوالومنٹ نہ ہو۔''

''تھینک یو...... آپ بیٹھیئے میں ابھی آتا ہوں۔'' عاقل خان نے کہا اور اندر اپنے کمرے میں آ گیا جہاں اس کی بیوی ہدایتاں موجود تھی۔ عاقل خان نے کہا۔

''ہدایتاں......! شہر سے ایک پولیس آفیسر آیا ہے...... تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔''

''پولیس...... پر کیوں...... کیا...... میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے بھلا......'' وہ یکدم پریشان ہو کر بولی۔

''وہ محض ضابطے کی کارروائی کرنا چاہتا ہے۔'' عاقل خان نے اس کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''ہرگز نہیں......'' ہدایتاں نے معاً سنبھلتے ہوئے قطعیت بھرے لہجے میں کہا۔

ایسے میں اس کی چشم تصور میں حاکم زادی کا چہرہ گھوم گیا جس نے اسے اپنے شوہر عاقل خان سے محتاط کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے پھانسنے کی کوشش کرے گا مگر تم ہوشیار رہنا۔ عاقل خان نے گھور کر ہدایتاں کی طرف دیکھا اور پھر قدرے تحکمانہ انداز میں درشتی سے بولا۔ ''ہدایتاں......! یہ میرا حکم ہے۔''

''تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو خیال کرو۔'' ہدایتاں نے کہا۔

''اگر تم سامنے نہیں آؤ گی تو...... پورے خاندان کی عزت اچھلے گی سمجھیں......'' عاقل خان غصے سے بولا۔

''میں سمجھ گئی ہوں تمہیں قادر بخش نے ورغلایا ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ایک دن گوٹھ کا تھانیدار مراد خان بھی سائیں وڈے کے پاس قادر بخش کی شکایت لے کر آیا تھا۔ وہ موجا خان کے قتل میں ملوث تھا کیونکہ موجا خان...... مٹھن ہاری کی بیٹی کونجاں سے شادی کرنا چاہتا تھا جبکہ تمہارے چہیتے بھائی قادر بخش کو یہ بات پسند نہ تھی......اور......''

''بکواس بند کرو...... اپنی......''

''کیوں...... اب کیوں میری بات بکواس لگ رہی ہے تمہیں...... تمہارا اپنا بھائی خاندان کی عزت اچھال......'' جملہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ عاقل خان نے

طیش میں آ کر اس کے تھپڑ جڑ دیا تھا۔

ہدایتاں کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور وہ اسی لہجے میں اپنے شوہر سے بولی۔ ''تم نے مجھے لاوارث سمجھ رکھا ہے۔ میں زمیندار حکم داد کی بیٹی ہوں سمجھے ...... اور اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رکوں گی۔'' اس نے کہا اور عاقل خان نے صاف محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں کوئی اور بول رہا تھا۔

''تم نے اگر یہاں سے ایک قدم بھی باہر نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' عاقل خان نے تنبیہی لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا اور غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

وہ اب دوبارہ اس کمرے میں آ گیا تھا جدھر انسپکٹر چوہدری خرم اس کا منتظر تھا۔

''کیا یہ تفتیش تم پھر کسی روز نہیں کر سکتے؟'' عاقل خان نے انسپکٹر چوہدری خرم سے نظریں چراتے ہوئے کہا تو زیرک انسپکٹر اسکے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر ذومعنی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''مسٹر عاقل ......! پازیب بی بی پر قاتلانہ حملوں کا کیس ان تاویلوں سے طول کھینچ سکتا ہے۔ بہرطور ...... میں اب چلتا ہوں۔''

''بیٹھو ...... کھانا کھا کر جانا ......'' عاقل نے اپنی خجالت چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ اندر ہی اندر کسی ادھیڑ بن میں تھا۔ انسپکٹر خرم کو جواباً خاموش پا کر عاقل جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچتے ہوئے دوبارہ اس سے بولا۔ ''تم ایسا کرو ...... ذرا دیر کو ...... میں کچھ کرتا ہوں بندوبست ......'' انسپکٹر اپنے کندھے اچکا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

قادر بخش بڑے بھائی کے چہرے سے اندازہ لگا چکا تھا کہ تفتیش والی بات پر دونوں میاں بیوی کی آپس میں کھٹ پٹ ہوئی ہوگی ...... اور انسپکٹر کو مزید وہاں روکنے کا مقصد تھا کہ گھر میں بلاوجہ جھگڑے کی فضا پیدا ہوتی لہٰذا درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے عاقل خان سے بولا۔ ''ادا سائیں ......! ابھی آپ فی الحال انسپکٹر صاحب کو جانے دیں ...... یہ کام پھر کسی دن کر لیں گے۔''

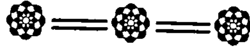
''نہیں ...... اب یہ کام ...... آج ہی ہوگا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' عاقل

خان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اور وہ پھر ...... دوبارہ کمرے سے نکل گیا۔

اس مرتبہ قادر بخش بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

انسپکٹر چوہدری خرم اکیلا صوفے پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کے بشرے سے عجیب سا جوش ہویدا تھا۔ اسے اب سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ پازیب پر قاتلانہ حملوں کی سازش ...... بھٹائی ہاؤس میں ہی تیار کی گئی تھی۔



انسپکٹر خرم کو وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ بار بار رسٹ واچ پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ عاقل خان اور قادر بخش کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ انسپکٹر خرم کو اب بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ وگرنہ اس کا ارادہ جلد واپس لوٹنے کا تھا مگر اب جبکہ عاقل خان نے اس سے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے ایک آخری ''سعی'' کا کہتے ہوئے اندر گیا تھا۔ اس لئے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اب کی بار عاقل خان ''میدان'' مار کر ہی آئے گا۔ ساتھ ساتھ اسے یہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ان علاقوں میں عموماً مرد عورتوں پر حکم چلاتے ہیں تو پھر کیا وجہ تھی کہ عاقل خان اپنی بیوی کو محض ضابطے کی تفتیش کے لئے راضی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس سے یہ بات ظاہر تھی کہ عاقل خان کی بیوی بھی یقیناً کسی اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہو گی جس پر تسلط جمانا عاقل خان کو مشکل نظر آیا تھا۔

بہر طور خاصی دیر بعد عاقل خان اور قادر بخش کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر نے ان کے چہروں پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی تیز نظروں نے حالات کے تکدر کو بھانپ لیا تھا۔ دونوں بھائی گم صم کھوئے کھوئے سے قریب کے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

ذرا دیر بعد عاقل خان نے مطمئن نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے انسپکٹر سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب......! کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے، آیئے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں بعد میں تفصیلی گفتگو ہوتی رہے گی۔'' انسپکٹر کو ایک لمحے کے لئے اچنبھا تو ہوا مگر وہ انکار نہ کر سکا، جانتا تھا کہ یہاں سے وہ کھانا کھائے بغیر جا بھی نہ سکے گا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی عاقل خان نے انسپکٹر خرم کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ اس کی خواہش پوری کرنے سے

قاصر ہیں۔

زیرک انسپکٹر خرم جو پہلے ہی دونوں بھائیوں کے اترے ہوئے چہروں سے حالات کا کسی قدر اندازہ لگا چکا تھا، چونکے بغیر دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ''شکریہ'' کہہ کر ''بھٹائی ہاؤس'' سے رخصت ہو گیا۔

تاہم جاتے جاتے وہ عاقل خان سے پرانا جملہ دہرائے بغیر نہ رہ سکا جو اس عدم تعاون کے موقع پر انسپکٹر خرم بارہا عاقل خان سے کہہ چکا تھا۔

''......ایسی صورت میں پازیب والا کیس تعطل کا شکار ہو سکتا ہے۔''



حقیقت یہ تھی کہ جب دوسری بار فیصلہ کن انداز میں عاقل خان نے اپنی بیوی ہدایتاں کو ضابطے کی تفتیش کے سلسلے میں قدرے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ہدایتاں......! یہ محض اس لئے کرنا چاہ رہا ہوں تاکہ پولیس کا شک اس حویلی سے ختم ہو جائے۔ اس طرح تمہارا عدم تعاون ان کے شکوک وشبہات کو مزید تقویت دے گا۔''

''آپ میرے سر کے سائیں ہو...... پر سائیں......! اتنا میں جانتی ہوں کہ مجھے شامل تفتیش کرنے کا مطلب ہے کہ مجھے بھی مجرم سمجھا جا رہا ہے۔ یہ بات میرے لئے باعث دکھ اور آزار نہیں ہے۔'' ہدایتاں نے رنجیدہ سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

عاقل خان، جس کا غصہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا وہ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکا، اس نے بے اختیار ہدایتاں کے چہرے پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ پھر تو ہدایتاں نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔

بڑے بھائی کی صورت سے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے قادر بخش اس کے ہمراہ ہی تھا، وہ فوراً درمیان میں آ گیا اور بھائی کو دوسرے کمرے میں لے آیا لیکن ہنگامہ یہیں پر ہی موقوف نہیں ہوا تھا۔

جب انسپکٹر خرم بے نیل ومرام وہاں سے چلا گیا تو عاقل خان نے بعد میں بھی اپنی بیوی ہدایتاں کے ساتھ خوب جھگڑا کیا اور غصے میں آ کر اس نے صاف صاف لفظوں میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ پازیب کے معاملے میں ہدایتاں یا اس کے بھائیوں کا

پورا پورا ہاتھ ہے اور ان سب کو پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

پھر ہدایتاں نے ایک روز ضروری سامان باندھا اپنے دونوں بھائیوں کو حویلی بلایا اور اپنے دونوں بچوں احمد علی اور بانو کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ یہ سب عاقل خان کی غیر موجودگی میں ہوا تھا۔



دیوار گیر کلاک میں دونوں سوئیاں دس کے ہندسے پر گلے مل چکی تھیں "کین جھر ہاؤس" پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ عاقل خان کی مسلسل غیر موجودگی تھی۔ گھنگھرو اور پازیب ایک کمرے میں خاموشی کے بحر بیکراں میں غرق تھیں۔ ان کے چہروں پر غم واندوہ کے ملے جلے تاثرات نے ایک تناؤ کی سی کیفیت کھنڈ دی تھی۔ ایک عجیب اور جاں گسل فیصلے کے کرب تلے وہ دم بخود سی بیٹھی تھیں۔

"پازیب......! تم نے آخری بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لی ہے...... اچھی طرح......" کمرے کا سکوت ٹوٹا۔ گھنگھرو کی آواز دور سے آتی سنائی دی تھی مگر باوجود اس کے رنجیدہ اور گم صم بیٹھی اس کی بہن پازیب کو وہ مدھم الفاظ بھی دھماکے سے کم محسوس نہیں ہوئے تھے۔

"اس فیصلے کے سوا اب ہمارے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے باجی...... مزید اور کیا سوچنا اب......" پازیب نے عجیب سی معصومیت سے کہا۔

اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر پتھرائی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی بہن گھنگھرو کو اپنی سہیلی شائلہ کے فون کے بارے میں بتا چکی تھی۔ گھنگھرو کو پہلے تو یقین نہ آیا مگر یہ بات بھی تو ایسی نہ تھی جو جھٹلائی جاتی۔ گھنگھرو نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شیطنیت کس کی ہو سکتی تھی۔

"منے خاں" کا نام کسی گندے کیڑے کی طرح گھنگھرو کے ذہن میں کلبلایا تھا۔ چاندنی بی کے کوٹھے پر جب گھنگھرو پر سرکشی کا دورہ پڑتا تھا تو اکثر منے خاں کے تنبیہی الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکراتے تھے جو وہ بڑی عیاری سے چاندنی بی کے کانوں میں کہتا تھا۔

"بنو رانی کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ چاندنی بی! اس کی چھوٹی بہن پازیب کا پول پوری یونیورسٹی میں کھول دو کہ اس کا تعلق کہاں سے ہے۔"

ان نازک اور حساس حالات کے تناظر میں یونیورسٹی کے زیادہ طلباء و طالبات نے پازیب کی اصل حقیقت جاننے کے بعد اس سے غیر محسوس انداز میں منہ موڑ لیا تھا۔ یہی نہیں پازیب یہ بات بھی جانتی تھی کہ اس کی حقیقت یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بھی نہیں چھپی رہ سکتی۔ اس طرح مزید مسائل الجھن اور پریشانی کا باعث بن سکتے تھے۔ پازیب کو اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کے لئے یونیورسٹی میں جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ اب کس طرح یونیورسٹی جا سکتی تھی۔ اسے ابھی سے ایسا لگتا تھا جیسے یونیورسٹی کے تمام فیلوز بڑی چبھتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اس کے منتظر ہیں۔ وہ ایک عرصے سے شرافت کا نقاب چڑھائے ان کے بیچ شریف زادی بن کر رہی تھی۔

پازیب کو اچانک ایک لڑکی یاد آ گئی۔ وہ اکنامکس کی طالبہ تھی۔ سیدھی سادی تھی...... پکھراج نام تھا اس کا...... جیسے ہی اس کی اصلیت کا علم ہوا محض اتنا کہ اس کی ماں نجی محفلوں میں غزلیں گیت گاتی ہے تو اس بے چاری کی شامت ہی آ گئی۔ اگرچہ قریبی سہیلیوں نے اسے اپنی جانب سے سرد مہری کا احساس ہونے نہ دیا مگر بعضوں نے طنز و تشنیع کی انتہا کر دی تھی بالآخر اس بے چاری پکھراج کو یونیورسٹی چھوڑتے ہی بنی۔ لہٰذا اب پازیب بھی اپنے اندر اتنا بڑا حوصلہ نہیں پا رہی تھی اور اس نے بالآخر یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب یونیورسٹی کو ہی نہیں بلکہ اس شہر نامہرباں کو بھی چھوڑ دے گی۔

گھنگھرو کو پوری طرح اپنی چہیتی بہن کے ذہن اور نفسیاتی کرب کا اندازہ تھا۔ اسے بھی اس بات کا گہرا دکھ تھا کہ آخر کار اس کیچڑ آلود زندگی کے چھینٹوں نے پازیب جیسے نازک اور سادہ کنول سے وجود کو بھی داغدار کر ڈالا تھا۔ اب جبکہ پازیب نے انتہائی قطعیت کے ساتھ اپنی بہن گھنگھرو کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا تو گھنگھرو نے بھی بالآخر یہی طے کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ چاندنی بی کے اس منحوس کوٹھے کو بھی خیر باد کہہ دے۔ کیونکہ اسے بھی اب اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر زندگی نہیں بتا سکتی۔ ایک کشتی جو غلاظت سے بھری ہوئی تھی، اس کی آلودگی سے دوسری کشتی کا متاثر ہونے کا ہر وقت احتمال

رہتا۔

لہٰذا اس نے کوٹھے کو خیر باد کہہ دیا اور اب دونوں بہنیں جلد از جلد اپنے اس زندگی کے اہم اور بڑے فیصلے کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد جب گھنگھرو نے بڑے رسان سے پازیب سے پوچھا تھا۔ ”عاقل خان کا کیا کیا جائے...... کیا تم اسے بھلا سکو گی......؟“

گھنگھرو اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اچھی طرح پازیب کا امتحان لے لینا چاہتی تھی۔ اس نے سوال کرتے ہوئے اپنی نگاہیں پازیب کے سپاٹ مگر آزردہ چہرے پر ثبت رکھی تھیں۔ جواباً پازیب نے کہا۔

”باجی......! وقت دھیرے دھیرے شاید سارے زخموں کا مداوا بن جائے...... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میرے پیچھے...... میری بیک گراؤنڈ کا جو کرب ناک عفریت مجھے ہر پل روندنے کے لئے دوڑا چلا آ رہا ہے، وہ مجھے عاقل خان سے شادی کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔“ پازیب کے لہجے میں کرب ناک ارتعاش تھا جسے محسوس کر کے گھنگھرو سرتا پا لرز اٹھی۔ اسے پازیب کے مغموم اور کسی خیال میں غرق چہرے سے حسرت و یاس کی پرچھائیاں نظر آئیں تو اس نے افسردہ ہو کر سوچا کہ ”یہ سب اس کی وجہ سے تھا۔“ اس نے پازیب کے الفاظ سے یہی اندازہ لگایا تھا جیسے وہ اس سے کہہ رہی ہو کہ......

”باجی......! جب تک آپ کی غلیظ شخصیت میرے ساتھ نتھی ہے مجھے کہیں بھی سکون نہیں مل پائے گا۔“ یہ سوچ کر گھنگھرو اندر سے کانپنے لگی۔ یہ بات درست ہی تھی لہٰذا وہ اب اپنی اس غلیظ شخصیت کا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی اور تب دونوں بہنوں نے یہ شہر نہیں بلکہ ان تمام شخصی حوالوں سے ناتا توڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

”مگر باجی! ہم جائیں گے کہاں...... اور...... میرے دشمن جو میری جان کے درپے ہیں۔“ پازیب نے پہلی بار گھنگھرو کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو گھنگھرو کے چہرے پر ایک لمحے کو استہزائیہ چمک سی آئی جو فوراً ہی معدوم بھی ہو گئی۔

”عاقل خان سے ناتا توڑنے کے بعد اب تمہارا کوئی بھی دشمن نہیں رہے گا۔

رہی یہ بات ہم کہاں جائیں گے...... وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دنیا میں نیک لوگوں کی کمی نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں نے آج سے چار پانچ سال قبل جو نیکی کی تھی اس کا پھل مجھے ملنے والا ہے۔ بس ہمیں تھوڑا سہارا ملنے کی دیر ہے...... میں سب سنبھال لوں گی۔“ گھنگھرو کے چہرے سے مستقبل کے کٹھن حالات سے نبرد آزما ہونے کا پرجوش سا ارتعاش جھلکنے لگا تھا۔ پازیب نے بے اختیار ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔



وہ ایک بڑی غمگسار رات تھی جب دونوں بہنوں گھنگھرو اور پازیب نے شہر نامہرباں سے رابطہ توڑنے کا آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ عاقل خان کی غیر موجودگی میں ”کین جھر ہاؤس“ کو خیر باد کہنے میں اگرچہ پازیب کا دل ملول تھا اور آزاردہ سا ہوا تھا...... لیکن وہ مجبور تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ عاقل کو اس اقدام سے دکھ پہنچے گا مگر پازیب خود بھی تو مجبور تھی۔ گھنگھرو نے بھی چاندنی بی کے کوٹھے کو پہلے ہی سے غیر اعلانیہ خیر باد کہہ دیا تھا کیونکہ چاندنی بی اور اس کے گماشتوں کی ریشہ دوانیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی اب کی بار اگر وہ کوٹھے پر گئی تو پھنس کر رہ جائے گی۔ واپسی کے در اس نے پہلے ہی بند کر ڈالے تھے۔

پازیب نے پھر بھی عاقل کے نام ایک مختصر رقعہ لکھا اور پھر اپنے آنسو ضبط کئے دونوں بہنیں برقع اوڑھے خاموشی سے نکل گئیں۔ ان کے آنے جانے پر ویسے ہی کوئی پوچھ تاچھ نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا کوئی رات کے دس بجے کے وقت وہ دونوں بہنیں ٹیکسی میں سوار ہو کر اسٹیشن کی سمت روانہ ہوئیں۔ دونوں نے ایک بڑے سے سوٹ کیس میں ضروری استعمال کی اشیاء کے علاوہ تھوڑے بہت زیور بھی رکھ لئے تھے۔ ہینڈ بیگ دونوں نے اپنے الگ الگ تھامے ہوئے تھے جن میں مقدور بھر نقدی بھی موجود تھی۔

ان کا ارادہ لاہور جانے کا تھا۔ ٹرین کا وقت انہوں نے پہلے ہی سے فون پر معلوم کر لیا تھا۔ لاہور شادمان کالونی میں گھنگھرو کی ایک بہت ہی گہری سہیلی نجمہ رہتی تھی۔ نجمہ بھی اسی قبیل کی لڑکی تھی، مجبوری اور ناچاری نے اسے چاندنی بی کے کوٹھے پر لا پھینکا تھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی مگر ایک لڑکے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اس

نے گھر سے راہ فرار اختیار کی تو وہ اسے دھوکہ دے کر چاندنی بی کے کوٹھے پر پہنچا گیا تھا۔ گھنگھرو کو اس سیدھی سادی شریف لڑکی پر بڑا ترس آیا تھا۔ بالآخر ایک دن گھنگھرو نے اسے کسی طرح کوٹھے سے فرار کروادیا تھا۔ نجمہ نے اسے بتایا تھا کہ لاہور میں اس کی ایک رشتے کی خالہ ہے، وہ وہیں جانا چاہتی ہے۔ گھنگھرو نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ خالہ کے گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع ضرور دے۔ پتہ گھنگھرو نے پازیب کی یونیورسٹی کا دیا تھا اور نام بھی پازیب کا ہی بتایا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد نجمہ کا خط آ گیا۔ خط کیا تھا...... ایک قعر مذلت میں گرنے سے بچ جانے والی معصوم لڑکی کی پوری کتھا تھی جو گھنگھرو کی تعریفوں سے پر تھی۔ تشکر کے جذبات سے لبریز یہ خط پہلا اور آخری نہیں تھا بلکہ اس کے بعد ہر ہفتے خط آنے لگے اور اس دوران گھنگھرو کو پتہ چلا کہ اس نے ایک شریف لڑکے سے شادی بھی کرلی تھی جو ایک موٹر میکینک تھا اور اس کی اپنی گیراج تھی اور تب ایک دن اس نے بڑے بھولپن سے پازیب کے یونیورسٹی والے ایڈریس پر خط لکھ کر اسے یعنی گھنگھرو کو بھی چاندنی بی کا کوٹھا ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی تجویز دیتے ہوئے اپنے پاس بلایا تھا مگر گھنگھرو مجبور تھی اپنی بہن پازیب کی وجہ سے...... لیکن اب جبکہ چاندنی بی اور اس کے گماشتوں کی چیرہ دستیوں میں اس قدر اضافہ ہونے لگا تھا کہ ان کے عتاب سے پازیب بھی بچ نہ پائی تو بالآخر گھنگھرو نے نجمہ کی برسوں کی خواہش پوری کرتے ہوئے لاہور جانے کا قصد کیا تھا۔

ٹیکسی سبک روی سے چمکتی دمکتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے سینوں میں انجانی منزلوں کے اندیشناک وسوسوں کے بوجھ تلے مہر بہ لب بیٹھی تھیں۔ گھنگھرو نے قدرے بے چینی کے عالم میں رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے...... ابھی ٹرین کے روانہ ہونے میں نصف گھنٹہ تھا۔ دس منٹ مزید اسٹیشن پہنچنے میں صرف ہوسکتے تھے۔ گویا اسٹیشن پہنچنے کے بعد ٹرین بیس منٹ کے اندر روانہ ہونا تھی مگر یہ نصف گھنٹہ بھی گھنگھرو کو آدھی صدی کے برابر محسوس ہورہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس شہر ناپائیدار کو خیرباد کہہ دینا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے اور اس کی پھول سی معصوم بہن پازیب کے لئے سوائے دکھوں کے کچھ نہ تھا۔ پاکستان

چوک کراس کرتے ہی دفعتاً ایک ہائی روف نے ٹیکسی کا راستہ روک لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے یک دم بریک لگا دیئے۔ اکادکا ٹریفک کے مدھم شور میں ٹائر زور سے چرچرائے...... گھنگھرو اور پازیب کو زبردست جھٹکا لگا اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ ہائی روف سے چند نقاب پوش اترے اور ٹیکسی کو گھیرے میں لے کر گھنگھرو اور پازیب کو باہر گھسیٹ لیا۔ دونوں ہراساں بہنوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں مگر وہ ان شکروں جیسے لحیم شحیم بدمعاشوں کے شکنجوں میں کمزور چڑیوں کی طرح پھڑ پھڑانے کے سوا کیا کرسکتی تھیں۔

اگلے ہی لمحے ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور بند ہوگیا...... اور وہ ایک جھٹکے سے آگے روانہ ہوگئی۔



''ہم عاقل خان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہماری عزت کو کھلونا بنانے کی کوشش کی ہے۔'' سائیں رکھیو غضب ناک لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔

''اڑے ماٹھ کرتو ذرا...... رکھیا ذرا سوچ بچار کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔'' اس کے باپ حکم داد نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سوچ بچار کیا بابا سائیں......! عاقل خان نے ہماری ادی کو بے عزت کرکے نکالا ہے۔ وہ اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اب بھٹائی ہاؤس والوں سے جنگ ہوکر ہی رہے گی۔'' یہ مولا داد تھا۔

''ہم کو پہلے ہی شک تھا، یہ ساری کھچڑی اس شہر والی چھوکری سے دوسری شادی کرنے کا نتیجہ ہے۔ وہ ادی ہدایتاں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔'' سائیں رکھیو نے پھر لقمہ دیا۔

اس وقت دور چاولوں کے کھیتوں میں سورج غروب ہونے لگا تھا۔ سرد ہواؤں کا زور بڑھنے لگا تھا۔ یہ تینوں باپ بیٹے اپنے پختہ اینٹوں والے بڑے سے مکان کے ایک کمرے میں آمنے سامنے موجود تھے۔ دو چارپائیوں کے بیچ سلگتے کوئلوں کی انگیٹھی پڑی ہوئی تھی۔

ہدایتاں اپنے دونوں بچوں سمیت روتی پیٹتی ہوئی میکے آ چکی تھی۔ اپنی چہیتی بہن کو اس حال میں دیکھ کر دونوں بھائیوں کا غصہ آسمان سے جا لگا اور جب ہدایتاں نے رو رو کر اپنا ''دکھڑا'' بیان کرتے ہوئے یہ بتایا۔ ''اس کا شوہر عاقل خان اس سے دوسری شادی کرنے کی اجازت مانگ رہا تھا اور اجازت نہ دینے کی صورت میں اسے شہر والی لڑکی، جس سے وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا، پر دو بار قاتلانہ حملے کروانے کے جرم میں پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ لہٰذا وہ وہاں سے بھاگ آئی۔'' اگرچہ اس بات نے سائیں رکھیو اور مولا داد کو آگ لگا دی تھی مگر حکم داد کے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ عاقل خان ایسا بھی کر سکتا ہے۔

اگرچہ وہ بھی بھٹائی ہاؤس والوں کا کوئی خاص خیر خواہ نہ تھا اور ایک سرد جنگ اس کی طرف سے چلی آ رہی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کیونکہ وہ عاقل خان کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا مگر اپنے دونوں جوان بیٹوں کو غیظ و غضب کی آگ میں سلگتا دیکھ کر حکم داد پریشان ضرور ہو گیا تھا تاہم ایک حساس نوعیت کی کمزوری کا سہارا لیتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اڑے چپ کرو تم دونوں ...... پہلے بات سنو میری......'' اس نے جھڑکنے کے انداز میں بات کی ابتدا کی پھر باری باری ان دونوں کے جوش سے تمتماتے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اڑے ...... کمزوری تو اپنی بھی ہے ناں ...... تم دونوں جو خود کو عقل کل سمجھتے ہوئے یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری سازش کا وہ بھانڈا بھی بھٹائی ہاؤس والوں کی آنکھوں کے سامنے پھوٹ چکا ہے۔ جب تم نے لالچ میں آ کر دو لاکھ روپے ہدایتاں سے مانگے تھے ......تمہاری اس بے وقوفی کی وجہ سے تو میں ان لوگوں سے نظریں ملانے جوگا نہیں رہا ہوں۔ یہ تو شکر کرو...... کہ وہ لوگ اس بات کو خاندان کی عزت کی خاطر پی گئے ہیں۔ اگر اس طرح غصہ کرو گے تو ...... تم سب بھی جیل کی ہوا کھاؤ گے اور اس خوش فہمی میں بھی مت رہنا کہ سردار شیر دل خان کے مرنے سے یہ بات بھی دفن ہو گئی ہے ......نہیں قادر بخش نے عاقل خان کو ساری تفصیل دے دی ہو گی۔ وہ بہت کائیاں اور ہوشیار چھوکرا ہے۔'' حکم داد اتنا کہہ کر

خاموش ہوا۔ باپ کی زبانی یہ سن کر سائیں رکھیو اور مولا داد کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ مگر رسی جل گئی لیکن بل نہیں گیا کے مصداق ان کے چہروں سے ناگواری ہنوز مترشح تھی پھر مولا داد نے کہا۔

''بابا...... قادر بخش کا تو ہم نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ یاد رکھے گا۔ اسے انسپکٹر مراد خان نے گرفتار کر کے ہی چھوڑا ہے۔''

''شاباش یہ ہوئی نا بات ...... غصے کی بجائے اس طرح سوچ بچار کر کے سیاسی مار دینی چاہیے دشمنوں کو......'' حکم داد نے توصیفی لہجے میں بیٹے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی چال چلو کہ بھٹائی ہاؤس والے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ایک معمول ''رہاک'' (کسان) بھی ان لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا گوارا نہ کرے۔''

وہ دونوں باپ کی بات سن کر اثبات میں دھیرے دھیرے اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دینے لگے۔ ''کونجاں اور قادر بخش کے معاملے کو پورے گوٹھ میں اچھالو...... موجا خان کا قاتل قادر بخش ہے ...... یہ افواہ سارے گوٹھ میں پھیلا دو۔ پھر دیکھو بھٹائی ہاؤس کا شیرازہ کیسے بکھرتا ہے مگر میں پھر بھی تم دونوں کو یہی مشورہ دوں گا کہ غصہ میں مت آؤ...... پیٹھ پیچھے سیاست کھیلو......'' زمیندار حکم داد اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔



عیار حاکم زادی ہدایتاں کے اپنے میکے جا بیٹھنے کے اقدام سے از حد خوش تھی۔ اسے ہدایتاں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ محض اس حد تک اسے ہدایتاں سے دلچسپی تھی کہ اسے بندوق چلانے کے لئے ہدایتاں کا کاندھا درکار تھا اور بس ...... مگر اب وہی کام وہ اپنے چہیتے بیٹے منصب خان سے لینا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہی وقت ہے اپنے دونوں بچوں کو آئندہ حالات کو اپنے حق میں کرنے کے لئے ان کی ذہنی صفائی کرے۔ اس معاملے میں اگرچہ اس کی بیٹی سورٹھ جو عاقل خان کے ساتھ ہی شہر پڑھتی تھی، نے خود کو الگ تھلگ اور صرف پڑھائی تک محدود کر رکھا تھا مگر منصب خان پوری طرح ماں کے مفادات کے لئے کمربستہ تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس میں خود

اس کا ہی فائدہ تھا۔ حاکم زادی نے اپنی ''پڑھاکو'' بیٹی سورٹھ سے باتوں باتوں میں اس لڑکی کے بارے میں تفصیل پوچھنی چاہی تھی کہ وہ کون ہے، اس کا نام کیا ہے اور کیا واقعی ان دونوں میں اس حد تک ذہنی ہم آہنگی ہو چکی کہ شادی پر آمادہ ہیں وغیرہ وغیرہ......''

مگر سورٹھ نے دانستہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے سرے سے اس معاملے سے ہی لاعلمی کا اظہار کر ڈالا تو حاکم زادی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

''منصب پٹ......! یہی وقت ہے ان دونوں بھائیوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کا......'' حاکم زادی نے پرزور لہجے میں بیٹے سے کہا۔

ماں کی بات سن کر منصب خان چہیتے اور دلیر سپوت کی طرح بولا ''امر گودی......! قادر بخش کو تو میں نے تھانے پہنچا ہی دیا ہے...... باقی زمیندار حکم داد اور اس کے گماشتے گہرام خان بھی اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔''

''شاباش پٹ......! پر یہ بھی کافی نہیں ہے۔ یہ دونوں بھائی سنپولیے ہیں...... کسی طرح عاقل خان کو بھی اس چکر میں پھنسانے کی کوشش کرنا ہو گی۔ مجھے تو یہ کم بخت دوسرا سردار شیر دل خان محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ میرا سوتیلا بیٹا ہے پر کبھی کبھی خود میں بھی اس کے آگے دم مارنے کی ہمت نہیں کرتی......'' حاکم زادی نے کہا تو منصب خان معنی خیز سفاکی کے ساتھ ماں سے بولا۔

''تو پھر اس کا بھی وہی حشر کیوں نہیں کرتی جو تو نے ''وڈے سائیں'' کے ساتھ کیا تھا۔''

''ششش...... شش...... آہستہ بولو...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' حاکم زادی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بیٹے کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کی......

لحظہ بھر خاموشی اختیار کرنے کے بعد حاکم زادی نے قدرے سرگوشیانہ لہجے میں دوبارہ کہا۔ ''ابھی پانی سر سے اتنا اونچا نہیں ہوا۔ عاقل کو راستے سے ہٹانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے زمیندار حکم داد کے ساتھ بری طرح الجھا دیا جائے باقی رہا ہدایتاں والا معاملہ...... وہ اب یہاں نہ آئے تو اچھا ہے۔ کیونکہ اس کے نہ آنے سے فساد اور بڑھے گا۔ جو ہمارے مفاد میں ہے...... میں اپنی سوتن اور عاقل کی ماں دراں

خاتون کو اب اس کی بہو ہدایتاں کے خلاف ورغلانے کی کوشش کروں گی۔'' مکار حاکم زادی نے اپنی بات ختم کی تو منصب خان اپنی ماں کے چلتر پر باچھیں پھیلا کر مکروہ انداز میں مسکرا دیا۔



''چل یار سرمو آج تیکوں اپڑیں وڈے سائیں سے ملواتا ہوں۔'' نظرو دھاڑیل نے ہاتھ میں پکڑی روسی ساخت کی آٹومیٹک کلاشنکوف کی چال درست کرتے ہوئے تھکی دار لہجے میں بولا تو سرمد ایک لمحے کو قدرے حیرانگی سے اسے تکنے لگا۔

''ہمارا بھلا کون سا وڈا سائیں پیدا ہو گیا؟ ویسے حیرت ہے کہ ہم جیسے لوگوں کا بھی کوئی وڈا سائیں ہوتا ہے۔ کیا تم کسی مرشد سائیں کی بات تو نہیں کر رہے۔'' سرمد نے پوچھا۔

''ہا...... ہا......'' نظرو دھاڑیل نے سرمد کی بات پر بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔ کلاشنکوف سیٹ کرنے کے بعد وہ اب اسے اپنی اجرک سے چمکا رہا تھا۔

رات دبے پاؤں بیت رہی تھی آسمان پر ٹکا آخری راتوں کا چاند اداس نازنین کی طرح سسکیاں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ جنگل ڈیرے کے اطراف میں ہُو کا عالم تھا اور رات کا پرآسیب اندھیرا سناٹا...... ماحول کو ہیبت ناک بنائے ہوئے تھا۔

سرمد کی بات پر نظرو نے ایک بدمست قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔ ''اڑے بابا تو...... بھول گیا...... میں نے کہا تھا ناں کہ ہماری پشت پناہی بعض ایسے ''وڈے سائیں'' ہی کرتے ہیں جنہیں پتھاریدار یا ''رہندو'' کہا جاتا ہے۔ وہ ہی پولیس اور دیگر معاملات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ خود ہمارے مخبر بھی پولیس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے آس پاس پھیلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں ان پتھاریداروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھو حاضری بھر کر لوٹ آئیں گے تکڑ (جلدی)...... یہ تجربہ بھی تمہیں ہو جانا چاہئے۔'' وہ آخر میں مدبرانہ لہجے میں بولا۔

''ہم دونوں ہی جائیں گے یا...... کوئی ہمراہ (ساتھی) بھی ساتھ ہو گا۔''

سرمد نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''نہیں ......صرف ہم دونوں......''

''چلو ٹھیک ہے ...... میں بھی ذرا اپنے گھر کی خبر گیری کرتا آؤں گا۔ چلو میں تیار ہوں۔'' سرمد نے کہا۔

پھر وہ دونوں کلاشنکوف اور رائفل سنبھالے اجرک کی بکل مارے ...... اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔



آج کی رات فیصلہ کن اور بڑی سنسنی خیز محسوس ہو رہی تھی۔ انسپکٹر مراد خان بڑے پرجوش انداز میں زرد اور بوسیدہ دیواروں والے تھانے کی عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا۔ اسے ابھی ابھی ایک مخبر نے بتایا تھا کہ بدنام دھاڑیل نظرو دھاڑیل آج رات گوٹھ میں ڈکیتی کی واردات کرنے والا ہے اور اس کے ہمراہ سرمد بھی ہو گا۔ جواب باقاعدہ ان بدنام اور خطرناک دھاڑیلوں کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا۔ انسپکٹر نے اس خفیہ اطلاع پر فوراً ہی پولیس پارٹی ترتیب دی اور ڈاٹسن میں سوار ہو کر گوٹھ کے آس پاس کے علاقوں میں اپنے آدمیوں کو پھیلا دیا۔



ابھی ان دونوں کے گھوڑے گوٹھ کی حدود سے ذرا دور کیکر کے ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے ہی تھے کہ نظرو دھاڑیل نے اچانک اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ گھوڑا ابلا کا سدھایا ہوا تھا، بغیر کسی ہنہناہٹ کے وہ رک گیا۔ اس کے عقب میں سرمد نے بھی اپنا گھوڑا اس کے قریب لا کر روک لیا۔ آسمان پر روشن تارے ٹمٹما رہے تھے۔

''سرمد......! میں خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔'' دفعتاً نظرو دھاڑیل نے دور اندھیرے میں اپنی تیز کھوجتی نظریں گاڑتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا تو جانے کیوں سرمد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ نظرو دھاڑیل کی اس بات سے خطرے کی نوعیت کا کچھ اندازہ نہ لگا سکا کہ آیا ''خطرہ'' نظرو دھاڑیل کی چھٹی حس کا شاخسانہ تھا یا پھر واقعی اس نے کچھ دیکھا۔ ''کیسا

خطرہ......! سنگت......!'' سرمد نے پوچھا۔

مدھم روشنی میں نظرو دھاڑیل کا چہرہ تمتماتا محسوس ہو رہا تھا۔

''خطرہ ...... جیسا بھی ہو ...... واپس تو لوٹنا کسی بھی صورت میں نہیں ہے۔'' نظرو دھاڑیل نے پرجوش لہجے میں کہا اور پھر گھوڑے سے اتر آیا۔ سرمد نے بھی اب بغیر کچھ کہے نظرو کی تقلید کی اور وہ بھی نیچے اتر آیا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کی پشت کو مخصوص انداز میں تھپتھپایا پھر انہیں ...... ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کھلا چھوڑ دیا۔ پھر وہ دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔

''مرا خیال ہے سنگت......! تم آج اپنے گھر نہ جاؤ۔ بس آ پڑیں وڈے سائیں سے ملنے کے بعد واپس لوٹ آتے ہیں۔'' نظرو نے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں سرمد سے کہا۔

''یار کچھ تو بتاؤ...... آخر تم کیسا خطرہ محسوس کر رہے ہو۔'' بالآخر سرمد نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''پولیس کا خطرہ لگ رہا ہے مجھے ...... میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔ انہوں نے نہ صرف تمہارے گھر کے آس پاس اپنے مخبر چھوڑ رکھے ہیں بلکہ وہ راتوں کو گوٹھ کی حدود کے باہر آس پاس گشتی ٹیم بھی روانہ کرتا رہتا ہے۔''

''ہوں......! یہ بات ہے......'' سرمد نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''انسپکٹر مراد خان نے نیا نیا تھانے کا چارج سنبھالا ہے ناں ...... اسی لئے اپنی دہشت ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اندرون خانہ لین دین کا معاملہ ہو سکے۔ یہ کالی بھیڑ ہے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' نظرو دھاڑیل نے استہزائیہ انداز میں کہا تو سرمد بولا۔

''ایسا تو نہیں کہیں ...... اس انسپکٹر مراد خان کو اپنے کاندھوں پر پھول بڑھانے کا کچھ زیادہ ہی شوق چرایا ہو۔ ایسے جوشیلے پولیس افسر کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بہرحال ہوشیار رہنا چاہئے۔''

''اڑے واہ ڑے چھورا ...... تو تو بڑا ...... سیانا ہو گیا ہے ڑے......'' نظرو دھاڑیل نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا اور پھر دونوں خاموشی سے اپنا سفر طے کرنے

لگے۔ سرمد کو یوں تو نظرو دھاڑیل کی یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ آخر وہ اسے اپنے وڈے سائیں سے کیوں ملانا چاہتا تھا؟ اس نے دبے لفظوں میں اس سوال کا اظہار بھی کیا تھا۔ جواباً نظرو نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں تمہارے بھی ان سب لوگوں سے مراسم پیدا ہوں تاکہ میرے بعد تمہیں گروہ کے معاملات میں آسانی اور حالات کو اپنے حق میں بہتر کرنے میں مدد مل سکے۔'' سرمد یہ سنکر چپ ہو گیا تھا۔

بہر طور وہ دونوں تاریکی میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ گوٹھ کی حدود میں وہ داخل ہوئے تو دفعتاً جانے سرمد کے دل میں کیا آئی کہ اس کا دل بے اختیار اپنے باپ اور بہن کونجاں سے ملنے ان کی خیریت معلوم کرنے کو چاہا تب وہ رک گیا۔

''سنگت......! بس میرا دل کہہ رہا ہے میں آ پڑیں پیو (باپ) اور ادی کونجاں سے ایک ملاقات کر آؤں......'' سرمد نے حیرت سے کہا تو نظرو دھاڑیل نے بھی کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔ ''چل پھر پہلے ادھر ہی چلتے ہیں۔''

دونوں اب محتاط روی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اندھیرا چہار سو چھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں گوٹھ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد سامنے مدھم روشنی میں نظر آنے والے کچے پکے مکانوں کے ہیولوں کی طرف بڑھ گئے۔ پھر ایک گلی کے نکڑ پر وہ دونوں رکے۔

''تو جا...... جلدی سے حال وال لے کر آ جا۔ میں ادھر ہی کھڑا ہوں...... ہل ونج تکڑا......'' نظرو دھاڑیل اطراف میں محتاط انداز سے نگاہیں دوڑاتے ہوئے سرمد کو مخاطب کر کے بولا۔

سرمد نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اندھیری گلی میں داخل ہو گیا۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ دروازہ کونجاں نے کھولا تھا۔ وہ شاید جاگ رہی تھی۔ سرمد نے بھی ایک ہی دستک پر دروازہ کھلنے سے یہی اندازہ لگایا تھا۔ بھائی کو سامنے دیکھ کر کونجاں مارے رقت کے بھائی سے لپٹ گئی اور سسکیاں لے کر رو پڑی۔ بہن کی سسکیوں میں غم کی کسک سرمد کو صاف محسوس ہوئی۔ وہ اب اندر آ چکا تھا۔ صحن میں بچھی تین چارپائیوں میں دو پر ان کے ماں باپ گہری نیند سو رہے

تھے۔ تیسری خالی تھی جو کونجاں کی تھی۔

''ادا...... ماں پیو کو جگا دوں؟'' کونجاں اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے بھائی سے بولی۔

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی جلدی میں ہوں...... بس تیرے سے دو باتیں کرنی ہیں۔'' سرمد نے عجلت میں کہا پھر دونوں بھائی بہن خاموشی سے اندر ایک کمرے میں آ گئے۔ کونجاں نے بلب جلایا۔

''کونجاں......! مجھ سے کچھ مت چھپانا۔ تیرے کو پتہ ہے ناں...... تجھے ان مردود شیطانوں سے بچانے کی خاطر میں نے اپنی منزل کا نشان کھویا ہے۔ میری قربانی رائیگاں مت جانے دینا۔ بتا مجھے وہ کمینہ زمیندار حکم داد یہاں آیا تھا؟''

بھائی کی بات نے کونجاں کے اندر ایک بار پھر رقت طاری کر دی۔ پھر اس سے رہا نہ گیا، اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے بھائی کو بتا دیا کہ جہنم دواصل موجا خان کے بعد اب بدخصلت زمیندار حکم داد اس کی جگہ گہرام خان نامی شخص کو میرا سنگ دینے کے لئے بابا پر دباؤ ڈال رہا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ دونوں شیطان تھوڑے دن پہلے یہاں بھی آ چکے تھے۔

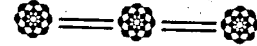
سرمد نے یہ سنا تو اس کا دماغ بھنکنے لگا۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اسے اب اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ فساد کی اصل جڑ زمیندار حکم داد ہی ہے جو اپنے مذموم مقاصد کی خاطر پہلے موجا خان اور پھر گہرام خان جیسی کٹھ پتلیوں کو سامنے لا رہا تھا۔ وہ شاید ایک غریب ہاری سے شکست کھانے کو اپنی انا اور ضد کا مسئلہ بنا چکا تھا۔ موجا خان کے عبرتناک انجام کے باوجود زمیندار حکم داد نے اب تک ان کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ ادھر سرمد نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب سب سے پہلے زمیندار حکم داد کا ہی خاتمہ کرنا پڑے گا۔ اس نے بہن کے سر پر از راہ شفقت ہاتھ رکھا اور بولا۔

''ادی جیجل......! تو گڑتی (فکر) نہ کر......! جب تک تیرا یہ بھائی زندہ ہے تیری طرف کوئی بھی میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے گا۔''

''ادا...... تو کب تک میری خاطر در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔'' کونجاں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا تو سرمد کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

ایک پرعزم مسکراہٹ، پھر وہ اپنی بہن کی طرف دیکھ کر مرتعش لہجے بولا۔ ''غیرت مند بھائیوں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے...... گوری......! دوسروں کی بے بسی و مجبوری پر کام آنے کی بجائے ہنسنے لگیں، جب قانون بھی معاشرے میں پھیلے درندوں کا ساتھ دینے لگے اور جب ایک غیرت مند بھائی کی معصوم بہن کی عزت داؤ پر لگ جائے تو ایسے غیرت مند بھائی میری جیسی راہ اپناتے ہیں۔'' اس نے اپنی بات ختم کی۔

ابھی وہ رخصت ہونے لگا تھا کہ دفعتاً باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔



رات کی پرسکوت فضا میں گولی چلنے کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ دونوں ہی بہن بھائی اس آواز پر بری طرح چونکے تھے۔ سرمد کے چہرے پر کچھ زیادہ پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ کونجاں اپنے بھائی کی اس پریشانی کا سبب جانتی تھی۔

''ادا......! تجھے اللہ سائیں کا واسطہ باہر مت جانا۔''

دفعتاً سرمد کے وجود میں اضطراری جنبش ہوئی تو کونجاں نے سرمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر جانے سے منع کیا تو سرمد نے آہستگی کے ساتھ اپنی بہن سے ہاتھ چھڑایا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کی پیشانی چوم کر بہ عجلت بولا۔

''ادی......! تو میری گڑتی (فکر) نہ کر...... میرا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے...... اپڑاں خیال رکھنا......'' اتنا کہتے ہوئے سرمد نے اجرک کے نیچے سے اپنی پشت پر بندھی رائفل ہاتھ میں لے لی اور بجلی کی سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر دروازے تک پہنچا۔ ذرا جھری بنا کر اس نے باہر تاریکی میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ پھر یک دم پورا دروازہ کھول کر مستعدی کے ساتھ باہر تاریکی میں گم ہو گیا۔

کونجاں حیران و پریشان کھڑی نمناک آنکھوں سے دل ہی دل میں اپنے بھائی کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگی۔

پوری گلی تیرہ و تار تھی۔ سرمد رائفل کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے دیوار سے چپک کر اطراف میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً دوسری بار گولی چلنے کی زبردست آواز گونجی۔ سرمد کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس بار آواز خاصی قریب سے آئی تھی۔ سرمد نے چونکتی ہوئی نظروں سے گلی کے نکڑ کی طرف اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی جس کے آخری سرے پر نظر و دھاڑیل اس کا منتظر تھا۔

دوسری بار گولی چلنے کی آواز ادھر سے ہی ابھری تھی۔ اچانک سرمد کو سامنے ایک ہیولا تیزی کے ساتھ دوڑتا نظر آیا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ رائفل والا ہاتھ بلند ہونے لگا۔ ہیولا قریب آ چکا تھا۔ وہ نظرو دھاڑیل تھا۔ اس نے بھی سرمد کے دیوار سے چپکے ہوئے ہیولے کو دیکھ لیا تھا۔

''سرمد......! بھاگو جلدی......'' وہ بغیر رکے سرمد کے قریب سے گزرتے ہوئے زور سے بولا۔

سرمد کے وجود میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ بھی اسکے عقب میں ہولیا۔ آگے گلی دور تک اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گلی سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی تھی۔ عقب میں پھر گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی غرائی ہوئی آواز بھی ابھری۔ دونوں نے اپنے دوڑنے کی رفتار بھی بڑھا دی تھی۔

آگے گلی ختم ہوتے ہی یہ لوگ دائیں جانب مڑ گئے۔ ادھر جوار کے قد آدم کھیتوں میں دونوں داخل ہو چکے تھے۔

''نظرو کیا بات ہے......کیا ہوا تھا؟'' سرمد نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''پولیس نے پورے گوٹھ کو گھیر لیا ہے۔ مجھے ایک کتے نے مروا دیا تھا۔'' جواباً نظرو دھاڑیل نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

جوار کی قد آدم فصلوں میں اب دونوں قدرے خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ مگر رکے ذرا دیر کو بھی نہیں تھے۔

''اب کدھر جا رہے ہو۔'' سرمد نے پوچھا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ''اپڑیں وڈے سائیں کی پناہ میں، ہم ابھی یہ پولیس کا گھیرا نہیں توڑ سکتے۔'' نظرو نے جواب دیا۔

سرمد خاموش ہو گیا۔ سرمد نے خود کو نظرو کے عقب میں ہی رکھا تھا۔ نظرو غیر معمولی پھرتی اور ہوشیاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ سرمد کو ایسے چکردار اور بھول بھلیوں والے راستوں پر دوڑائے جا رہا تھا کہ خود سرمد کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ آج تک کس طرح ایسی خفیہ رہگزاروں سے ناواقف رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی اس گوٹھ میں پلا بڑھا تھا۔ بہرطور یہ موقع ان باتوں پر ماتم کرنے کا نہ تھا۔

اب وہ دونوں چاولوں کے کھیت کی درمیانی پگڈنڈی پر جھکے جھکے دوڑے جا رہے تھے۔ چاولوں کی جوان فصلوں سے بھڑاس سی اٹھ رہی تھی۔ آسمان پر ساون کے بادل ٹکڑیوں کی صورت میں بٹے ہوئے تھے، جنہوں نے آسمان پر دمکتے چاند، تاروں کو ڈھانپ لیا تھا۔

کبھی یوں ہوتا جب کوئی آوارہ ٹکڑا چاند کے رخ روشنی سے سرک جاتا تو مدھم روشنی میں اطراف کا منظر کافی واضح ہونے سے دونوں کے آگے پیچھے دوڑتے ہیولے بڑے پراسرار محسوس ہوتے تھے۔

ہر سو ہو کا عالم تھا۔ دوبارہ فائرنگ نہیں ہوئی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد نظرو دھاڑیل ایک پختہ اینٹوں والے مکان کی عقبی دیوار کی آڑ میں اچانک رک گیا۔

سرمد کے ذہن میں اس مکان کی چہاردیواری دیکھ کر ایک جھماکا سا ہوا مگر خاموش رہا۔ وہ شاید نظرو دھاڑیل کے اگلے قدم کا منتظر تھا۔

پھر نظرو دھاڑیل نے سرمد کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دیوار سے چپکے چپکے جب اس کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک سرمد کا ماتھا ٹھنکا...... اور اپنی دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''کیا......تمہارا ''وڈا سائیں'' ادھر ہی رہتا ہے۔''

''ہاں......! اس وقت وہی ہمیں پناہ دے سکتا ہے اور پولیس کی نظروں سے محفوظ بھی رکھ سکتا ہے۔ تو جانتا ہوگا آخر اس کو......تو بھی اس گوٹھ کا رہنے والا ہے۔''

''اس کا نام......زمیندار حکم داد تو نہیں......'' سرمد نے سنسناتے ہوئے سرگوشی کی۔

''ہاؤ......میڈا سنگت......اپڑاں وڈا سائیں یہی حکم داد ہی ہے۔ بڑا خیال رکھتا ہے اپڑاں......'' نظرو دھاڑیل اپنی ترنگ میں بولے جا رہا تھا اور سرمد کے اندر جوار بھاٹا کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک اپنے دیرینہ دشمن زمیندار حکم داد کی شہ رگ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہی تو وہ بدطینت شخص تھا جس نے اس کے ہنستے بستے گھر کی خوشیوں کو اپنی خودغرضی کی چنگاری سے بھسم کر رکھا تھا۔ اپنی بہن کو نجاں کی لرزا دینے والی گفتگو ہنوز اس کی

ساعتوں میں گونج رہی تھی۔ جب اس نے سرمد کو زمیندار حکم داد کے آئندہ عزائم کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جہنم واصل موجا خان کے بعد اب حکم داد گہرام خان کی پشت پناہی کر رہا ہے تاکہ اس کا (کونجاں) کا سنگ (رشتہ) مٹھن ہاری سے لے سکے۔ چاہے اس کیلئے زبردستی کیوں نہ کرنی پڑے۔''

''کیا ہوا......؟ تو چپ ہو گیا؟''

سرمد کو کسی گھمبیر خاموشی میں مبتلا پا کر نظرو دھاڑیل نے جیسے ٹہوکا دیا اور سرمد کے ہونٹوں پر عجیب سنسنی خیز مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ وہ زمیندار حکم داد کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ادھر نظرو دھاڑیل نے جلدی سے مگر قدرے مخصوص انداز میں ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ یہ مکان سے ملحقہ اوطاق کا دروازہ تھا۔ جدھر زمیندار حکم داد کے کسی حواری یا چاکر کا موجود ہونا لازمی تھا۔ سرمد نے جلدی سے اجرک کا ڈھاٹا چہرے پر سرکا لیا۔



دونوں بھائی اس وقت غصے کے مارے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ عاقل خان نے اپنے چھوٹے بھائی قادر بخش کو ایک لمحہ بھی پولیس کی حراست میں نہیں رہنے دیا۔ چونکہ وہ ایک پڑھا لکھا شخص تھا اور قانون جانتا تھا۔ انسپکٹر خرم کو فارغ کرنے کے بعد دونوں بھائی اب انسپکٹر مراد خان کے متعلق سوچ رہے تھے۔ انہیں غالباً اس حقیقت کا اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ انسپکٹر مراد خان زمیندار حکم داد اور اس کے بیٹوں سائیں رکھیو اور مولا داد کے ہاتھوں بک چکا ہے۔ سردار شیر دل خان کے ہوتے ہوئے وہ ایسی جرأت نہ کر سکا تھا مگر ان کے مرحوم ہوتے ہی اس نے کل پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور پہلا وار اس نے قادر بخش کو گرفتار کر کے کیا تھا۔ عاقل خان اس توہین پر زیادہ تلملا رہا تھا۔

''میرا خیال ہے ادا سائیں......! ہمیں فی الحال اس معاملے سے توجہ ہٹانی پڑے گی۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر قادر بخش نے اپنے بھائی عاقل خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مگر ہمیں اس مردود انسپکٹر مراد خان کو سبق سکھانا چاہئے۔ میں اس پر شہر جا کر ہتک عزت کا مقدمہ کروں گا۔'' جواباً عاقل خان نے پرطیش لہجے میں کہا۔

''اس طرح تو ادا سائیں ہم اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے۔'' قادر بخش نے کہا۔

''انسپکٹر مراد خان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر زمیندار حکم داد وغیرہ کے آگے اپنی کارگزاری دکھانا چاہ رہا ہے۔''

''اصل مقصد ......تمہاری کیا مراد ہے قادر بخش ...... مراد خان کو اگر ہم نے ڈھیل دے دی تو وہ ہمارے خاندان کی عزت جب چاہے اچھالتا پھرے گا۔''

''ادا سائیں......! اصل مقصد سے میری مراد...... بابا سائیں کی خودکشی یا قتل والا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں، اگر آپ برا نہ منائیں تو بابا سائیں کی لاش کا پوسٹ مارٹم......''

''ہرگز نہیں......'' عاقل خان غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح تو خاندان کی عزت تماشا بن کر رہ جائے گی۔ تم کیا سمجھتے ہو قادر بخش کہ وہ زرخرید انسپکٹر مراد خان اس معاملے میں ہماری مدد کرے گا۔ بالکل نہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔ ''ادھر انسپکٹر خرم الگ ...... ہمارے خاندان کو تفتیش کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ دوسرے انسپکٹر مراد خان نے بھی یہی کرنا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بابا سائیں کے معاملے کو ابھی خودکشی ہی کی صورت میں دبا رہنے دو۔''

بڑے بھائی کی بات سن کر قادر بخش کو حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے عاقل خان سے اسی لہجے میں بولا۔ ''اس طرح تو ادا سائیں معاملہ اور بھی سنگین صورت اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ہم آخر کس کس معاملے کو ڈھیل دیتے رہیں گے۔''

چھوٹے بھائی کی بات میں عاقل خان کو طنز کی چبھن محسوس ہوئی اور قدرے سخت نظروں سے اسے گھور کر بولا۔ ''انسپکٹر مراد خان کو گل کھلانے کا موقع بھی تو تم نے ہی فراہم کیا ہے ...... نہ تم سرمد سے دوستی کا دم بھرتے ...... نہ وہ ذلیل انسپکٹر مراد تمہارے پیچھے لگتا۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تم سرمد کی جوان بہن کونجاں سے شادی

کا ارادہ رکھتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قادر بخش کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں سکیڑ لیں۔

بھائی کے سخت لہجے پر قادر بخش کو دکھ سا محسوس ہوا۔ پر وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ عاقل خان دوبارہ بولا۔ "بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ بابا سائیں کو بھی تمہارے اس عجیب معاشقے کا علم ہو چکا تھا کہ تم ان کے ایک معمولی "رہاک" (کسان) کی بیٹی سے شادی کا ارادہ رکھتے ہو...... اور جب کونجاں کی شادی موجا خان نامی شخص سے طے ہونا قرار پائی تو تم نے شادی میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی حتیٰ کہ بعد میں موجا خان کو قتل کر دیا گیا...... اور یوں اس قتل میں سرمد کے ساتھ تمہارا نام بھی زبان زد عام ہونے لگا تھا جس کی وجہ سے بابا جانی نے تم سے اس سلسلے میں کڑی باز پرس کی تھی اور انسپکٹر مراد خان کو تم سے تفتیشی سوالات کرنے کے لئے بذات خود "بھٹائی ہاؤس" بھی بلایا تھا اور تب سے انسپکٹر مراد خان کو حویلی کی عزت اچھالنے کا موقع ملا۔" عاقل خان اتنا کہہ کر غصے سے ہانپنے لگا۔

ادھر قادر بخش اپنے بڑے بھائی کے منہ سے ایسے کلمات سن کر دم بخود رہ گیا۔ اسے اپنے بھائی کے اس ناروا لہجے پر بڑا دکھ ہوا۔ وہ اس کا جواب اچھی طرح دینا چاہتا تھا کہ بابا سائیں کی موت بھی درحقیقت اسی کا شاخسانہ تھی، نہ وہ...... شہر میں اپنی کالج فیلو (پازیب) کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتا...... نہ "بھٹائی ہاؤس" کی کالی بھیڑوں کو ایسی گھناؤنی سازش کا موقع ملتا جنہوں نے اپنا جرم چھپانے کی غرض سے ان کے باپ کی جان لے لی تھی اور ان کے قتل کو بڑی چالاکی سے خودکشی کا رنگ دے ڈالا تھا مگر قادر بخش جانتا تھا کہ درون و بیرون سازشی مہروں نے بڑی چالاکی سے ایک ایسی خطرناک بساط بچھا رکھی تھی کہ اگر وہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ نہ رکھتے ہوئے اس کے ساتھ تو تو میں میں پر اتر آتے تو کوئی بعید نہیں کہ ان کالی بھیڑوں کو اپنی گھناؤنی سازشوں کے ایندھن سے پورے بھٹائی ہاؤس کو بھسم کرنے کا موقع ہاتھ آ جاتا لہٰذا قادر بخش نے چپ سادھ لی۔ اسی میں بہتری تھی۔



قادر بخش کو اپنے بڑے بھائی عاقل خان رویے پر اتنا رنج پہنچا تھا کہ وہ اپنے

کمرے میں آ کر کافی دیر تک پڑا روتا رہا۔ وہ اب خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے خلاف زہر اگلنے والی اس کی بھابھی ہدایتاں اور سوتیلی ماں حاکم زادی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ قادر بخش کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا ہو اور انجانے خطرات کا عفریت اسے اور اس کے بڑے بھائی کو کسی وقت بھی نگلنے والا ہو۔ حالانکہ وہ ایک مضبوط اعصاب اور ارادوں کا مالک تھا مگر اس چوکھی خطرات میں گھری جنگ نے اسے واقعی حد سے زیادہ پریشان اور توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک بھائی کی وجہ سے ہی تو اسے حوصلہ ہوا تھا مگر...... اسے بھی آج اپنے خلاف زہر اگلتے دیکھ کر وہ بری طرح اپنا دل مسوس کے رہ گیا تھا۔

دوسری طرف اسے اپنی محبوب ہستی کونجاں کی بھی فکر لاحق تھی۔ چشم تصور میں کونجاں کا معصوم چہرہ متحرک ہوتے ہی اسے اپنی منجدھار میں پھنسی ناؤ میں یک دم حوصلوں کے بادبان بڑی شد مد کے ساتھ پھڑپھڑاتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ایکا ایکی اس کی ہمت سوا ہونے لگی...... اور وہ اپنے اندر بڑے سے بڑے طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے...... ایک انوکھی طاقت محسوس کرنے لگا تب اسے یہ خوشگوار مگر حیرت کن احساس ہونے لگا کہ محبت انسان کو کس قدر حوصلہ اور طاقت عطا کرتی ہے۔ کونجاں کا خیال آتے ہی وہ بے قرار سا ہو گیا اور اس کا دل اس سے ملنے کے لئے تڑپ اٹھا۔

اس نے ایک دو بار پہلے بھی اس سے تنہائی میں ملنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے خاطر خواہ موقع نہ مل سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کونجاں نے اب گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس پر پابندی لگا دی گئی تھی مگر قادر بخش کے قدم بالآخر ایک طرف کشاں کشاں اس کے گھر کی طرف اٹھتے چلے گئے۔

جاڑوں کی زرد دھوپ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ چاولوں کی فصلیں کٹائی کے بعد اب گندم کی بوائی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ایک جانب ہرے ہرے چنوں اور مٹروں کی فصلیں بھی تیار تھیں۔ ذرا دیر بعد قادر بخش کی جیپ مٹھن ہاری کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

قادر بخش نیچے اترا، اس کے چہرے پر عجیب فیصلہ کن تمتماہٹ مترشح تھی۔

دوسرے ہی لمحے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازے پر بوسیدہ رلی کا پیوند زدہ ٹاٹ جھول رہا تھا۔ دستک کے جواب میں دفعتاً اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ یہ کونجاں کا باپ مٹھن تھا، دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔ سامنے قادر بخش کو دیکھ کر اس کے جھریوں بھرے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کے منہ سے الفاظ ہی نکل نہیں پا رہے تھے۔

''چھچھ...... چھوٹے سائیں...... آ...... آپ...... ایدھر......'' بالآخر اس کے منہ سے الفاظ پھسلے۔

''سلام چاچا...... کیا اندر آنے نہیں دو گے؟''

''چھوٹے سائیں...... آپ...... آپ نے تو مجھ گریب کی عزت بڑھا دی۔ میری آنکھوں پر جوتے رکھ کر آؤ...... سائیں...... بھلی کرے آؤ...... بھلی کرے آؤ......'' وہ جیسے قادر بخش کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

قادر بخش اندر آ گیا، صحن میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ 'اڑی کونجاں دھیئے......! بابا تکڑا (جلدی) کر رلی بچھا...... دیکھو تو کون آیا ہے؟'' اس کے لہجے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

کونجاں کے نام پر قادر بخش کا دل بے طرح انداز میں دھڑکا تھا۔ غیر ارادی طور پر...... قادر بخش کی بے تاب سی نظریں سامنے کوٹھڑی نما ایک کمرے کے دروازے پر پڑیں تو وہاں سے کونجاں کو برآمد ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اجلی رلی دبی ہوئی تھی۔

قادر بخش پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔ حیرت سے دہانہ وا ہو گیا۔ رلی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دونوں کی آنکھیں کیا چار ہوئیں کہ دونوں کے یکتارے بج اٹھے۔ پیاسی نگاہوں کو اس یقین پہ تامل ہونے لگا۔ اس گھڑی جیسے سب کچھ تھم گیا...... تب کونجاں کی سرمگیں آنکھیں جھیل ہو گئیں۔ کپکپاتے نرم و نازک پنکھڑیوں سے ہونٹ محض کپکپا کر رہ گئے۔ جیسے دل نہاں کی کوئی بات لبوں تک آتے آتے رہ گئی ہو۔

''اڑی...... جلدی آ...... ایدھر......'' دفعتاً مٹھن ہاری نے پھر کونجاں کو پکارا۔

دونوں کا سلسلۂ دل و نگاہ لحہ بھر کو موقوف ہوا۔ کونجاں نے جلدی سے جھک کر رلی اٹھائی اور سر جھکائے بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتی دم بہ خود کھڑے قادر بخش کے قریب سے گزری تو قادر بخش نے ایک لمبی سانس کھینچ کر جیسے کونجاں کے مہکتے وجود کی خوشبو اپنی پژمردہ رگ جاں میں اتار لی تو یوں لگا جیسے اس نے آب حیات پی لیا ہو۔

''آ...... آؤ...... چھچھ...... چھوٹے سائیں......'' دفعتاً کونجاں کے لبوں سے نکلا۔

قادر بخش خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کونجاں سر جھکائے اندر چلی گئی۔ اندر آتے ہی جیسے اس کی جان نکل گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس نے پانی کا ایک گلاس چڑھایا۔ عجیب سی مسرت، خوشی، پریشانی اور موہوم سے وسوسے نے اسے خوشی کے ساتھ بے چین سا کر دیا تھا۔ وہ پریشان بھی تھی اور خوش بھی۔ قادر بخش کے دیدار پر خوش تھی تو اس طرح اچانک آمد پر پریشان تھی...... اس نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور جلدی سے کمرے کے دروازے کی جھری سے آنکھ چپکا دی۔ سامنے کا نہ صرف منظر واضح تھا بلکہ باتوں کی آوازیں بھی کانوں تک صاف آ سکتی تھیں۔

''چاچا تم بھی تو بیٹھو...... ناں میرے ساتھ......؟'' قادر بخش نے اپنے قریب ہاتھ جوڑے کھڑے مٹھن سے کہا تو اسے جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''نا...... سائیں...... نا...... ہم بھلا آپ کے برابر بیٹھنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں۔''

''نہیں...... چاچا...... انسان سب برابر ہیں۔ اوپر بیٹھنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ آؤ...... بیٹھو میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' قادر بخش نے کشادہ دلی کے ساتھ مٹھن سے کہا تو وہ بے چارہ لجاتا کپکپاتا ہوا چارپائی کی پائینتی پر ٹک گیا۔ اندر کمرے کے دروازے کے عقب میں دم سادھے چپکی بیٹھی کونجاں کے کان ''ضروری بات'' پر کھڑے ہو گئے جو قادر بخش کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں...... چاچا...... تیرے سے ایک بات کرنی ہے۔ اگر بری لگے تو معاف کر دینا پر ناراض نہ ہونا۔''

"سائیں ...... آپ ...... کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ حکم کریں ...... ہمارا سر بھی حاضر ہے۔" مٹھن ہاری نے بڑے رسان کے ساتھ جواب دیا تو قادر بخش لمحہ بھر توقف کے بعد کھنکار کر دوبارہ مٹھن سے بولا۔ "چاچا پتہ نہیں تمہیں کیسا لگے اور تم میری بات کا کیا مطلب لو ...... لیکن میرا رب جانتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ ویسے تو یہ بات بڑوں کے کرنے کی ہے ...... پر کسی مجبوری کے باعث ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تمہاری دھی کونجاں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" قادر بخش نے بات ختم کی۔

مٹھن کو تو ایک لمحے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق وہ دم بخود رہ گیا اور اندر دروازے سے لگی کھڑی کونجاں کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

"کیا کہتا ہے چاچا ...... میں نے سیدھے سیدھے تجھ سے بات کہہ دی ہے۔ آگے تیری مرضی ......" قادر بخش اس کی طویل متعجب خاموشی کو توڑنے کی غرض سے بولا۔

"چھچھ ...... چھوٹے سائیں ...... یہ ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا!" بالآخر مٹھن کے منہ سے بوکھلاہٹ آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔

"سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات ہے اس میں بھلا چاچا مٹھن ......!" قادر بخش پرزور لہجے میں بولا۔ "میں کونجاں سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور بس ...... کیا بولتا ہے تو ......"

غریب مٹھن ہاری کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ کبھی اپنی کم مائیگی پہ نظر دوڑاتا تو کبھی قادر بخش جیسے رئیس خاندان پر اس کی محجوب سی نگاہ نہ ٹھہرتی۔

"چھچھ ...... چھوٹے سائیں ...... میں کیا جواب دوں۔ مجھے تو ......" وہ پھر رک گیا۔

"چاچا ...... میں آپ تیرے سے جواب لے کر ہی جاؤں گا۔ ویسے کوئی مسئلہ ہے تو بتا ...... پہلے میں اسے سلجھاؤں گا۔" قادر بخش نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ادھر مٹھن قادر بخش کی بات پر پہلی بار کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ اس کی آخری بات پر مٹھن کی

آنکھوں کے سامنے زمیندار حکم داد اور گہرام خان کے گھورتے ہوئے چہرے رقصاں ہو گئے۔ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً دروازے پر دستک کے ساتھ ہی کسی نے بلند آواز سے مٹھن کو پکارا۔

"آتا ہوں ڑے ...... ذرا صبر کرو ......" مٹھن نے جواباً بلند آواز سے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا تو قادر بخش نے فوراً کہا۔

"جاؤ چاچا ...... پہلے اسے فارغ کر آؤ۔ پھر آرام سے بات کریں گے۔"

قادر بخش نے کہا اور ناچار مٹھن اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو قادر بخش نے اشارے کنائے میں اسے سمجھا دیا کہ باہر کسی سے یہ تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس وقت اس کے گھر میں موجود ہے۔

مٹھن کے باہر نکلتے ہی کونجاں ...... یکدم کمرے سے باہر آ گئی۔ قادر بخش کے دل میں یکتارا بج اٹھا۔ سرمدیں سروں کی کہکشاں، دل کی ستاں کے رخ روشن پر دمکنے لگیں۔

دو چار دن کا میلہ، دو چار دن کی فرقت
تو نے کہاں سے سیکھی یہ رسم آشنائی
سیکھے گا عشق جو بھی جھیلے گا وہ مصیبت
سر جاں صنم پہ صدقے سچل یہ جسم سارا
ہے غنیمت مجھ کو یارو، دوستی دلدار کی
کیوں نہ بیگانہ رہوں جب یہ جہاں فانی ہوا
تجھ بن رہی نہ طاقت مجھ میں مرے سریجن
روز اوّل سے یوں تھا بے اختیار ہونا
(حضرت سائیں سچل سرمست)

"کیا بات ہے کونجاں ...... کوئی پریشانی ہے ...... یا تجھے میرے اس طرح آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔" معاً قادر بخش نے محویت کو توڑا۔

تو کونجاں کی کجراری آنکھوں میں نمناکی اور چہرے پہ یاسیت سی کھنڈ آئی، بولی۔ "ایک تمہارے آنے سے ہی تو میرے دل میں آس کا دیپ جلا ہے ...... خوشی تو

میرے لئے بہت چھوٹا لفظ ہے...... اپنے سجن کا چہرہ دیکھ لیا...... سارے جہاں کی دولت مل گئی۔ اب مر بھی جاؤں تو کوئی گڑتی نہیں۔"

"نہیں کونجاں...... ایسا مت کہہ...... میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر مایوسی کی باتیں؟" قادر بخش تڑپ کر بولا۔

پھر آہستگی کے ساتھ چارپائی سے اٹھا۔ کونجاں کے ملیح چہرے پہ نظریں جمائے جمائے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی ٹھوڑی آہستگی سے اوپر اٹھائی پھر حلاوت بھرے لہجے میں بولا۔ "کونجاں...... اب تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ بس میں نے اب تجھ سے شادی کا آخری فیصلہ کر لیا ہے۔"

"قادر...... وہ زمیندار حکم داد اور اس کا چیلا آئے تھے یہاں...... اور...... بابا سے......" کونجاں نے وقت کی کمی کے باعث ایک اہم بات یاد آتے ہی اس کا برملا اظہار کر ڈالا۔ اس کی ادھوری بات کا مطلب قادر سمجھ گیا۔

اس کے چہرے پر طیش سا عود کر آیا اور اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں جیسے...... وہ...... زمیندار حکم داد اور گہرام خان کو جلا کر بھسم کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

"اچھا ایک اور بات بتا...... تیرا بھائی سرمد آتا ہے...... تم لوگوں سے ملنے......" قادر بخش نے کسی خیال کے تحت اچانک پوچھا۔ مٹھن ہنوز...... باہر شاید کسی کے ساتھ طویل گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا مگر دروازے کے باہر قریب ہی کھڑا تھا۔

"ہاں...... ادا سرمد آتا رہتا ہے ہماری خیر خیریت واسطے...... مجھے اپنے بھائی کی بھی فکر رہنے لگی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسے راستے پر چل نکلا ہے۔ تمہارا تو وہ دوست ہے...... اسے سمجھاؤ۔"

"میں تو خود اس سے ملنے کے لئے بے تاب ہوں اور میں نے اسے ڈھونڈنے کی بھی بہت کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے اسے ہماری شادی پر بہت خوشی ہو گی۔ تو ایسا کر...... اب کے آیا تو اسے میری قسم دے کر میرا یہ پیغام دینا کہ مجھ سے بھی کبھی ملنے کی کوشش کرے...... یا اپنا ٹھکانہ بتائے...... میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔" قادر بخش نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ معاً دروازے پر مٹھن کے کھانسنے کی آواز ابھرا اور کونجاں

اپنے سر پہ چادر درست کرتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی...... جبکہ قادر بخش خاموشی کے ساتھ چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"چھچھ...... چھوٹے سائیں...... آپ ناراض تو نہیں ہوئے...... کم بخت یاروا گیا تھا۔"

"ارے...... نہیں...... نہیں چاچا...... اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔"

قادر بخش جواباً اس کو شرمندگی سے بچانے کی غرض سے کشادہ دلی سے بولا۔ پھر جیسے رخصت ہونے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مٹھن کے کاندھے پر احتراماً اپنا ہاتھ دھر کر بولا۔ "چاچا...... پھر تیرا کیا جواب ہے؟"

"سائیں......! اتنی بڑی بات میں کیسے کہہ ڈالوں...... ہاں کہتے ہوئے بھی مجھے جانے کیا لگ رہا ہے۔" قادر بخش اس کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ گیا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے چاچا...... تو اچھی طرح سوچ لے...... میں اب چلتا ہوں۔"

"ارے سائیں میں تو آپ کو چاں پاڑیں کا کہنا بھول ہی گیا۔"

"نہیں چاچا...... اپنا گھر ہے جو کھانا پینا ہو گا مانگ کر تیرے سے کھاؤں گا...... اچھا چلتا ہوں اب......" یہ کہہ کر قادر بخش گھر سے نکل آیا۔



ہائی روف تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہائی روف میں ڈرائیور سمیت پانچ غنڈے تھے...... ان چاروں نقاب پوش بدمعاشوں نے اپنے چہرے سے نقاب اب اتار لئے تھے جنہوں نے دونوں بہنوں، گھنگھرو اور پازیب کو دبوچ رکھا تھا۔ ان میں ایک بدمعاش کا چہرہ دیکھ کر گھنگھرو لرز گئی۔ وہ چاندنی بی کا پالتو غنڈہ دبیر دادا تھا۔ جواب زہر خند نظروں سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔

"تم نے اب اپنے ساتھ پازیب کو بھی مشکل میں ڈال لیا ہے۔ اچھا ہے اپنے کوٹھے کی رونق بڑھ جاوے گی۔" وہ خبیث انداز سے گھنگھرو سے بولا۔

خوف کے باوجود گھنگھرو کے وجود میں غم و غصے کی لہر سی سرایت کر گئی۔ دبیر دادا کے لہجے اور بات نے اسے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی۔ وہ اب ان سے چھٹکارا پانے کا سوچنے لگی تھی۔ جو سر دست مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مگر

گھنگھرو نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ چاہے اس کی جان ہی چلی جائے، وہ اپنی بہن پازیب کو ان بدخصلت لوگوں کے شکنجے سے آزاد کروا کر ہی رہے گی۔

پچھلی سیٹ پر اس کے دائیں دبیر دادا اور دوسرے ساتھ ساتھ جڑے بیٹھے تھے جبکہ سامنے کی دوسری سیٹ پر باقی دو بدمعاشوں نے پازیب کو دبوچ رکھا تھا، خوف سے اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کم ہی تھا۔ البتہ سڑک کے کنارے الیکٹرک پولز کی وجہ سے سڑک دور تک چمکتی نظر آرہی تھی۔ معاً گھنگھرو نے اپنے ساتھ جڑے بیٹھے دبیر دادا کے پہلو میں کوئی آہنی شے محسوس کی۔ وہ شاید کوئی آتشیں ہتھیار تھا۔ فوری طور پر ذہن میں آنے والے ایک مزاحمتی خیال پر گھنگھرو کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے دبیر دادا کو باتوں میں لگانے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا۔ ''دادا...... مجھے معاف کردو...... تم اب جیسا کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی مگر میری معصوم بہن کو چھوڑ دو۔''

دبیر دادا اس کے رقیق لہجے کی بے بسی محسوس کر کے طاقت کے زعم میں بولا۔

''وہ تو ظاہر ہے اب تم وہی کرو گی جیسا ہم کہیں گے...... مگر تمہیں سزا دینا بھی ضروری ہے، میری چھمک چھلو......'' اس یاوہ گوئی کے دوران اس نے اوباشانہ انداز سے گھنگھرو کے گالوں کو چھوا۔ اس پر گھنگھرو نے ذرا بھی عار محسوس نہ ہونے دیا اور برابر اپنے مقصد کے حصول میں لگی رہی...... اور اب اس کا ایک ہاتھ غیر محسوس انداز میں اس کی لیدر کی جیکٹ میں ابھرے ہوئے حصے کو چھونے لگا تھا۔ پھر بڑے رسان کے ساتھ اپنی آنکھوں میں معنی خیز نشہ اتارتے ہوئے اس بار ادائے خاص سے بولی۔

''دادا......! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے...... مجھے تکلیف دے کر تمہیں خوشی ملے گی تو یہی سہی......''

اس کی بات سن کر دبیر دادا کی باچھیں ذومعنی انداز میں پھیل گئیں۔ اس اثناء میں گھنگھرو کا ہاتھ دبیر دادا کی جیکٹ کی جیب میں پستول کے آہنی دستے پر اپنا قبضہ جما چکا تھا جس کا دبیر دادا کو بھی فوری احساس ہوگیا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ گھنگھرو نے پستول اس کی جیب سے نکالنے کی زحمت کئے بغیر ہی ٹریگر دبا دیا۔

دبیر دادا کے پہلو میں ایک سناٹے دار دھماکا ہوا۔ گولی کی مہیب قربت اس کے

ایک پہلو سے نکل کر دوسری طرف سے نکل گئی۔ پازیب کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دبیر دادا اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ اس کے ساتھیوں کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ آناً فاناً دبیر دادا پر کون سی قیامت گزر گئی تھی۔

وہ بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ ڈرائیور کا پاؤں بے اختیار بریک پر دبتا چلا گیا۔ ہائی روف کے ٹائر زور سے چرچرائے اور وہ رکتے رکتے گھوم گئی۔ کوئی بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا، یہ کوشش صرف گھنگھرو نے حتی الامکان کی تھی کہ وہ خود کو سنبھالے رکھے۔

پستول اب اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... ایک گولی اپنے اوپر گرے ہوئے ایک بدمعاش کی گردن میں اتار دی۔ وہ دلخراش چیخ کے ساتھ وہیں پڑ کے رہ گیا۔

پازیب کو سنبھالے ہوئے دونوں بدمعاش ابھی اس افتاد ناگہانی پر سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ...... گھنگھرو نے ان میں سے ایک کے سینے پر تیسری گولی بھی چلا دی...... اور بڑی پھرتی کے ساتھ سلائیڈنگ ڈور کھولا۔ پازیب کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئی۔ اتنے میں باقی دو بدمعاش بھی اتر آئے۔

''خبردار...... جو تم نے کوئی حرکت کی۔ بھون کر رکھ دوں گی۔'' گھنگھرو پستول کا رخ ان کی جانب کر کے غرائی۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ ایک بدمعاش کو قریب سے جہنم واصل کرنے کے دوران اس کی گردن سے ابلنے والے خون کے فوارے نے گھنگھرو کا چہرہ اور بھی ڈراؤنا اور سفاک بنا ڈالا تھا۔

پازیب بے چاری کی تو گھگھی بندھ چکی تھی۔ خود گھنگھرو کی حالت بھی اس خون خرابے سے غیر ہونے لگی تھی۔ جوش اور غصے میں جو قدم اس نے اٹھایا تھا، وہ اس کے لئے بھی غیر متوقع تھا۔ اس کا پورا وجود سنسنا رہا تھا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دوبھر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اعصاب ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''پازیب...... تو بھاگ جا...... چلی جا...... اس شہر سے دور چلی جا۔'' کپکپاتے لہجے میں پازیب سے چلا کر بولی۔

مگر پازیب کی خوف کے مارے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ گھنگھرو نے بدستور

پستول ان دونوں بدمعاشوں پر تان رکھا تھا۔ پھر چلا کر پازیب سے بولی۔ ''پازیب ...... خدا کے لئے میری بات مان لے۔ میری قربانی ضائع مت کر...... تجھے میری قسم ...... بھاگ جا یہاں سے۔'' گھنگھرو نے بہ مشکل اپنی ڈوبتی ہوئی کیفیت پر قابو پایا۔ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبنے لگا تھا۔

ادھر پازیب کو جیسے ہوش آ گیا اور وہ دیوانہ وار دور تک پھیلی ہوئی دوویران سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ وہ دونوں بدمعاش بے بسی اور غصے سے دانت پیس کر رہ گئے مگر انہیں بھاگتی ہوئی پازیب کو پکڑنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ شاید وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ جس لڑکی نے اتنی آسانی کے ساتھ دبیر دادا اور ان کے دو ساتھیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا تھا، وہ لمحہ بھر میں انہیں بھی عدم آباد پہنچا سکتی تھی۔

پھر جیسے اچانک ایک بدمعاش کی تیز گھورتی ہوئی نظروں نے گھنگھرو کی رفتہ رفتہ غیر ہوتی حالت کو بھانپ لیا۔

''اب بھی وقت ہے...... خود کو ہمارے حوالے کر دو۔'' وہ بہ غور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا مگر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ انہیں بھی گولی کا نشانہ نہ بنا دے۔

دفعتاً پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ دور کہیں پیٹرولنگ پولیس کی گاڑی کے سائرن بجنے کی آواز ابھری۔ دونوں بدمعاش بری طرح ٹھٹکے۔ ادھر گھنگھرو کی حالت یکسر غیر ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور سینے میں دھڑکتے دل کی رفتار گھٹتی محسوس ہونے پر دوسرے ہی لمحے وہ چکنی سڑک پر گرتی چلی گئی۔ پولیس کی گشتی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی قریب آ گئی تھی۔



دوسری بار دستک کے جواب میں اوطاق کے اندر سے کسی کی غنودہ سی آواز ابھری۔

''کون ہے بابا؟''

''اڑے در کھول تکڑا...... ہم سنگت ہیں۔'' جواباً نظرو نے مخصوص لہجے میں قدرے بلند آواز سے کہا اور پھر اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک منحنی سا شخص کھڑا تھا۔

نظرو دھاڑیل اور سرمد غزاب سے اندر داخل ہو گئے۔ منحنی وجود والا شخص حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پرے ہٹ گیا۔ نظرو نے فوراً دروازہ اندر سے بند کر دیا اور اپنی بے قابو سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ ''جا بابا...... تکڑا (جلدی)...... سے اپڑیں وڈے سائیں کو بلا کر لا۔ اس سے کہنا نظرو سنگت آیا ہے۔''

''اس...... اس وقت...... وڈے سائیں کو میں کیسے بلا سکتا ہوں...... وہ...... وہ......''

''اڑے بس کر...... تو جا...... تکڑا...... کہا نا میں نے...... ورنہ تیری خیر نہیں ہو گی۔'' نظرو نے اس پر آنکھیں نکالتے ہوئے تنبیہ کی تو وہ منحنی سا شخص چہرے پر الجھن آمیز پریشانی کے آثار لئے اوطاق سے باہر نکل گیا۔

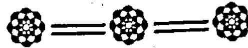
''یار...... نظرو......! ہم نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔ میرا مطلب ہے اگر پولیس یہاں آ گئی تو......'' سرمد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اڑے...... نہیں یار......! ابھی اپڑیں سائیں وڈے کو آنے دے۔ وہ خود ہی سب سنبھال لے گا۔'' نظرو دھاڑیل نے کہا اور سرمد سے ذرا چونک کر دوبارہ بولا۔ ''یہ تو نے ڈھاٹا کیوں باندھ رکھا ہے...... اتار دے اب اسے۔''

اس کی بات سن کر سرمد کا دل ایک لمحے کو دھڑکا مگر وہ خاموش رہا۔ اس کا دل کسی بھی لمحے فیصلہ کن گھڑی کی متوقع آمد پر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بھیدوں بھری رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ معاً اوطاق کے دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری پھر اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔

زمیندار حکم داد سامنے کھڑا تھا۔

اوہ خاصا پریشان اور بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سرمد کو اپنے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔



زمیندار حکم داد، سرمد کو پہچان نہیں پایا تھا البتہ سرمد کی تیز نظریں ڈھاٹے کے افق سے اس پر جم گئی تھیں۔

"اڑے بابا......! خیر تو ہے ناں نظرو! کیسے آنا ہوا اس وقت......؟"

"خیر ہی نہیں ہے سائیں وڈا! گوٹھ آئے تھے کسی سے ملنے...... پتہ نہیں کب پولیس نے گھیرا ڈال دیا...... تم سے بھی ملنا تھا...... سوچا ایک ہی دفعہ گھیرا توڑ کے نکل جائیں گے۔" نظرو دھاڑیل نے لاپروائی کے انداز میں کہا مگر زمیندار کے چہرے سے ہنوز بے چینی ہویدا تھی جیسے وہ ان کی آمد پر کچھ زیادہ خوش نہ ہوا تھا۔

"سائیں وڈا......! خیر تو ہے ناں...... کوئی گڑتی (پریشانی) ہے؟" نظرو دھاڑیل بغور زمیندار کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"نہیں......! ایسی تو کوئی باتی نہیں...... بس ویسے ہی تم کو اچانک اس وقت دیکھ کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔" زمیندار نے جواباً بات بناتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے سائیں وڈا......! میں تو پہلے بھی ایسے ہی آتا رہا ہوں...... تم تو مجھے فوراً گلے لگا لیتے تھے...... پر آج یہ گڑتی کس بات کی؟"

"اڑے نہیں یار......!" زمیندار جیسے خجل ہوتے ہوئے بولا اور پھر آگے بڑھ کر نظرو دھاڑیل کو گلے لگا لیا۔ "یار سمجھا کر...... کچھ گھریلو پریشانیوں کا شکار ہوں بس اس لئے پریشان ہو گیا تھا...... کہیں پولیس ادھر آ گئی تو میرے مخالفوں کو موقع مل جائے گا۔" زمیندار حکم داد نے اصل بات اگل ہی دی اور نظرو دھاڑیل تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا پھر اس سے بغلگیر ہونے کے بعد وہ سرمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سائیں وڈا......! اس سے ملو یہ آپڑاں وڈا جی دار مڑس ماڑوں ہے...... یار

ہے آپڑاں...... سنگت ہے......" اس نے کہا۔

جب زمیندار، سرمد کی طرف بڑھا تو سرمد کو اپنی رگیں تپتی محسوس ہونے لگیں...... سرمد نے اگلتی آنکھوں کے ساتھ زمیندار سے مصافحہ پھر معانقہ کیا۔

"آنکھوں سے تو بڑا شیر لگتا ہے یہ...... نام کیا ہے بابا تیرا......؟" زمیندار حکم داد نے سرمد کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی بے حسی کو محسوس کرتے ہوئے اس سے پوچھا اور پھر اس سے پہلے کہ نظرو دھاڑیل بڑے فخر کے ساتھ سرمد کا نام زمیندار کو بتاتا، سرمد نے پہلے ہی کھرکھراتی آواز میں مختصراً کہا۔

"حاصل خان نام ہے میرا...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

زمیندار کی آنکھوں میں صرف ایک لحظے کے لئے شک نمودار ہوا پھر معدوم ہو گیا۔

نظرو دھاڑیل کا چہرہ سرمد کے غلط نام پر ایک لمحے کو متحیر ہوا مگر فوراً اس نے قابو پایا اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے زمیندار حکم داد سے مستفسر ہوا۔

"سائیں وڈا......! کوئی ایسی ویسی بات ہے تو بتاؤ ناں...... پھر وری کسی کو اٹھانا ہے...... ڈھیر کرنا ہے...... حکم کرو۔" نظرو دھاڑیل کسی فرماں بردار چیلے کی طرح بولا۔

سرمد کو اس سے جانے کیو نظرو دھاڑیل کا یہ انداز تخاطب پسند نہیں آیا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ نظرو سرمد کے دیرینہ دشمن زمیندار حکم داد کا نمک خوار نکلا تھا۔ سرمد کے سینے میں اس وقت کیسی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی، اس کا اندازہ نہ زمیندار کو تھا نہ ہی نظرو دھاڑیل کو...... سرمد چپ رہا۔

"تیرے کو اپنا مسئلہ بتانا پڑے گا...... میں خود بھی تیرے سے ملنا چاہتا تھا...... کسی وقت آؤں گا تیرے جنگل ڈیرے پر وہیں اچھی طرح بات ہو گی۔" زمیندار نے کہا۔ "یہ بتا پولیس نے تجھے دیکھ تو نہیں لیا یہاں آتے ہوئے......؟"

"دیکھ بھی لیا تو کیا کر لے گی...... پر لگتا ہے ہمیں دیکھ کر پھر بھٹک گئی ہے۔" نظرو دھاڑیل نے چمکتی آنکھیں زمیندار کے چہرے پر مرکوز کر کے کہا۔ پھر بولا۔

"ابھی ہم کچھ دیر ادھر ہی رکیں گے...... آپ بھلے جا کر آرام کرو۔"

"چنگا......" زمیندار نے اثبات میں سر ہلایا اور اوطاق سے نکل گیا۔



متھن ہاری کے گھر سے لوٹنے کے بعد قادر بخش خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا...... وہ کونجاں سے ہی نہیں بلکہ اس کے باپ متھن سے بھی شادی کے بارے میں برملا اپنا حتمی فیصلہ سنا آیا تھا...... قادر بخش کو ایک تشفی آمیز مسرت تھی کہ متھن نے انکار نہیں کیا تھا اور محض روایتی سے انداز میں کچھ سوچنے کی مہلت مانگی تھی۔

کونجاں اپنے بھائی سرمد کی وجہ سے پریشان تھی اور اس کا اظہار قادر بخش سے بھی کر چکی تھی جو اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ جب تک اس کا بھائی سرمد دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا، کونجاں کو بڑی سے بڑی خوشی بھی راحت نہیں پہنچا سکتی تھی حتیٰ کہ قادر بخش سے بیاہ کر کے بھی اس کے دل میں غم آگیں بوجھ رہتا لہٰذا قادر بخش نے کونجاں کا یہ اشارہ سمجھ لیا تھا...... اب وہ سرمد کے لئے متفکر رہنے لگا تھا...... اس نے اپنے خادم وزیر علی کو مخبر بنا رکھا تھا جو تھانے سے سرمد کے بارے میں تازہ معلومات قادر بخش تک پہنچاتا تھا۔

قادر بخش بھٹائی ہاؤس پہنچا تو اسے اپنے بھائی عاقل خان کی پریشانی نے آ لیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا گھر تباہ ہو۔

وہ سیدھا بھائی کے کمرے میں آیا...... عاقل خان اپنی مسہری پر پیشانی تھامے نیم دراز تھا...... قادر بخش کو دکھ سا ہوا...... اس نے ہولے سے بھائی کو پکارا...... وہ گزشتہ روز کی کدورت دور کرنا چاہتا تھا۔

"ادا سائیں......!"

عاقل خان نے قدرے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو جانے کیوں قادر بخش کو اس کی آنکھیں غمناک سی محسوس ہوئیں، اس کے چونکنے سے ایسا ہی معلوم ہوا جیسے وہ اس کا ہی منتظر تھا، وہ یکدم سیدھا ہوتے ہوئے قادر بخش سے بولا۔

"آ یار...... قادر بخش......! پتہ نہیں جانے کل تجھ سے کیسی بکواس کر ڈالی۔" یہ سن کر قادر بخش کا دل بھر آیا...... وہ فوراً آگے بڑھ کر بھائی کے گلے لگ گیا اور اس کے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گیا پھر بولا۔

"نہیں ادا سائیں......! میں نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں منایا...... بھلا بھائی کی بات کا کیا برا منانا اور وہ بھی بڑے بھائی کی......!"

"میں جانتا ہوں...... تو میرے ساتھ ہی رہا کر پھر دل اتنا اداس نہیں ہوتا میرا......" عاقل خان نے بوجھل سے لہجے میں کہا تو قادر بخش کو اس کے چہرے پر غم دروں کی پرچھائیاں صاف نظر آنے لگیں۔

"ادا سائیں......! بھابھی اور بچے یاد آ رہے ہیں ناں......؟" قادر بخش نے فوراً کسی مقصد کے تحت کہا۔

"ہاں یار......! تیرے سے کیا چھپانا......" عاقل خان نے کہا۔

"بول تو میں خود جا کر بھاجائی اور بچوں کو لے آؤں......؟" قادر بخش فوراً بولا۔ بھائی کا گھر دوبارہ بس جاتا، اس سے بڑھ کر کون سی خوشی کی بات تھی اس کے لئے۔

"نا یار......! تیرے سے وہ لوگ کہیں جھگڑا نہ کریں۔"

"نہیں ادا سائیں......! میں کوئی لڑنے تو نہیں جا رہا۔"

"اچھا......! میں بھی چلتا ہوں پھر......" عاقل نے کہا۔



ہدایتاں کو یہ اطلاع اس کی ماں نے آ کر دی تھی...... وہ بہت خوش تھی۔

"اڑی دھیئے......! دیکھ اب آپڑیں ضد چھوڑ دے، تیرا مڑس (شوہر) خود تجھے لینے آیا ہے...... رکھ لے اس کا مان......"

اس وقت بہن کے پاس اس کے دونوں بھائی سائیں رکھیو اور مولا داد بھی بیٹھے تھے۔ مہمان خانے میں عاقل خان اور قادر بخش، زمیندار حکم داد کے ساتھ بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔

سائیں رکھیو اور مولا داد اظہار برہمی کے طور پر اپنے بہنوئی سے اب تک ملنے نہیں گئے تھے مگر زمیندار حکم داد نے مصلحتاً اپنے داماد اور اس کے چھوٹے بھائی کا خوش اخلاقی سے استقبال کیا تھا البتہ دوران گفتگو اس کا لہجہ خشک رہا تھا۔

ادھر ماں کی بات پر جیسے سائیں رکھیو اور مولا داد کو غصہ آ گیا۔ "آ مڑ......! تو

اندر جا کر بیٹھ...... یہ معاملے تیری سمجھ سے باہر ہیں...... ہل ونج......'' بیٹے کی بدتمیزی کی شاید ماں عادی تھی، وہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔

ہدایتاں کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے...... شوہر کے اتمام حجت کے انداز میں یہاں آنے سے اس کی انا کو تسکین ہوئی تھی، بجائے اس کے کہ وہ بھی جواباً انکسار آمیز رویہ رکھتی، اس کے غرور میں اور اضافہ ہو گیا جسے مزید تھپکیاں دینے میں اس کے دونوں بھائیوں سائیں رکھیو اور مولا داد کا بھی ہاتھ تھا۔

''ادی......! یہی وقت ہے اسے نیچا دکھانے کا...... اگر تو اس کے ساتھ آج چلی گئی تو ساری زندگی عاقل تجھے نوکرانی بنا کر رکھے گا۔'' سائیں رکھیو نے جیسے بھوبھل میں چنگاری کریدی۔

''ادا رکھیو بالکل صحیح کہتا ہے...... بھٹائی ہاؤس والوں کا دماغ درست کرنے کا اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔'' مولا داد نے بھی اسی انداز کا لقمہ دیا۔

دونوں بھائیوں کی لگائی بجھائی ہدایتاں کے دماغ میں ہمیشہ جلد ہی گھر کرنے لگتی تھی تاہم اپنے مجازی خدا کا احترام اس کے دل کے کسی عمیق گوشے میں فروزاں تھا مگر بھائیوں کے بھڑکانے والی شعلہ انگیز باتیں اس سے زیادہ فزوں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد زمیندار حکم داد کمرے میں داخل ہوا۔

''دھیئے......! اٹھ تیاری پکڑ، تجھے مڑس کے ساتھ جانا ہے آ پڑیں۔''

اس نے گہری متانت کے ساتھ بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور ہدایتاں سمیت سائیں رکھیو اور مولا داد کے منہ کھل گئے۔

''یہ کیا بابا سائیں......! ادی ہدایتاں، عاقل کے ساتھ چلی جائے گی تو پھر کیا باقی رہ جائے گا، آ پڑیں تو نک وڈھ جائے گی۔'' سائیں رکھیو نے باپ کے سپاٹ چہرے سے مرعوب ہوئے بغیر کہا تو زمیندار حکم داد اسے قدرے گھور کر بولا۔

''پتہ نہیں تم لوگوں کو کب عقل آئے گی...... اڑے بے وقوفو......! عاقل خود چل کر ہدایتاں کو لینے یہاں آیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا، مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ ایک سردار زادہ بیوی کی خاطر اتنا جھک سکتا ہے ورنہ ہماری حیثیت

کیا ہے۔''

''بابا سائیں......! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی...... اس کا مطلب ہے، وہ سردار زادہ جب چاہے ادی کی بے عزتی کرے اور جب چاہے آ کے لے جائے۔'' مولا داد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے باپ کی طرف دیکھ کر کہا تو زمیندار حکم داد تحمل مزاجی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ پٹ......! ہدایتاں کا بھٹائی ہاؤس چھوڑنے کا مطلب حصہ داری چھوڑنا ہے، ادھر جو ایک عورت حاکم زادی ناگن کی طرح بیٹھی ہے، اس کا میدان صاف ہو جائے گا سمجھنے کی کوشش کرو تم تینوں میری بات...... مرحوم سردار کی دوسری بیوی حاکم زادی کو ہدایتاں کے جانے سے خوشی ہو گی۔'' پھر وہ اپنی بیٹی ہدایتاں سے بولا۔ ''چل اٹھ......! آ...... میں تجھے عاقل خان کے ساتھ کرتا ہوں۔''

دونوں بھائی تذبذب کا شکار تھے مگر دوبارہ انہوں نے اڑنے کی کوشش نہ کی...... ہدایتاں نے ایک نظر اپنے چہیتے بھائیوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔



''آ مڑ......! یہ کیا...... با...... بھاجائی ہدایتاں تو واپس آ گئی...... میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ گئی سو گئی۔'' حاکم زادی کے بیٹے منصب خان نے ماں سے کہا تو حاکم زادی کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ زہریلے لہجے میں بیٹے سے بولی۔

''پٹ منصب......!'' تو اس کی گڑتی نہ کر...... میں اچھی طرح جانتی ہوں...... وہ آئی نہیں ہے، اسے سمجھا بجھا کر یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''مگر آ مڑ......! میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ عاقل خان خود چل کر آ پڑیں زال (بیوی) کو کیسے لینے چلا گیا۔''

''یہ ساری چالاکی قادر بخش کی ہے...... عاقل خان نے اس کے کہنے پر یہ قدم اٹھایا ہو گا۔'' حاکم زادی نے جواباً بیٹے سے کہا اور پھر بولی۔ ''ویسے تو اس کی فکر نہ کر...... ہدایتاں اور عاقل خان کے بیچ دراڑ پڑ چکی ہے...... اب دونوں زال، مڑس کے درمیان دمادم مست قلندر ہونے ہی والی ہے...... پر تو ایسا کر عاقل خان کو یہ باور

کرانے کی کوشش کر کہ اس نے آپڑیں سسر کے پاس جا کر اچھا نہیں کیا ہے، پر خیال رہے، غصہ مت دکھانا اور کوشش کرنا کہ یہ بات قادر بخش کے ہوتے ہوئے نہ ہو۔''

ماں کی بات سن کر منصب خان نے تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔



گھنگھرو کو ہوش آیا تو اس نے خود کو لاک اپ میں پایا...... اس کے ذہن پر ہنوز دھند چھائی ہوئی تھی ...... جب وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آئی تو اسے سارے پچھلے واقعات نیم خوابیدہ ذہن کی اسکرین پر روشن ہونے لگے ...... اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔

وہ دبیر دادا سمیت تین افراد کا خون کر چکی تھی مگر اسے اس کا مطلق غم نہ تھا...... وہ اپنی بہن پازیب کی وجہ سے فکرمند تھی، نہ جانے وہ کہاں دربدر ہو رہی ہوگی یا شاید ٹرین میں بیٹھ کر لاہور چلی گئی تھی۔

اس نے اپنی بہن کے لئے دعا مانگی کہ کاش وہ اس کی عزیز سہیلی نجمہ کے پاس خیریت کے ساتھ پہنچ جائے ...... خود کو جیل کی سلاخوں کی بلند دیوار کے روزن سے اندر آنے والی کرنوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ صبح ہو چکی تھی۔

کیا وہ ساری رات بے ہوش رہی تھی؟ اس نے فکرمندی سے سوچا...... اتنے میں اس کی نگاہ ایک پہرے دار پڑی...... وہ لاک اپ کا آہنی دروازہ کھول رہا تھا۔

''چلو تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔'' گھنگھرو چپ چاپ اس کے ساتھ راہداری میں چلتی ہوئی ایک کمرے میں آ گئی، سامنے ایک بڑی سی میز کے پیچھے ٹھگنا سا شخص اپنی توند سنبھالے کرسی میں دھنسا ہوا تھا...... وہ وردی میں تھا، چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں نے اسے مزید کرخت بنا رکھا تھا...... وہ گھنگھرو کی طرف گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔

''اے لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟''

گھنگھرو کو وہ وردی پوش انسپکٹر ایک آنکھ نہ بھایا مگر وہ خوفزدہ تھی، وہ پر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟''

اس کی بات سن کر ٹھگنا بدہیئت انسپکٹر غصے میں آ گیا، اس نے زور سے اپنے

ہاتھ میں پکڑا ہوا رول ٹیبل پر مارا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر پھنکارتے ہوئے بولا۔

''تجھے یہاں حکم چلانے کے لئے نہیں رکھا سمجھی چھوکری......! تو نے پورے تین بندوں کا خون کیا ہے۔''

گھنگھرو کو اس کے گھٹیا لہجے پر طیش آ گیا۔ بولی۔

''تمہیں عورت سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے ...... مجھے فوراً عورتوں کی جیل میں منتقل کرو ورنہ......!''

''ورنہ کیا...... کیا کرلے گی تو ...... ہیں......'' اس کا ترکی بہ ترکی جواب سن کر انسپکٹر آپے سے باہر ہو گیا۔ ''تو ایک خونی عورت ہے...... پھانسی سے کم سزا نہیں ہوگی تجھے...... سمجھی تو......'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں آنکھیں نکال کر بولا۔

''وہ لوگ بدمعاش تھے...... میری عزت لوٹنا چاہتے تھے ...... مجھے اپنی عزت بچانے کا حق تھا۔'' گھنگھرو نے کہا۔

''ہوں ...... عزت......!'' انسپکٹر نے لفظ چبایا یہ ''عزت'' آدھی رات کے وقت ان بدمعاشوں کے ساتھ کدھر جا رہی تھی؟''

''وہ مجھے اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔'' گھنگھرو نے بتایا تو پہلی بار انسپکٹر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''یہ فیصلہ تو اب عدالت میں ہی ہوگا۔'' بالآخر اس نے اپنی گرم مزاجی پر قدرے قابو پا کر کہا اور پھر ساتھ کھڑے سپاہی سے بولا۔ ''لاک اپ کردو۔''

گھنگھرو پریشان سی ہو گئی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ بولی۔ ''مجھے انسپکٹر خرم چوہدری سے بات کرنی ہے۔''

اس کی بات سن کر وہ ذرا چونکا مگر پھر دوبارہ اپنی ہٹ پر آتے ہوئے اور گھنگھرو کی بات نظرانداز کر کے دوبارہ سپاہی کو زہرناک نظروں سے گھورتے ہوئے دھاڑا۔

''تم نے سنا نہیں لے جاؤ اسے......''

وہ سپاہی بے چارا لرز گیا اور گھنگھرو کو ٹھوکا دے کر بولا۔ ''چلو بی بی......!''

مگر گھنگھرو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی اور درشتی سے بولی۔ ''میں یہاں

ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رہ سکتی ...... مجھے ابھی اور اسی وقت دومن جیل منتقل کرنے کا بندوبست کرو۔"

اس کی بات سن کر انسپکٹر نے شعلہ بار نظروں سے گھنگھرو کی طرف دیکھا پھر گھنٹی بجا کر ایک اور سپاہی کو اندر بلا کر گھنگھرو کو لاک اپ کرنے کا حکم صادر کیا۔

گھنگھرو چیختی چلاتی رہی اور دھمکیاں دیتی رہی مگر وہ دونوں سپاہی اسے بازوؤں سے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ وہ ایک بار پھر سیلن زدہ لاک اپ میں مقید ہو چکی تھی، وہ ننگے فرش پر سالخوردہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

پھر علی الصباح گھنگھرو کو لیڈیز جیل منتقل کر دیا گیا، وہاں بھی اس کا واسطہ ایک خرانٹ تھانیدارنی سے پڑا۔

اس کا نام عنایتاں لاشاری تھا، چالیس سے اوپر سن تھا...... الٹے توے کی طرح سیاہ بھجنگ اور چہرے پر حد درجے مہاسے اور کہیں کہیں گڑھے بھی پڑے ہوئے تھے جو اس کی کرختگی کو خوفناک حد تک نمایاں کرنے کا باعث تھے۔ اس نے بڑی خونخوار نظروں سے گھنگھرو کو سرتاپا گھورا پھر اس کا تفصیلی بیان قلمبند کیا۔

گھنگھرو نے اگرچہ دبیر دادا اور اس کے ساتھیوں سے متعلق یہ جھوٹ کہا تھا کہ وہ ان بدمعاشوں کو نہ جانتی تھی اور نہ ہی ان کے ناموں سے واقف تھی مگر اس وقت اسے پچھتاوا محسوس ہونے لگا جب ان تینوں بدمعاشوں کی لاشوں کو شناخت کر لیا گیا باقی دو جائے واردات سے فرار ہو چکے تھے۔ پچھتاوے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس خرانٹ تھانیدارنی نے فی الفور چاندنی بی کے کوٹھے سے رابطہ کیا اور اس سانحے کی اطلاع دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد چاندنی بی روتی پیٹتی منے خان کے ساتھ تھانے پہنچی۔

گھنگھرو کو اندازہ تھا کہ اب اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

ادھر چاندنی بی اور منے خان نے عنایتاں لاشاری کو کچھ کانٹ چھانٹ کے ساتھ ساری کھتا سنا ڈالی۔

گھنگھرو کو پھر تھانیدارنی کے کمرے میں طلب کیا گیا، اس وقت تک چاندنی بی وہاں سے جا چکی تھی ...... عنایتاں لاشاری کے چہرے پر زہرخند تاثرات ابھرے اور

اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا۔ "اے لڑکی ......! بڑی پاکیزہ بن رہی تھی ...... تو تو بازاری عورت نکلی ...... تو کیا سمجھ رہی تھی کہ جھوٹ بول کر تو نیک پروین بن جائے گی اور سزا سے بچ جائے گی۔"

گھنگھرو اس کی بات سن کر خوفزدہ سی ہو گئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

"جواب دو...... تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟"

دفعتاً عنایتاں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا رول زور سے میز پر بجایا ...... گھنگھرو کا دماغ ایک لحظے کو جھنجھنا سا گیا پھر پژمردہ آواز میں بتانے لگی۔

"میں ایک شریف زادی تھی ...... چاندنی بی نے مجھے بازاری عورت بنا ڈالا۔"

"ہا...... شریف زادی تھی تو پھر اسی دن کوٹھے سے باہر سڑک پر چھلانگ لگا دی ہوتی" عنایتاں نے مردوں والے انداز میں کہا۔

گھنگھرو اس جواب پر کڑھ کر رہ گئی اور چپ ہو رہی ...... اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب اسے پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا کیونکہ اس کی اصلیت ظاہر ہو چکی تھی کہ وہ کون تھی۔

پھر تھانیدارنی نے بھناتے ہوئے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا اور بولی۔

"اس پر دستخط کر دے۔"

گھنگھرو نے کاغذ ہاتھ میں لیا، اسے پڑھا تو لرز اٹھی ...... وہ ایک اعتراف نامہ تھا کہ اس نے دیدہ و دانستہ ایک پرانی دشمنی کے نتیجے میں دبیر دادا اور اس کے ساتھیوں کا خون کیا تھا اور اس کا تعلق نسلاً اس بازار سے تھا۔

یہ گھنگھرو کی طرف سے ایک خود ساختہ بیان تحریر کیا گیا تھا جس پر گھنگھرو کے دستخط کرنے کا مقصد تھا کہ پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھوں سے گلے میں ڈال لینا۔

"میں اس پر ہرگز دستخط نہیں کروں گی، سب جھوٹ لکھا ہے۔" گھنگھرو نے تقریباً چلا کر کہا تو عنایتاں نے آگے بڑھ کر اپنے بھاری بھرکم ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ گھنگھرو کے چہرے پر رسید کر دیا۔

گھنگھرو کے حلق سے چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھڑا سی گئی۔

"بکواس کرتی ہے...... تین معصوم اور بے گناہوں کا خون کر کے تو سمجھتی ہے کہ قانون کے سامنے خود کو نیک پروین ظاہر کر کے بچ نکلے گی۔" عنایتاں لاشاری اگلتی آنکھوں سے گھور کر زہر خند لہجے میں بولی۔ "سیدھی طرح اس اقبالی بیان پر دستخط کر دے ...... ہوسکتا ہے تیری سزا کم ہو جائے ورنہ......!" اس نے قصداً اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

گھنگھرو کو اپنے مضروب گال پر جلن ہونے لگی مگر اس سے کہیں زیادہ تکلیف اسے یہ سوچ کر ستانے لگی تھی کہ چاندنی بی نے اس تھانیدارنی کو خرید لیا تھا اور مزید یہ کہ اب وہ اپنے چہیتے گرگوں کی "قاتلہ" سے مزید ٹکے کھرے کرنے کی اس کی امید معدوم ہو چکی تھی لہٰذا وہ بزور رشوت اس خرانٹ تھانیدارنی کے ذریعے ہر قیمت پر اسے سزائے موت دلانے پر تلی بیٹھی تھی۔ اگرچہ گھنگھرو کو اب اپنی جان کی پرواہ نہیں رہی تھی مگر وہ مرنے سے پہلے اپنی معصوم بہن پازیب کو کسی باعزت مقام جس کی اسے ساری زندگی آرزو رہی تھی پر دیکھنا چاہتی تھی لیکن پھر بھی وہ اتنی آسانی کے ساتھ تر نوالا بننے پر بھی تیار نہ تھی۔

"کرتی ہے کہ نہیں دستخط......!" دفعتاً تھانیدارنی عنایتاں لاشاری کی کرخت آواز گونجی۔

گھنگھرو کی آنکھیں نمناک ہو چکی تھیں ...... چہرہ برسوں کا بیمار اور زندگی سے بیزار نظر آ رہا تھا مگر پھر بھی اس نے تھانیدارنی کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

تھانیدارنی عنایتاں اسے ایک لمحے زہر اگلتی نظروں سے گھورتی رہی پھر اس کے بعد وہاں موجود سپاہی عورتوں سے تحکمانہ انداز میں بولی۔ "اس کمینی کو لے جاؤ اور اس وقت تک مارتی رہو جب تک ہماری بات نہیں مان لیتی۔" تھانیدارنی کی بات سن کر دو سپاہی عورتوں نے گھنگھرو کو دبوچا اور گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے گئیں۔



اپنے گھریلو حالات سے نمٹنے کے بعد عاقل خان کو اب پازیب کی فکر ستانے لگی ...... بظاہر وہ مطمئن تھا کہ پازیب اس کی شہر والی کوٹھی کین جھر ہاؤس میں محفوظ تھی مگر شہر سے ایک خادم نے آ کر عاقل خان کو جب یہ چونکا دینے والی اطلاع دی کہ

پازیب اور گھنگھرو کین جھر ہاؤس سے پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئی ہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔

اس نے خادم کی خوب خبر لی، اس اثناء میں یہ بات بھی بھٹائی ہاؤس میں پھیل گئی مگر عاقل خان کو اس کی مطلق فکر نہ تھی ...... وہ اسی وقت اپنی جیپ میں سوار ہو کر شہر پہنچا اور سب ملازموں کو آڑے ہاتھوں لیا مگر یہ وقت ان باتوں میں ضائع کرنے کا نہ تھا۔

وہ اسی وقت دونوں بہنوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا...... شہر کا کونا کونا چھان مارا مگر دونوں بہنوں کا کچھ پتہ نہ چلا ...... عاقل خان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، وہ شدید ترین ذہنی ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دونوں بہنیں یوں اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں...... اس نے یونیورسٹی جا کر پتہ چلانے کی کوشش کی مگر بے سود...... یہ سوچ سوچ کر بھی وہ متفکر ہوا جا رہا تھا کہ کہیں وہ اس پراسرار قاتل کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی تھیں جو پازیب کو پہلے گھائل کر چکا تھا...... اس تصور سے وہ لرز اٹھا...... بالآخر ایک رات وہ سیدھا دندناتا ہوا چاندنی بی کے کوٹھے جا پہنچا...... کوٹھے میں خلاف توقع ویرانی مسلط تھی۔

اس وقت اپنے کمرے میں چاندنی بی اور منے مان سر جوڑے پازیب کو تلاش کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے ...... منے خان، چاندنی بی سے بڑے متفکر انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بائی جی......! پازیب کے سلسلے میں ہماری مدد تھانیدارنی عنایتاں لاشاری ہی کر سکتی ہے، وہ گھنگھرو کے منہ سے اس کے بارے میں اگلوا سکتی ہے۔"

"وہ ایسا ہی کرے گی منے......!" چاندنی بی نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "پہلے ذرا وہ گھنگھرو سے اقبالی بیان پر دستخط کروا لے پھر دیکھنا پازیب کا بھی پتہ چل ہی جائے گا۔"

اثنائے راہ ایک شخص نے آ کر عاقل خان کی آمد کی اطلاع دی ...... دونوں اس اطلاع پر چونکے۔

"وہ کیا کرنے آیا ہے یہاں......؟" چاندنی بی بڑبڑائی۔

"اسے بٹھاؤ...... ہم آتے ہیں۔" منے خان نے اچانک ملازم کو ہدایت دی پھر اس کے لوٹتے ہی وہ گھمبیر لہجے میں چاندنی بی سے بولا۔"آؤ اس سے بھی دو دو ہاتھ کر ہی لیتے ہیں۔"

"مگر اس کا فائدہ......!" چاندنی بی نے مستفسرانہ نگاہوں سے منے خان کی طرف دیکھ کر قدرے بیزاری سے کہا تو منے خان مکاری سے بولا۔"چاندنی بی! مت بھولو کہ پازیب کی طرف ایک راستہ اس کے عاشق کی طرف سے بھی جاتا ہے۔" منے خان کی ذو معنی بات سن کر چاندنی بی ذرا ٹھٹکی اور پھر اس کے ساتھ اٹھ کر چل دی۔

وہ دونوں ایک کمرے میں پہنچے جہاں عاقل خان بے چینی کے عالم میں ان کا منتظر تھا۔

دونوں نے عاقل خان کی طرف قدرے نخوت سے دیکھا۔

"گھنگھرو اور پازیب دونوں غائب ہیں......تم لوگ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" عاقل خان بیک وقت دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہمیں کیا معلوم......؟" جواباً منے خان نے نخوت سے کہا۔"وہ دونوں رانیاں تو تمہارے قبضے میں تھیں۔" عاقل خان کو منے خان کا بازاری لہجہ انتہائی ناگوار گزرا تاہم وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے برہماتی نظروں سے منے خان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرے پاس صرف پازیب تھی اس کی جان کو خطرہ تھا......گھنگھرو تو ادھر ہی رہتی تھی، تم لوگوں کے پاس......" اس کی بات سن کر چاندنی بی اور منے خان کے چہروں پر ایک رنگ سا آ کر گزرا اور دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر منے خان کے بشرے پر سوگواری عود کر آئی اور وہ اپنے لہجے میں دنیا جہان کا غم سمیٹتے ہوئے مکاری سے بولا۔"عاقل صاحب......! یقین جانو ہم خود ان دونوں کے لئے پریشان ہیں......مجھے تو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ دونوں بہنیں اپنے نامعلوم دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہوں۔"

عاقل خان اس کی بات پر زہرخند لہجے میں بولا۔"تم لوگوں سے بڑھ کر ان معصوموں کا دشمن اور کون ہوسکتا ہے......شرافت سے مجھے ان کا پتہ بتا دو ورنہ میں

ابھی تھانے جا کر تم لوگوں کے خلاف اغواء کا پرچہ کٹواتا ہوں۔"

چاندنی بی جو کافی دیر سے بھری بیٹھی تھی، تلملا کر بولی۔"زبان سنبھال کر بات کرو، یہ تمہاری اوطاق نہیں۔"

"اپنی زبان کو لگام دو گھٹیا عورت......" عاقل خان آپے سے باہر ہو گیا اور گرج کر بولا۔"اپنی گندی اور ناپاک زبان سے ہماری اوطاق کا نام مت لے۔"

"اے......اے......مسٹر زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں......ہم سب جانتے ہیں تم نے دونوں بہنوں کو کدھر غائب کروایا ہے۔" اس بار منے خان نے عاقل خان پر چڑھائی کر دی......اس کی بات سن کر عاقل خان کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے پھر وہ دانت پیس کر بولا۔"میں تم سب لوگوں کو دیکھ لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

چاندنی بی مارے غصے کے لال بھبوکا ہو رہی تھی مگر منے خان نے خود پر قابو پا رکھا تھا......اس نے فوراً اپنے ایک گماشتے کو بلایا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک گینڈا نما شخص وہاں حاضر ہوا......اس کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف تھا۔

"کھگے......! یہ شخص ابھی یہاں سے دندناتا ہوا گیا ہے، اس پر بڑی ہوشیاری کے ساتھ نظر رکھو......یہ پازیب کو تلاش کرنے میں ہمارے کام آ سکتا ہے......جیسے ہی یہ پازیب کا پتہ چلا لے، ہمیں آ کر بتانا۔" منے خان نے اسے ہدایت دی اور وہ کھگا نامی شخص اپنا گنجا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی منے خان، چاندنی بی سے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"چاندنی بی! تم بالکل چنتا نہ کرو......پازیب، گھنگھرو کا بہترن نعم البدل بنے گی، ہمارے لئے......تم دیکھنا ہمارے کوٹھے کی رونقیں دوبارہ بحال ہو جائیں گی۔"

چاندنی بی کا ستا ہوا چہرہ منے خان کی بات سن کر ایک لمحے کو کھل سا گیا اور وہ توصیفی لہجے میں بولی۔"منے خان......! اگر ایسا ہو گیا تو میرا وعدہ ہے تمہیں سونے میں تول دوں گی۔"

"ہم آپ کے پرانے خادم ہیں چاندنی بی......! تم دیکھتی جاؤ ہم کرتے کیا ہیں۔" منے خان نے اسرار بھرے لہجے میں جواب دیا اور چاندنی بی کی آنکھیں خوش

آئینہ تصور سے چمکنے لگیں۔



پازیب رات کے گھمبیر سناٹوں میں گرتی پڑتی جب اسٹیشن پہنچی تو لاہور جانے والی ٹرین روانہ ہو چکی تھی...... وہ نڈھال ہو کر وہیں سنسان پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر گر گئی۔

دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی سردی عروج پر تھی مگر اس سے پازیب کا چہرہ عرق آلود ہو رہا تھا...... وہ بری طرح ذہنی ہیجان کا شکار تھی...... ایک طرف اسے ٹرین چھوٹ جانے کا غم تھا تو دوسری طرف اسے اپنی بہن گھنگھرو کی فکر ستا رہی تھی۔ جانے ان بدمعاشوں نے اس بے چاری کا کیا حشر کیا ہوگا...... وہ زندہ بھی ہوگی یا...... اس سے آگے وہ سوچنے کی ہمت نہ کر سکی۔

ذرا دیر وہاں ستانے کے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے اپنی فکر ستانے لگی...... رات کے اس سمے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اکیلا پا کر کوئی بھی شیطان صفت شخص اس کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا، تب اس نے ایک ثانیے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔

پلیٹ فارم دور تک روشن تھا...... اکا دکا خوانچہ فروشوں کے سوا اسے کوئی دکھائی نہ دیا...... مسافروں کی وہاں عدم موجودگی اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ اب اگلے پانچ چھے گھنٹوں تک کوئی ٹرین آنے والی نہیں تھی...... انجانے خدشات سے اس کا دل دھڑکنے لگا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائے۔

جانے کیا بات تھی، وہ سر دست اس جگہ کو ہی اپنے لئے محفوظ سمجھ رہی تھی مگر یہاں بھی اسے چاندنی بی کے غنڈوں کا خوف بری طرح ستا رہا تھا...... ویسے وہ کب تک یہاں بیٹھ سکتی تھی، اس نے اضطراری انداز میں اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، رات کے ساڑھے تین بج چکے تھے، دفعتاً اسے اپنے قریب ہی کسی کے معنی خیز کھنکارنے کی آواز ابھری۔

اس نے چونک کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا...... وہ تین اوباش قسم کے نوجوان تھے، ہاتھوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اور بڑی گرسنہ نظروں

سے پازیب کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے...... پازیب کی حالت غیر ہونے لگی معاً ایک نوجوان نے اسے سنانے کے لئے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”لگتا ہے بے چاری کی ٹرین چھوٹ گئی ہے۔“

”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے...... پاس کا کوارٹر خالی ہے...... رات وہاں گزار لے...... صبح ٹرین میں بٹھا دیں گے۔“ دوسرے اوباش شخص نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

اب پازیب کو وہاں بیٹھنا دوبھر ہونے لگا، وہ بری طرح گھبرانے لگی پھر وہ جلدی سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے پلیٹ فارم کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگی جدھر اسٹیشن ماسٹر اور دیگر ریلوے کے عملے کے دفاتر تھے...... عقب میں اس کے وہ تینوں اوباش نوجوان بھی اس کے تعاقب میں لگ گئے۔

پازیب کے پاؤں من من کے ہونے لگے...... پورے وجود میں ایسی کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی گری کہ گری......

”کدھر جاتی پڑی ہے بابا...... چل ہمارے ساتھ...... تیرے یار نے دھوکا دے دیا ہے تو کیا ہوا...... ہم ہیں نا......“ پازیب کو اچانک اپنے عقب میں آتے ہوئے ایک لوفر کی یادہ گوئی کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ گھولتی محسوس ہوئی۔

ایک لمحے کو مارے ذلت کے خوف کی جگہ طیش کی آگ میں بھڑکنے لگی مگر وہ ان اوباشوں کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی...... اس نے اب تقریباً دوڑنا شروع کر دیا اور بالآخر عملے کے ایک دفتر میں پہنچ کر دم لیا...... دروازہ بند تھا مگر اندر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں...... اس نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔

”کون ہے بھئی، دروازہ توڑ دو گے کیا؟“ ایک بھناتی ہوئی آواز آئی اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھل گیا۔

سامنے ایک سادہ سی پتلون قمیض میں شخص نمودار ہوا...... پازیب کو دیکھ کر وہ قدرے چونکا۔

”خدا کے لئے میری مدد کرو...... وہ وہ بدمعاش......“ پازیب نے بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہنا چاہا مگر جس طرف اس نے اشارہ

کیا تھا، وہاں سے وہ اوباش نوجوان گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے، اسی لئے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا مگر وہ دبلا پتلا شخص جو ریلوے کا ملازم تھا، پازیب کی بات سمجھ گیا۔

''کون ہے اشرف......!'' معاً اندر سے ایک تحکمانہ آواز ابھری۔

''جناب......! ایک لڑکی ہے...... پریشان نظر آ رہی ہے۔ بہت......'' اشرف نامی شخص نے کہا۔ پھر وہ پازیب سے شائستہ لہجے میں بولا۔

''بی بی......! اندر آ جاؤ...... باہر سردی ہے۔''

پازیب اندر آ گئی۔ یہ ایک مستطیل کمرہ تھا...... دیواروں پر شیلف نما چوکور خانے نصب تھے، وسط میں لکڑی کی بڑی سی گول میز نصب تھی جہاں ایک پچپن سالہ شخص ریلوے کی مخصوص یونیفارم میں تھا......ٹیبل پر کچھ کاغذات اور ایک فائل کھلی ہوئی تھی...... دونوں شاید کچھ لکھنے کے کام میں مصروف تھے۔

''تم کون ہو بیٹی......! اس وقت ٹھٹھرتی رات میں......ڈ'' وہ اپنے چہرے سے موٹے عدسوں والی عینک اتارتے ہوئے بولا تاہم ساتھ ہی اس نے پازیب کو قریب ہی ایک کرسی پر آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جج...... جی...... وہ...... مم...... لاہور جانا چاہتی تھی کسی وجہ سے ٹرین چھوٹ گئی۔'' پازیب نے اپنی بدحواسی پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر مذکورہ شخص جو ایک مال گاڑی کا گارڈ تھا، کی پیشانی پر تفکر آمیز شکن سی نمودار ہوئی...... چند ثانیے ذرا سوچنے کے بعد ازراہ تفکر بولا۔

''یہ تو بیٹی واقعی تمہارے ساتھ برا ہوا......اس وقت کوئی ٹرین بھی آنے والی نہیں ہے...... میں خود ابھی چار بجے روانہ ہونے والی مال گاڑی کے میموز تیار کر رہا تھا، بس میں جانے والا ہوں۔''

پازیب گارڈ کی بات سن کر پھر پریشان ہوگئی اسے یہ بھلا مانس محسوس ہوا تھا مگر وہ تو پندرہ منٹ بعد اپنی بیزار کن ڈیوٹی پر روانہ ہونے والا تھا۔ پازیب کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر وہ چند ثانیے بعد تشفی آمیز لہجے میں بولا۔ ''پریشان مت ہو بیٹی......! کوئی بات نہیں مال گاڑی ہی تو ہے،

ذرا لیٹ ہوگئی تو کیا ہے، آؤ باہر چل کر کوئی ٹیکسی وغیرہ دیکھتے ہیں۔''

پازیب کا دل دھڑکا...... وہ کہاں جاتی......اس کا تو کوئی گھر تھا ہی نہیں...... بے چارہ گارڈ اپنی ڈیوٹی بھلا کر اسے گھر تک چھوڑنے پر تیار ہو گیا تھا......اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بے چاری تو بے خانماں ہوگئی تھی۔

ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ واپس کین جھر ہاؤس چلی جائے مگر پھر اس نے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ وہ وہاں بھی اب غیر محفوظ ہوگئی تھی...... چاندنی بی کے غنڈوں سے وہ کافی خوفزدہ تھی۔

''آؤ بیٹی! کیا سوچ رہی ہو؟'' دفعتاً گارڈ دوبارہ بولا۔

''مم...... میرا کوئی گھر نہیں...... اکیلی ہوں...... بب...... بالکل اکیلی......''

اپنی کم مائیگی اور بے بسی کے احساس غم آمیز تصور نے اسے بے اختیار بلک بلک کر رونے پر مجبور کر دیا۔ گارڈ بے چارہ حیرت سے پازیب کا چہرہ تکنے لگا۔



رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ دور کہیں لوکو شیڈ میں کسی انجن کی آواز گونج رہی تھی۔

کمرے کی فضا میں سکوت طاری تھا۔ پازیب کی سسکیاں ایسے ماحول میں عجیب تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اشرف اور وہ بھلا مانس گارڈ شش و پنج کا شکار تھے۔ ان دونوں کو اگرچہ پہلے پازیب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر پھر وہ پازیب کے آنسوؤں کو جھٹلا نہیں سکے تھے۔ دونوں بہ غور پازیب کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ پازیب بلاشبہ ایک دکھی لڑکی ہے اور پڑھی لکھی اور شریف خاندان سے اس کا تعلق ہے۔

چند ثانیے بعد گارڈ کے چہرے پر رحم دلی کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ چند قدم پازیب کی طرف بڑھا اور اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھتے ہوئے ازراہ ہمدردی بولا۔

''بیٹی......! روؤ مت......! پتہ نہیں تمہاری کیا مجبوری ہے۔ اللہ تمہاری مدد فرمائے۔ یہ بتاؤ اگر تم لاہور خیریت سے پہنچ جاؤ......تو وہاں تمہارے اپنے ہوں گے ناں......''

پازیب نے آنسوؤں بھرا پریشان چہرہ دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔ ایک نگاہ غم اٹھا کر گارڈ کی طرف دیکھا پھر ہولے سے رقت بھرے لہجے میں بولی۔

''ہاں......وہاں...... مجھے پناہ مل جائے گی۔ وہاں میرے اپنے موجود ہیں۔''

کہنے کو تو اس نے یہ کہہ دیا تھا مگر حقیقت اس سے مختلف تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ لاہور اپنی بہن گھنگھرو کی سہیلی نجمہ کے پاس وہ کن حالات میں پہنچتی اور وہ اس کی کیا مدد کر سکتی تھی؟ سب کچھ آس و یاس اور غیر یقینی کے اندھیروں میں گم تھا۔

دفعتاً باہر رات کے گھمبیر سناٹے میں انجن کی سیٹی دور تک گونجتی چلی گئی۔

گارڈ لمحے بھر کو مضطرب نظر آنے لگا پھر وہ ساتھ کھڑے اشرف سے بولا۔

''اشرف......!''

''جی سر......!''

''اس کے صبح تک یہاں رہنے کا بندوبست کرو۔''

''جی بالکل سر آپ بے فکر رہیں۔'' اشرف نے احتراماً جواب دیا۔

''اچھا بیٹی......! میں اب چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے صبح ہونے میں ابھی دو تین گھنٹے ہیں۔ کسی طرح یہ تھوڑا وقت یہاں گزار لو۔'' گارڈ اپنے کاغذات اور مختصر سا سامان وغیرہ سمیٹتے ہوئے پازیب سے مخاطب ہوا۔

پازیب نے رنجور نگاہوں سے گارڈ کی طرف اور پھر اشرف کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

گارڈ کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔

''بہن......! میں اپنے کوارٹر جا رہا ہوں۔ تم دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لینا۔'' گارڈ کے نکلتے ہی اشرف نے پازیب سے کہا اور پھر وہ بھی کمرے سے نکل گیا۔

پازیب نے اشرف کی ہدایت کے مطابق اندر سے کنڈی لگا لی۔ کمرے میں دو ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ کسی خیال کے تحت پازیب نے ایک بجھا دی۔ وہ اب کمرے میں تنہا تھی مگر قدرے پرسکون دگرگوں حالات کی سولی پر بھی پازیب کو نیند محسوس ہونے لگی۔ ایک کونے میں لمبی سی چوبی بینچ تھی۔ پازیب اس پر دراز ہو گئی۔ ذرا چین نصیب ہوا تو پازیب آنکھیں موندے شب گزشتہ کے روح فرسا خیالات میں الجھ سی گئی۔ اس کی بہن گھنگھرو کی دکھ بھری آواز اس کی سماعت میں گونجنے لگی۔

''پازیب......! خدا کے لئے چلی جاؤ۔ میری قربانی ضائع مت کرنا۔ جاؤ کسی طرح لاہور پہنچ جاؤ۔'' اس تکلیف دہ ذہنی گونج پر اس کی آنکھیں پھر نمناک سی ہونے لگیں۔ وہ اپنی بہن کی نصیحت نہیں ٹال سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ گھنگھرو نے اب تک اپنے نازک وجود کو حالات کی بے رحم آندھیوں کی زد پر رکھا تھا مگر پازیب کی زندگی کے معصوم چراغ کو ان سے اب تک بچائے ہوئے تھی۔ پازیب کو اس کا

ادراک تھا۔ اپنی بہن گھنگھرو کی قربانی رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ پھر پتہ نہیں کب پازیب کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن بند کھڑکی، دروازے، روشندان سے پلیٹ فارم کی مخصوص اور سمع خراش آوازوں سے پازیب کی آنکھ کھلی۔ نیند سے ہنوز اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اٹھی ...... صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ ابھی کسی سوچ میں مستغرق تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں پٹوں کی اوپری طرف نصب شیشوں سے پازیب نے اشرف کو کھڑے دیکھ لیا تھا۔ پازیب یکدم چونک کر اٹھی اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔

”بہنا...... ! لاہور جانے والی ٹرین آنے والی ہے۔ آپ اب ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ سکتی ہیں۔“

اشرف کے لہجے کی مصلحت آمیز عجلت کے ساتھ پازیب نے اور بھی کچھ بھانپ لیا تھا کہ اشرف ایک شریف انسان تھا۔ پازیب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئی۔ اسٹیشن پر بھانت بھانت کے مسافروں کی گہما گہمی، شور اور ٹرینوں کے آنے جانے سے پازیب کو حوصلہ ہونے لگا تھا۔

رات والا لاہور کا ٹکٹ اب بے کار ہو چکا تھا۔ اس نے آج کی تاریخ کا ٹکٹ کٹوایا اور ٹرین کا درست وقت پوچھنے کے بعد وہ لیڈیز ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد لاہور جانے والی ٹرین کی آمد کا اعلان گونجنے لگا۔ ایک بار پھر بھگدڑ کا سماں پیدا ہونے لگا۔

پازیب ویٹنگ روم سے نکل کر مطلوبہ پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی۔ ذرا دیر بعد ٹرین گڑگڑاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ اسی دوران اچانک پازیب کو محسوس ہوا جیسے دو لحیم شحیم افراد اسے قریب ہی کھڑے گھور رہے ہیں۔ ان میں ایک شخص کو دیکھ کر پازیب کی روح فنا ہونے لگی۔ وہ رات والے چار بدمعاشوں میں سے ایک تھا۔ تب اسے یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی کہ ان دونوں غنڈوں کا تعلق چاندنی بی سے تھا۔ پازیب کو اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ٹرین کے رکتے ہی پازیب جلدی سے ایک بوگی میں سوار ہوگئی لیکن وہ بری طرح دہل گئی جب وہ

دونوں بدمعاش گھورتے ہوئے اس بوگی میں سوار ہونے لگے تو پازیب خوفزدہ سی ہو گئی۔ تاہم اسے سردست ان بدمعاشوں سے کسی ”بہادری“ کی توقع نہ تھی۔ پازیب لیڈیز کمپارٹمنٹ کی ایک سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ بوگی میں کافی رش تھا۔ عورتوں کی ڈانٹ پھٹکار اور بچوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازوں سے ڈبہ گونج رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو پازیب کو بھی یہ شور ناگوار گزرتا مگر اس نازک اور مخدوش لمحے میں یہ سب اسے تحفظ اور عجیب سا حوصلہ عطا کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک اس کی نگاہ سامنے اٹھی اور اس کی سانس رکنے لگی۔ حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہونے لگے۔ وہ دونوں بدمعاش دانت بھینچے اور خونیں نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔



دور کھیرتھار کی فلک بوس چوٹیوں کے عقب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کے دراز ہوتے سائے جیسے ڈبلائی اور گورکھ کی چوٹیوں کو سرنگوں کرنے کے درپے تھے۔ گورکھ ہل اسٹیشن کی اکا دکا ٹمٹماتی روشنی بتدریج اترتے اندھیاروں میں موہوم سی امید کی جوت جگاتی محسوس ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ قوس کی صورت میں چمکتی ہوئی فولادی پٹری نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کے ذرا نیچے پشاور اور دادو، کراچی کی کوٹری بائی پاس ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کافی آگے جا کر جہاں دریائے سندھ کا چوڑا پاٹ نظر آ رہا تھا، منقسم ہو جاتی تھی۔

پہاڑیوں کی مغربی سمت نشیب میں چٹانی سا میدان اور اس کے بعد سریں اور کیکر کے گھنے جنگلات نظر آ رہے تھے۔ سردی عروج پہ تھی۔ جنگل کے وسط میں ایک خاصے مسطح قطعے میں پھونس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور کچھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

یہ نظرو دھاڑیل کا نیا ٹھکانہ تھا۔ گوٹھ وسند خان کے واقعے کے بعد اس نے اپنی پرانی کمین گاہ تبدیل کر لی تھی۔ ایسا اس نے اپنے ساتھی جانو ماچھی اور سرمد کے باہم مشورے سے کیا تھا۔

ایک جگہ الاؤ روشن کئے دائرے کی صورت میں نظرو دھاڑیل، سرمد اور جانو

ماچھی اجرکوں کا نبھ باندھے بیٹھے تھے۔ گروہ ہی کے دو اور ساتھی بھی ان میں شامل تھے اور خاموشی سے لانبی لانبی سلاخوں میں بھٹ تیتروں کو پروئے شعلوں پر سینک رہے تھے۔

سرمد نظرو دھاڑیل کے ساتھ جب سے اپنے بدترین دشمن زمیندار حکم داد سے مل کر آیا تھا، اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ اب تک اس کشش و پنج میں تھا کہ نظرو دھاڑیل کو یہ بات بتا دے کہ اس کا اصل دشمن یہی زمیندار حکم داد ہے، جس نے اس کی پرسکون زندگی کو متلاطم کر ڈالا تھا مگر پھر جانے کیوں اسے ایسا لگتا جیسے اس بات کے منکشف ہوتے ہی ان کی دوستی میں دراڑ نہ آ جائے تاہم جہاں دیدہ نظرو دھاڑیل نے سرمد کی یہ کیفیت تاڑ لی تھی۔

"اڑے سنگت......! بابا کیا بات ہے تو بڑا چپ کر کے بیٹھا ہے۔ ایسا لگتا ہے تیرے دل پہ کوئی بار آ گیا ہے۔" معاً نظرو دھاڑیل نے دوستانہ کشادہ دلی سے سرمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو سرمد لحظہ بھر کو چونکا۔ پھر ایک گہری ہنکاری لے کر بولا۔

"نہیں یار......کوئی بات نہیں ہے بس ویسے ہی......"

"دیکھ اپڑیں یار سنگت سے بھی چھپا رہا ہے نا تو......سرمد......"

نظرو دھاڑیل نے دوستانہ انداز میں شکوہ کیا تو سرمد نے ایک لمحے نظرو کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس نے لحظہ بھر توقف کے بعد اپنے اندر کی کشمکش اور زمیندار حکم داد کے بارے میں صراحت سے سب کچھ بتا ڈالا۔

ماحول یکدم پرسکوت ہو گیا، چہروں پر سناٹے عود آئے، شعلوں کی حدت سے چہروں پر ثبت خاموشیاں اور بھی بھیدوں بھری معلوم ہونے لگیں۔

"سرمد......! تو نے مجھ سے اب تک یہ بات کیوں چھپا رکھی تھی۔" ایک سنسنی خیز وطویل خاموشی کے بعد نظرو دھاڑیل طویل سانس خارج کرتے ہوئے سرمد کے چہرے پر اپنی سپاٹ نگاہیں مرکوز کر کے بولا تو ایک لمحے کو سرمد کو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اپنے وجود کو دیکھ کر جھرجھری کا سا احساس ہوا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے چہروں پہ عجیب سی نظروں سے تکے جا رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ ان کے ساتھ بیٹھے جانو ماچھی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ

کر گزر گیا تھا اور اس نے اپنے یکدم ابھرتے ہوئے تاثر کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے اب تک یہ بتانے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔" لحہ بھر سکوت کے بعد سرمد نے ہولے سے جواب دیا۔

"ہالا......کوئی بات نہیں...... پر اب کچھ سوچنا پڑے گا۔" نظرو دھاڑیل نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

اتنے میں ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ زمیندار حکم داد کا ایک آدمی پیغام لے کر آیا ہے۔ دونوں ایک لمحے کو چونکے پھر نظرو نے سر کے خفیف اشارے سے پیغام لانے والے شخص کو ادھر بھیجنے کا حکم دیا تو اتنے میں جانو بولا۔ "میرا خیال ہے سردار سائیں......! آپ ادھر ہی بیٹھو میں مل آتا ہوں۔"

"نہیں...... ادھر ہی اس سے بات ہو گی۔" نظرو اٹل لہجے میں بولا۔ جانے کیوں سرمد اس کی بات سن کر ٹھٹکا اور بہ غور جانو ماچھی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں اسے تذبذب کے آثار محسوس ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر جانو ماچھی نے زمیندار حکم داد کا پیغام لانے والے شخص کو ادھر آنے سے منع کیوں کیا تھا؟ اثنائے راہ ایک منحنی سے شخص کو وہاں لایا گیا۔

"ہا بابا......کیا بات ہے؟" نظرو نے بدلے ہوئے لہجے میں قدرے روکھے انداز سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"سائیں حکم داد...... آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے آپ کو اپڑیں اوطاق میں یاد کیا ہے۔ اس وقت میں گاڑی لایا ہوں۔" اس کی بات پر سرمد کا دل یکبارگی دھڑکا۔ جانو ماچھی بے چین نظر آنے لگا جبکہ نظرو دھاڑیل نے ایک لحہ سرمد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ سرمد نے ہولے سے اسے اشارہ کیا اور ذرا دیر بعد نظرو دھاڑیل اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

صبح دم نظرو دھاڑیل کی جنگل ڈیرے واپسی ہوئی تھی۔ سرمد ساری رات اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے اس بات کی بے چینی تھی کہ زمیندار حکم داد نے نظرو دھڑیل کو کون سے ضروری کام سے بلایا تھا۔

نظرو وہاں پہنچا تو سرمد اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ وہ بری طرح تمتما رہا

تھا۔ غصے اور مارے جوش کے اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے شعلے سے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زمیندار حکم داد سے کوئی جھگڑا کر کے آ رہا ہو۔

"کیا بات ہے...... خیریت تو ہے ناں......؟" سرمد نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"بس اب آج سے ہمارے راستے جدا ہو گئے۔" نظرو دھاڑیل نے گرجدار آواز میں کہا اور سرمد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

"زمیندار حکم داد سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔" نظرو دھاڑیل غصے سے بڑبڑانے والے انداز میں بولا تو سرمد کے حلق سے طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔

"کیا ہوا بابا...... کچھ تو بتا......" بالآخر سرمد نے پوچھا تو نظرو دھاڑیل نے چند ثانیے بعد حکم داد اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا ڈالا۔ کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہ تھی۔ زمیندار حکم داد نے نظرو دھاڑیل سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ کسی طرح مٹھن ہاری کے بیٹے سرمد کو تلاش کر کے قتل کر ڈالے۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ سرمد تو خود نظرو دھاڑیل کا یار غار ہے۔

"تو نے...... کوئی کاوڑ (غصہ) تو نہیں کیا تھا یہ سن کر......" سرمد نے اچانک یہ سن کر کسی خیال کے تحت نظرو کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کاوڑ کی حاجت تھی۔ اڑے بابا...... میں تو خود ہی اسے گولی مارنے کو تیار تھا...... پر......" غصے کی شدت سے وہ چپ ہو رہا۔

وہ دونوں پھونس کے ایک جھونپڑے کے اندر بیٹھے یہ ساری باتیں کر رہے تھے۔ گروہ کا ایک ڈاکو ساتھی جھونپڑی کے باہر موجود ان کی ساری باتیں کان لگائے سننے کے بعد فوراً وہاں سے کھسکا اور آناً فاناً جانو کے پاس پہنچا۔

"سائیں...... ! یہ تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ اپڑاں سردار نظرو تو الٹا سائیں وڈے (زمیندار حکم داد) کا دشمن ہو گیا۔"

جانو ماچھی نے خبر لانے والے اپنے کارپرداز کی بات غور سے سنی اور اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

وہ پھر سرگوشی میں جانو ماچھی سے بولا۔ "سائیں...... ! اپڑاں سردار تو اس کل کے چھوکرے سرمد کی خاطر اپڑیں وڈے سائیں کا بھی بیری ہونے لگا ہے۔ میرا خیال

ہے کہ وقت آ گیا ہے...... گروہ کی سرداری اب آپ کے ہاتھ میں آ جائے۔ اپڑیں سارے ساتھی آپ کے اشارے کے منتظر ہیں۔" اس نے اپنی بات ختم کی۔ جانو کی نظریں پرسوچ انداز میں کسی غیر مرئی نقطے پر مرتکز تھیں اور ساتھ ہی وہ دھیرے دھیرے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو بھی جنبش دے رہا تھا جیسے اسے اپنے اس گماشتے کی بات سے مکمل اتفاق ہو۔

ادھر سرمد اور نظرو دھاڑیل کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ گروہ میں اندر ہی اندر بغاوت کا ناگ کنڈلی مارے ڈسنے کو تیار بیٹھا ہے۔



انسپکٹر خرم کے آفس کے کمرے کے دیوار گیر کلاک میں اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ جہازی سائز میز کی سطح پر عاقل خان کا ایک ہاتھ مضطربانہ انداز میں پیپر ویٹ سے کھیل رہا تھا۔ وہ انسپکٹر کے سامنے والی کرسی پر براجمان تھا اور پچھلے ایک گھنٹے سے بیٹھا بیسیوں مرتبہ بے چینی کے عالم میں پہلو بدلتا رہا تھا اور اس گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران انسپکٹر خرم شہر کے مختلف تھانوں میں فون کھڑکا چکا تھا۔ چاندنی بی کو دھمکانے کے بعد عاقل خان اگلے دن کافی سوچ بچار کے بعد بالآخر سیدھا انسپکٹر خرم سے ملنے پولیس ہیڈ کوارٹر آیا تھا اور اسے گھنگھرو اور پازیب کی اچانک اور پراسرار گمشدگی کے بارے میں بھی بتا چکا تھا۔ ساری تفصیل سننے کے بعد انسپکٹر خرم نے فی الفور مختلف تھانوں سے رابطے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اس سے عاقل خان اس کے حسن اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس سلسلے میں انسپکٹر خرم نے جس تعاون کا مظاہرہ کیا تھا وہ بلاشبہ لائق تحسین تھا۔

"ہاں...... ماں...... وہی...... چاندنی بی سے تعلق رکھتی ہے۔ گھنگھرو ہی نام ہے اس کا......" انسپکٹر خرم نے آخری فون پر دوران گفتگو قدرے چونک کر کہا تھا اور گھنگھرو کا سراغ ملنے کی امید سے عاقل خان کے اعصاب تن گئے۔ بے چینی قدرے سوا ہونے لگی۔ امید بھری نظروں سے اب یک ٹک انسپکٹر خرم کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

"ہم ابھی پہنچتے ہیں۔" انسپکٹر خرم نے اتنا کہہ کر ریسیور کریڈل پہ رکھا۔

"کیا ہوا...... کچھ پتہ چلا؟" عاقل خان نے امید بھری نظروں سے انسپکٹر کی

طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس نے محسوس کیا، انسپکٹر کا چہرہ یکدم شکن آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور عاقل خان سے بولا۔ ''آئیں میرے ساتھ ...... بہت بری خبر ہے۔'' عاقل اس کی بات سن کر دھک سے رہ گیا۔ وہ دونوں کمرے کی چق ہٹاتے ہوئے تھانے کے احاطے میں کھڑی ایک موبائل میں سوار ہوئے، کچھ سپاہی بھی ساتھ ہو لئے۔

کوئی نصف گھنٹے بعد وہ دونوں تھانہ اے سیکشن لیڈیز پولیس انچارج عنایتاں لاشاری کے سامنے بیٹھے تھے۔ عاقل خان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ذرا ہی دیر پہلے عنایتاں انہیں گھنگھرو کے بارے میں تفصیل دے چکی تھی اور انسپکٹر خرم نے گھنگھرو سے ایک ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ عنایتاں انسپکٹر خرم سے کچھ زیادہ ہی مرعوب نظر آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی تھی کہ وہ سینئر پولیس آفیسر تھا۔ ذرا دیر بعد دو لیڈیز کانسٹیبل گھنگھرو کو لئے آ موجود ہوئیں۔

عاقل اسے دیکھ کر آنکھیں پھاڑے یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھنگھرو کی حالت انتہائی خستہ ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ پیلا اور خون جیسے سارے جسم سے غائب تھا۔ وہ اپنے قدموں پر بھی ٹھیک طرح سے کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا اور دہن ایسے وا تھا جیسے اسے سانس لینے میں بھی دقت کا سامنا ہو۔ وہ کسی کو پہچاننے تک سے بھی قاصر تھی۔ عاقل کا دل اس کی قابل رحم حالت دیکھ کر کٹ کر رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا دماغ گرم ہونے لگا اور وہ انسپکٹر عنایتاں لاشاری کی طرف گھورتی نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔ ''اس پر تشدد کیوں کیا گیا ہے؟''

عاقل خان کی بات سن کر عنایتاں کے چہرے پر ایک لمحے کو ناگواری کے تاثرات ابھرے پھر سپاٹ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''یہ ہمیں اس سے بھی بدتر حالت میں ملی تھی۔ آخر کو اس عورت نے ان کے تین ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ تو اس کا کچومر نکالنے پر تلے بیٹھے تھے۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی جو عین وقت پر ایسٹ ایریا کے انسپکٹر وہاں جا پہنچے تھے۔''

عاقل خان کو رتی بھر بھی عنایتاں کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر مصلحتاً وہ چپ ہو گیا۔ پھر گھنگھرو کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے نڈھال سے چہرے پر جھک کر رسان

سے بولا۔ ''گھنگھرو ......! مجھے پہچانو۔ میں ہوں عاقل خان ...... میری طرف دیکھو۔''

گھنگھرو کے چہرے پہ عجیب سے تاثرات ابھرے۔ اس نے نیم غنودہ سا چہرہ اٹھا کر عاقل خان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی تب اس کے ایک ہاتھ میں جنبش ہوئی۔ وہ انگلی کا اشارہ کرنے کے انداز میں اوپر اٹھنے لگا۔ خشک پپڑیاں جمے ہونٹوں پر لرزش ابھری۔

''تت ...... عاقل ......'' ایک نحیف آواز ان لرزیدہ لبوں پر بہ مشکل پھیلی۔

''ہاں ...... ہاں ...... میں عاقل ہوں۔ تمہاری یہ حالت کس نے کی ...... اور ...... اور ...... پازیب کہاں ہے؟'' عاقل خان نے جیسے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔ دکھ سے اس کا جی بھرنے لگا۔ اس کے پازیب سے متعلقہ آخری سوال پر قریب کھڑی انسپکٹر عنایتاں لاشاری کے کان یکدم کھڑے ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ رات سے لے کر اب تک مسلسل گھنگھرو پر ...... تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے اور اس سے ایک خود ساختہ اقبالی بیان پر دستخط کروانے کی سعی کے ساتھ عنایتاں نے اس سے پازیب کے بارے میں بھی اگلوانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کہاں تھی؟ اہم کام کے عوض چاندنی بی نے منے خان کے ذریعے انسپکٹر عنایتاں کو کافی بھاری رشوت کی پیشکش کی تھی۔

لیکن اب ...... اچانک انسپکٹر خرم اور عاقل کے ٹپکنے سے عنایتاں کو اپنا کام کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا بلکہ وہ پریشان سی بھی ہو گئی تھی۔ لہٰذا جب عاقل خان کو اس نے الم نصیب گھنگھرو سے اس کی بہن پازیب کے بارے میں استفسار کرتے دیکھا تو عنایتاں کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے شاید کچھ امید ہو چلی تھی کہ عاقل گھنگھرو کا کوئی قریبی جاننے والا تھا۔ اب گھنگھرو اسے ضرور پازیب کے بارے میں کچھ بتائے گی مگر یہ اس کی خام خیالی ہی رہی کیونکہ اگلے ہی لمحے گھنگھرو نے دانت پیس کر سامنے کھڑی عنایتاں کی طرف قہر بار نظروں سے دیکھا اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ کی انگلی کا اشارہ اس کی طرف کرتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''یہ ...... یہ ...... یہ جلاد عورت ہے، اس نے ...... اس نے مجھے بہت مارا ہے۔ بہت مارا ہے مجھے اس نے ......'' دکھ، غم اور احساس ذلت و بے بسی کے مارے گھنگھرو

کی نحیف آواز میں جانے کیسے غراہٹ آمیز سی گھن گرج اتر آئی۔ جوشِ غیظ سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ عنایتاں کے چہرے پر ایک لمحے کو جیسے زلزلے کے تاثرات ابھرے اور اس نے چور نظروں سے انسپکٹر خرم اور عاقل خان کی طرف دیکھا تھا جو گھنگھرو کی فریاد پر اب خاصی برماتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف گھور رہے تھے۔

''آپ نے اس عورت پہ تشدد کیا تھا؟'' معاً...... انسپکٹر خرم نے پہلی بار عنایتاں کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب......! تھوڑا بہت تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر کو ملزمہ نے ایک نہیں پورے تین بے گناہ افراد کی جان لی ہے۔'' انسپکٹر عنایتاں نے فوراً کہا۔

''آپ نے اس کا عدالتی ریمانڈ لیا ہے۔'' انسپکٹر خرم نے اپنی تیز نگاہیں اس کے چہرے پر مرتکز رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بھی لے لیں گے...... پہلے ملزمہ سے جرم تو قبولوا لیں۔''

''جھوٹ بولتی ہے یہ......'' معاً گھنگھرو کے نحیف ونزار وجود میں جنبش ہوئی اور وہ تقریباً ہسٹریائی انداز میں چلا کر بولی۔ ''میں نے اپنا جرم پہلے ہی قبول کر لیا تھا۔ وہ تینوں بدمعاش، مجھے اور میری معصوم بہن کو اغوا کر کے چاندنی بی کے کوٹھے پر لے جانا چاہتے تھے تاکہ پازیب کو بھی اسی کیچڑ میں ڈال سکیں۔ مجھے ان لوگوں نے ایک خود ساختہ بیان پر دستخط پر مجبور کرنے کے لئے ساری رات تشدد کیا ہے۔'' گھنگھرو بے ربط الفاظ میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اتنا بتا کر ہانپنے لگی اور ساتھ ہی فرطِ رقت سے رو پڑی۔

جونیئر پولیس آفیسر عنایتاں لاشاری کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ گھنگھرو کے نجات دہندہ یوں اچانک آ نمودار ہوں گے اور وہ بھی ایک وڈیرہ زادہ اور سینئر پولیس آفیسر خرم کے روپ میں...... وہ خاصی بوکھلا سی گئی تھی مگر پھر اگلے ہی لمحے اس کے سیاہ رو چہرے پہ روایتی اکھڑپن نمودار ہوتا چلا گیا۔ ادھر گھنگھرو کی داد فریاد پر عاقل خان کو ذہنی جھٹکا محسوس ہوا۔ وہ بری طرح انسپکٹر عنایتاں پہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''ہم گھنگھرو سے تنہائی میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'' معاً انسپکٹر خرم نے متانت سے کہا۔ ایک لمحے کو انسپکٹر عنایتاں کو تذبذب ہوا۔ پھر جواباً وہ بھی سپاٹ لہجے میں

انسپکٹر خرم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''معاف کیجئے گا...... چوہدری خرم صاحب! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ ملزمہ ایک خطرناک اور خونی عورت ہے...... اسے......''

''میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں...... یہ کون ہے......؟ ٹھیک ہے۔ میں پھر اعلیٰ حکام سے باقاعدہ پاور لے کر دوبارہ آؤں گا مگر یاد رکھنا...... اتنی زحمت اٹھانے کے بعد تم بھی میرے عتاب سے نہیں بچ سکو گی۔'' بالآخر انسپکٹر خرم نے عنایتاں کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ یہ وردی پوش چوروں کے لئے ایک نہایت ہی مؤثر نفسیاتی حربہ تھا۔ عنایتاں جانتی تھی کہ اس نے ملزمہ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی زیادتی کر ڈالی تھی۔ کیا حرج ہے اگر انسپکٹر خرم صاحب کی بات مان لی جائے تو...... لہٰذا اس نے ذرا دیر بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے ان کی علیحدہ ملاقات کا بندوبست کر دیا۔

اس کمرے میں اب وہ تینوں تنہا تھے۔ سامنے ایک اسٹول پر عاقل خان اور انسپکٹر خرم ایک کرسی پر براجمان تھے اور ان کے قریب ہی سامنے گھنگھرو بھی ایک بینچ پر سوگوار بیٹھی تھی۔ اس کے ستے ہوئے چہرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دکھ کی انتہائی کٹھنائیاں سہتے سہتے اس کی آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چکے ہوں۔ وہ ان دونوں کو سارے حالات کے بارے میں آگاہ کر چکی تھی۔ انسپکٹر خرم ساری کتھا سننے کے بعد پرسوچ اور گھمبیر خاموشی میں مستغرق تھا۔ جب کہ عاقل خان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اسے نہ صرف گھنگھرو کی حالت زار پر دکھ ہو رہا تھا بلکہ گھنگھرو کی زبانی پازیب کے متعلق یہ سن کر وہ شدید ترین تفکر آمیز اضطراب کا شکار ہو گیا تھا کہ پازیب آخر کو یوں تنہا کیوں کر لاہور جا سکتی تھی۔ عاقل خان نے گھنگھرو سے اس کی لاہور والی سہیلی نجمہ کے گھر کا ایڈریس لے لیا تھا۔

''گھنگھرو صاحبہ......! اگرچہ حالات آپ کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر میرا وعدہ ہے...... اسے آپ کے حق میں کرنے کی کوشش کروں گا۔'' ذرا دیر بعد انسپکٹر خرم نے کھنکارتے ہوئے گھنگھرو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بس آپ اپنے پہلے والے بیان پر ڈٹی رہیے گا۔''

''ہاں...... گھنگھرو......! تم بالکل فکر مت کرو۔ میں تمہارا کیس لڑوں گا۔'' عاقل

خان نے بھی ازراہ ہمدردی مگر صدق دل کے ساتھ اسے تشفی دی۔ گھنگھرو کے پژمردہ چہرے پہ لمحے بھر کو ہلکی سی آس کی جوت جاگی اور پھر مایوسیوں کے اندھیروں نے اسے نگل لیا۔ وہ کمزور اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھے اب اپنی گناہ آلود زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ دعا کرتی ہوں میری بہن پازیب ...... چاندنی بی جیسی سفاک اور ناپاک عورت کے ہتھے نہ چڑھ پائے۔" پھر عاقل خان کی طرف متوجہ ہو کر ملتجی لہجے میں بولی۔"عاقل صاحب......! میری معصوم بہن کے بارے میں معلوم کر کے مجھے ضرور اطلاع دینا تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔"

عاقل خان کا دل گڑھ سا گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گھنگھرو کے قریب آیا اور اس کے شانوں پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔"نہیں گھنگھرو صاحبہ...... مایوسی گناہ ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے، آپ تو بڑے حوصلے والی خاتون ہیں...... پھر یہ کیا ہوا؟ بے فکر رہیں، میں بہت جلد پازیب کی خیریت سے مطلع کروں گا اور چاندنی بی جیسی مکروہ عورت کو بھی کیفر کردار تک پہنچا کر دم لوں گا۔" عاقل کے لہجے کی اولوالعزمی نے گھنگھرو کے تن مردہ میں زندگی دوڑا دی۔ ان تینوں کے درمیان یہ ملاقات نصف گھنٹے کی تھی۔ پھر انسپکٹر خرم اور عاقل خان گھنگھرو کی تسلی و تشفی کے بعد تھانے سے رخصت ہو گئے۔



آسمان کی پیشانی پر تمتماتے تاروں کی سنگت میں جھومری کی طرح موجود روشن طباق چاند...... "بھٹائی ہاؤس" کو سوا گواری سے تکتا محسوس ہو رہا تھا۔ رات اپنے جوبن پر تھی، ہر سو گہرے سناٹے کا راج تھا۔

حویلی کے ایک کمرے میں دھیمے دھیمے انداز سے گفتگو کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ ہدایتاں کی خواب گاہ تھی۔ کمرے کے وسط میں جہازی سائز اور آرام دہ پلنگ پر دونوں بچے محو خواب تھے۔ البتہ ہدایتاں متفکر سی بیٹھی تھی۔ سامنے اس کے حاکم زادی پائینتی پر بڑا سا ایک تکیہ رکھے ٹکی بیٹھی...... ہدایتاں کے چہرے سے اس کی

کیفیات کو بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عاقل خان کے فوری شہر روانہ ہوتے ہی ہدایتاں کا ذہن پھر مکدر ہونے لگا تھا اور دل و دماغ پر خوابیدہ وسوسے انگڑائیاں لیکر ایک بار پھر بیدار ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس میں بھی زیادہ عمل دخل عیار حاکم زادی کی چرب زبانی کا ہی تھا۔

"یہ تو تو نے بڑی غلطی کی کہ یوں کچے دھاگے سے عاقل خان کے ساتھ بندھی چلی آئی۔ دیکھ لو...... چلا گیا ناں...... اب مطمئن ہو کر دوبارہ شہر گل چھرے اڑانے کے لئے۔" حاکم زادی مکارانہ سرگوشی میں بولی۔ ہدایتاں نے اس کی بات سن کر پرسوچ انداز میں دھیرے سے اپنا سر ہلایا۔ چہرے پر ہلکی سی پچھتاوے کی جھلک ابھری جسے مکار حاکم زادی فوری بھانپتے ہوئے دوبارہ بولی۔"پر...... کوئی بات نہیں جو ہوا سو ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ عاقل خان بہر حال تجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں خود اپنی گناہگار آنکھوں سے اسے پریشان اور آزردہ دیکھتی رہی ہوں۔ مگر...... یہ جو اس کا چھوٹا بھائی قادر بخش ہے ناں...... یہ اپنے بھائی کے نہ صرف تیرے بلکہ تیرے میکے والوں کے خلاف خوب کان بھرتا تھا۔"

"مگر امڑ......! قادر بخش تو خود اپنے بڑے بھائی کو مجبور کر کے میرے گھر تک لایا تھا مجھے لینے کے لئے......" دفعتاً ہدایتاں نے حاکم زادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو حاکم زادی بولی۔"یہ قادر بخش جو ہے نا...... بڑا چال باز چھوکرا ہے۔ تجھے کیا معلوم اس نے مٹھن ہاری کی بیٹی کونجاں والے معاملے میں تیرے پیو حکم داد کو کس طرح الجھا رکھا ہے۔ بڑے بھائی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ بظاہر اس کے بھلے کی بات کرتا ہے مگر درحقیقت اس کا نشانہ ہم لوگ ہیں۔ یہ چھوکرا ہمارے لئے کسی بھی وقت کوئی بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔ وڈے سائیں (سردار شیر دلخان) کی موت کو یہ بھولا نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر حاکم زادی ذرا تھمی پھر اِدھر اُدھر چور نگاہیں دوڑانے کے بعد انتہائی سرگوشیانہ لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔"اس چھوکرے قادر بخش کو شک ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہو گیا ہے کہ وڈے سائیں کی موت طبعی نہیں بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں...... ہاں...... پوسٹ مارٹم...... وہ قبر سے اپڑیں پیو کی لاش نکلوا کر اسے شہر کے وڈے ہسپتال لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے خود قادر بخش کی یہ

باتیں سنی ہیں جو وہ عاقل خان سے کر رہا تھا۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو رہی۔ ہدایتاں کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر لرزیدہ سی آواز میں بولی۔ ''یہ تو واقعی بہت خطرناک چھوکرا ہے۔ کیا کریں اس کا......''

''وہی جو ہم نے وڈے سائیں کے ساتھ کیا تھا۔ زہر ملا دودھ......'' حاکم زادی نے سفاکانہ مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کی اور ہدایتاں کو سردی کے باوجود اپنی پیشانی عرق آلود محسوس ہونے لگی۔



اب یہ سرمد کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی چھٹی حس کی کارستانی تھی کہ وہ گروہ کے اندرونی معاملات میں تبدیلی سی محسوس کرنے لگا تھا...... یعنی سب سے پہلے اس نے یہ بات محسوس کی تھی کہ گروہ کے اکثر افراد اب اپنے سردار نظرو دھاڑیل کا حکم نہ صرف ٹالنے لگے تھے بلکہ اس میں بلاوجہ نکتہ چینی کرنے کی بھی جرأت کرنے لگے تھے۔ بالخصوص جانو ماچھی کو کچھ زیادہ ہی چیں بہ جبیں ہوتے محسوس کیا تھا۔ اس کی شہ پر گروہ کے دوسرے ساتھی اس کی تقلید کر رہے تھے۔ سرمد ایک گہری فکر رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک سنسنی خیز گمان محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ایسا اندیشوں بھرا گمان ...... جس کا تصور ہی سرمد کو لرزا دے رہا تھا مگر اس نے یہ بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ نظرو اس تبدیلی کو محسوس نہیں کر رہا تھا جبکہ سرمد کی بے چینی اور پریشانی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ نظرو کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی ایک انجانے خطرے کی زد میں محسوس کر رہا تھا۔

''نظرو......! میں بغاوت کی بو محسوس کر رہا ہوں۔'' بالآخر ایک تاریک رات میں ...... جب وہ دونوں اپنی جھونپڑی میں تنہا رلی بچھائے لیٹے تو سرمد نے بالا تامل اور واضح الفاظ میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

اس وقت رات کا درمیانہ پہر تھا۔ جنگل ڈیرے پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ باہر جاڑا بھی غضب کا تھا۔ جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کے بولنے کی سمع خراش آوازیں بھی کہیں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ نظرو سرمد کی بات پر جیسے چونکا۔

''تو نے یہ کیسے محسوس کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے جانو ماچھی پر شک ہے کہ وہ کافی عرصے سے گروہ میں کوئی کھچڑی پکا رہا ہے۔''

''ہوں۔'' سرمد کی بات پر نظرو نے پرخیال انداز میں ہنکاری لی۔ اگر یہ بات کسی اور نے کی ہوتی تو نظرو مذاق میں اڑا دیتا مگر یہاں تو معاملہ سرمد جیسے وفادار اور مخلص دوست کا تھا جس کی بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ جھونپڑی میں ایک لمحے کو سکوت سا چھایا رہا۔ وہ دونوں تشویشناک نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے جا رہے تھے۔ پھر ذرا لحہ بھر توقف کے بعد سرمد نے گھمبیر لہجے میں نظرو کو اپنے شک کرنے کی وجہ بتائی جسے سننے کے بعد نظرو پرخیال انداز میں سر کو جنبش دینے لگا۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ طاری رہنے کے بعد سرمد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''جانو ماچھی پر اب نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ کسی بھی لمحے تمہارے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔''

اس کی بات سن کر نظرو دھاڑیل کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ کھل گئی۔ پھر وہ سرمد کے شانے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اڑے یار جس کا تیرے جیسا جاں نثار سنگت ہو، اس کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ کوئی شے نہیں رکھتا۔''

''مگر نظرو......! پھر بھی جانو ماچھی سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ ایک سانپ ہے...... آستین کا سانپ۔''

''بول ابھی جا کر اس کی گردن پکڑ لیتے ہیں۔''

''نہیں یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں جانو ماچھی نے بغاوت کا زہر گروہ کے اندر خاصی دور تک پھیلا دیا ہے۔ بڑی سمجھداری اور سوچ سمجھ کر اس کے خلاف کچھ کرنا پڑے گا۔'' سرمد اتنا کہہ کر پرخیال انداز میں چپ ہو رہا۔ اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

نظرو دھاڑیل بھی سنجیدہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ٹھیک اسی وقت باہر کچھ شور سا سنائی دیا اور ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ سرمد اور نظرو ایک لمحے کو بری طرح ٹھٹکے اور بجلی کی تیزی کے ساتھ اپنی ایم پی فائیو رائفلیں تانے

جھونپڑی سے باہر نکل آئے تو گروہ کے کافی لوگ انہی کی طرف چلے آ رہے تھے۔

"سردار سائیں......! پولیس نے ڈیرے کو گھیر لیا ہے۔" ایک ساتھی نے پھولی ہوئی سانس کے دوران بتایا تو وہ دونوں بری طرح چونک پڑے۔ پھر کہیں قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں گونجیں اور سب لوگ بری طرح ٹھٹک گئے۔

"پھیل جاؤ ...... چاروں طرف اور گھیرا توڑ کر فرار ہونے کی کوشش کرو۔" نظرو دھاڑیل نے چلا کر ساتھیوں سے کہا اور پھر وہ سب اپنی اپنی رائفلیں، گنیں، سنبھالے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ اس دوران سرمد نے بہ غور جانو ماچھی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ جانے کیوں ایک انجانے خطرے کے احساس تلے سرمد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس لمحے گولیاں چلنے کی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ سنائی دینے لگی تھیں۔

"چلو......سنگت...... اِدھر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں......" معاً نظرو دھاڑیل نے گم صم کھڑے سرمد سے کہا اور پھر دونوں تاریکی میں آگے بڑھ گئے۔

سرمد کا دل پولیس کے ریڈ پر نہیں بلکہ کسی اور ہی خیال سے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے کسی گھناؤنی سازش کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اب فائرنگ کے "آہنگ" سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ تبادلۂ فائرنگ کا آغاز دوطرفہ شروع ہو چکا تھا۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان باقاعدہ رن پڑ چکا تھا۔ سرمد کا خیال تھا کہ پولیس سے مقابلہ کئے بغیر ہی ڈیرے سے فرار ہوا جائے مگر نظرو دھاڑیل نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

"اڑے سنگت ...... یہ تو کیا کہتا ہے بابا ...... میڈے ساتھی بے جگری سے پولیس کا مقابلہ کریں اور ان کا سردار میدان سے بھاگ جائے۔ لگتا ہے تو گھبرا گیا ہے۔"

"نہیں ...... ایسی بات نہیں یار ...... مجھے پتہ نہیں کسی سازش کی بو آ رہی ہے۔ پولیس کا یوں اچانک حملہ ایک سوچی سمجھی سازش اور مخبری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ تو نے محسوس نہیں کیا کہ جانو ماچھی اب تک کہیں نظر نہیں آیا۔" سرمد نے ذرا خفیف ہو کر جواب دیا۔

"ہالا بابا ...... ہم پھر بھی پولیس کا مقابلہ کریں گے۔" نظرو دھاڑیل نے اپنی

رائفل پر ہاتھ مارتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

سرمد اس کے ساتھ تھا۔ جھاڑیوں والا ایک مسطح قطع تھا، اس کے بعد سامنے دو تین ٹیلے لمبے دکھائی دیئے۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ چاند کہیں روپوش تھا۔ مدھم روشنی میں دونوں کے دم بہ خود ہیولے اب جھکے جھکے آگے بڑھنے لگے۔ وہ دونوں ٹیلوں کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس ہولناک حقیقت سے قطعی بے خبر کہ عقب کی گھنی جھاڑیوں میں دبکا ہوا ایک انسانی ہیولا ان دونوں کو اپنی رائفل کے نشانے پر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر گھات میں بیٹھے اس پراسرار ہیولے کی رائفل نے اگلے ہی لمحے ایک دھماکے سے شعلہ اگلا اور نظرو دھاڑیل کے جسم کو ایک جھٹکا لگا، وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر گرا۔ ہیولا کی رائفل نے دوسری بار شعلہ اگلا۔ اس بار اس کا نشانہ سرمد تھا مگر سرمد نے اس سے پہلے ہی خود کو اس طرح زمین پر گرا لیا کہ گرتے ہی اس نے آناً فاناً آواز کی سمت لیٹے لیٹے شست باندھ کر اوپر تلے دو تین فائر جھونک دیئے۔ تاریک جھاڑیوں میں ایک انسانی چیخ ابھری تھی۔ سرمد کی گولیوں نے اپنا "کام" کر دکھایا تھا جبکہ اس نامعلوم حملہ آور کی دوسری گولی سرمد کے اوپر سے گزری تھی۔ سرمد کو یقین تھا کہ یہ چیخ اس کے نامعلوم دشمن کی آخری تھی۔ لہٰذا وہ اس طرف بڑھنے کی بجائے متوحش ہو کر اپنے جگری یار نظرو دھاڑیل کی طرف متوجہ ہوا، جو اب زمین پر پشت کے بل پڑا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

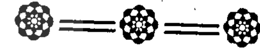
"نن ...... نظرو ...... میرے یار ...... یہ ...... یہ ......" مارے غم واندوہ کے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کا دل دکھ کے شدید احساس تلے امڈ آیا تھا۔ اس نے رائفل پھینک کر اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ دیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں نظرو دھاڑیل کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ ہونٹوں پر لرزش تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

"سس ...... سنگت ...... با ...... با ...... ہمارا ساتھ ...... بس اتنا ہی تھا۔"

سرمد کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "اڑے نہیں میڈے یار ...... تجھے کچھ نہیں ہو گا۔" سرمد نے رقت بھرے لہجے میں کہا اور جب نظرو کے ساکت جسم کو اٹھانے کی سعی کرنے لگا تو یکدم نظرو کی نحیف اور کرب میں ڈوبی ہوئی کراہ آمیز آواز ابھری "نا ...... نا ...... سنگت ...... ایسا نہ کر ...... آزار اور بڑھتا ہے ...... میں اب نہیں بچ سکتا۔ تو

...... بھاگ جا......'' اگلے ہی لمحے نظرو کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سرمد کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے دانت بھینچ کر اپنے کرب کو ضبط کرنے کی کوشش کی اور نظرو کے چہرے پہ آہستگی سے ہاتھ پھیر کر اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر دیا۔ سرمد کی آنکھوں سے اُمڈتے والے آنسو ابدی نیند میں غرق نظرو کا چہرہ دھوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ٹھیک اسی وقت سرمد کے اردگرد روشنیوں کا جیسے سیلاب امڈ آیا۔ ان گنت رائفلوں کی مہیب نالیں اس کی پشت سے آن لگیں۔



وہ سب پولیس اور رینجرز کے اہلکار تھے...... جدید اور خودکار ہتھیاروں سے لیس ساتھ میں طاقتور سرچ لائٹیں تھیں۔

سرمد کے وجود میں نہ ہی کوئی اضطراری جنبش ہوئی اور نہ اس کے چہرے پر دھر لئے جانے کا کوئی تاسف...... وقت جیسے تھم چکا تھا اور سب کچھ ختم ہو چکا تھا...... اس کے زانوں پر ہنوز نظرو دھاڑیل کا زندگی کی رمق سے عاری مردہ چہرہ ٹکا ہوا تھا۔ معاً ایک کڑک دار آواز سرمد کے کانوں سے ٹکرائی۔

''چلو اٹھو...... کھیل ختم ہو چکا اب......'' پہلی بار سرمد کے چہرے پر ہلکا سا تغیر ابھرا پھر اس نے مردہ نظرو دھاڑیل کے چہرے کو زمین پر آہستگی سے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھنے کے ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت کی جانب آہنی بیڑیوں سے جکڑ دیا گیا۔

سرمد کا چہرہ بجھ چکا تھا اور شکستگی کی مثل بنا ہوا تھا، اس پر آہنی کندے کا ٹھوکا دے کر اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا تو اس نے ایک وردی پوش بارعب اہلکار سے سپاٹ لہجے میں سامنے کی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ادھر ایک اور لاش بھی ہے...... میرے دشمن کی...... میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں، ایک نظر......''

پولیس اہلکار نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد چند جوانوں کو مخصوص اشارہ دیا......

تھوڑی دیر بعد ہی نہایت مستعدی کے ساتھ جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک لاش کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے اور اسے جب قریب لے کر آئے تو سرمد نے اس کا چہرہ پہچان کر انتہائی نفرت سے لاش کے چہرے پر تھوک دیا، وہ گروہ کے غدار نظرو دھاڑیل کا قاتل مار آستین دھاڑیل جانو ماچھی تھا جو سرمد کی گولیوں کا نشانہ بننے کے

بعد جہنم واصل ہو چکا تھا۔



پازیب کی خوفزدہ نگاہیں کھگے بدمعاش کے خونخوار چہرے پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں ...... اس کے ساتھ بدمعاش نے اب دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا...... اسٹیشن پر لوگوں کا اژدہام تھا...... پازیب کو اچانک کچھ حوصلہ ہوا...... وہ یکدم خوف سے باہر نکلی اور دونوں پٹریوں کے بیچ والے راستے پر تیز تیز چلنے لگی ...... اس کے عقب میں وہ بدمعاش بھی ہو لئے تھے۔

پازیب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ ابھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے محض اسے خوفزدہ کر کے اس پر چھا جانا چاہتے ہیں۔

ادھر پازیب نے کسی طرح پلیٹ فارم پر قدم ٹکا ہی دیئے، وہ بدمعاش اس کے تعاقب میں ضرور تھے مگر قریب آنے کی ابھی انہوں نے ہمت نہ کی تھی، پازیب مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گئی ...... وہ شدید اضطراب آمیز خوف کا شکار تھی ...... دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا...... اسے لاہور جانے والی ٹرین کے نکل جانے کا افسوس ہو رہا تھا...... وہ دوسری بار لاہور کا رخت سفر باندھتے باندھتے رہ گئی تھی مگر وہ کیا کرتی ...... ان بدمعاشوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ بھی ٹرین میں سوار ہو گئے تھے، مجبوراً پھر پازیب کو انہیں چکما دینے کے لئے دوسری طرف پٹریوں کے درمیانی خلاء میں اترنا پڑا تھا لیکن ملک الموت بنے یہ بدمعاش اس سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے ...... اچانک جب پازیب نے دزیدہ نظروں سے اپنے عقب میں دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا ...... وہ بدمعاش اب لوگوں کو تیزی سے پرے دھکیلتے ہوئے اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے ...... پازیب کو اپنا سانس رکتا ہوا اور پاؤں من من کے محسوس ہونے لگے پھر وہ تیز قدموں کے ساتھ بڑھنے لگی، اس کا سانس بے طرح پھولنے لگا تھا...... حلق خشک ہو رہا تھا ...... دفعتاً اس کی نگاہ ایک جانب باوردی ریلوے سیکورٹی فورس کے مسلح گارڈز پر پڑی، وہ تعداد میں تین تھے اور ریلوے اسٹیشن بالخصوص ٹرینوں وغیرہ میں دہشت گردی کے ممکنہ خدشے کے پیش نظر چیکنگ میں مصروف تھے۔

پازیب کو ذرا ڈھارس ہوئی تو وہ فوراً ان کی طرف بڑھی۔ ''مم ...... میرے پیچھے وہ ...... بدمعاش......'' پازیب نے ان کے قریب پہنچ کر اتنا ہی کہا تھا کہ اپنے اشارے کی سمت دیکھ کر اس کے الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے ...... وہ بدمعاش گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے مگر ان اہلکاروں نے پازیب کی بات کا فوری نوٹس لیتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''بی بی! کیا ہوا ہے...... خیریت تو ہے...... کس سے خوفزدہ ہو؟''

''میرے پیچھے کچھ بدمعاش چلے آ رہے تھے شاید اب کہیں غائب ہو گئے ہیں۔'' پازیب نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے انہیں بتایا۔ ان تینوں نے مسافروں کے اژدہام میں ایک نظر ڈالی پھر ایک نے پازیب سے پوچھا۔

''آپ کو جانا کہاں ہے......؟''

''لاہور......!''

''مگر لاہور والی ٹرین تو ابھی ابھی نکلی ہے۔''

''ہاں ...... مجھے آنے میں ذرا دیر ہو گئی تھی ...... پلیز آپ بتا سکتے ہیں کہ اب لاہور جانے والی دوسری ٹرین کب تک آ جائے گی؟'' پازیب نے لجاجت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے گھنٹے بھر بعد چناب ایکسپریس آئے گی۔'' دوسرے نے فوراً بتایا پھر ایک نے ازراہ تشفی اس سے کہا۔ ''سنو بی بی! گھبرانے کی بات نہیں ...... یہ لوفر عورتوں کو دیکھ کر تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہی ہیں مگر اس سے زیادہ کی ان میں جرأت نہیں ہو سکتی پھر بھی اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو ہم ادھر ہی گشت پر ہیں ...... آپ ادھر ہی کسی بینچ پر بیٹھ کر ٹرین کے آنے کا انتظار کر سکتی ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ گشت میں مشغول ہو گئے۔

پازیب پریشان سی وہاں کھڑی رہ گئی ...... یہ تو پازیب ہی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بدمعاش محض چھیڑ چھاڑ نہیں کر رہے تھے مگر پازیب سیکورٹی اہلکاروں سے کھل کر ان بدمعاشوں کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی جو بلاشبہ چاندنی بی کے ہی اس کی تلاش میں بھیجے ہوئے پالتو غنڈے تھے۔

پازیب کو کسی طور ڈھارس ہوئی تھی ...... وہ بار بار مضطربانہ انداز میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی، وہ بدمعاش ابھی اسے کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے ...... پازیب اب ایک دوسری الجھن کا شکار ہو چکی تھی ...... وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ان حالات میں جبکہ چاندنی بی کے غنڈوں نے نہ صرف اسے دیکھ لیا تھا بلکہ اس کے ارادۂ سفر سے بھی واقف ہو چکے تھے ...... اس کا اب لاہور کی طرف سفر کرنا مناسب رہے گا؟ دماغ نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا ...... پازیب جانتی تھی کہ یہ بدمعاش سائے کی طرح اس کے تعاقب میں لگے تھے اور سردست وہ کہیں دبک گئے تھے مگر انہوں نے اپنے احاطۂ نظر سے اسے دور نہیں کیا ہوگا، موقع ملتے ہی شکاری کتوں کی طرح اس پر دوبارہ جھپٹ سکتے تھے کیونکہ پازیب جانتی تھی کہ یہ کوئی عام غنڈے نہ تھے، چاندنی بی کے غنڈے تھے جو پاتال تک بھی اپنے شکار کا تعاقب کرتے ہیں۔ اپنی بدنصیب بہن گھنگھرو کی المناک مثال اس کے سامنے تھی ...... اسے اب صحیح معنوں میں اندازہ ہونے لگا تھا کہ گھنگھرو نے کیسے خطرناک اور سفاک لوگوں کے بیچ رہ کر اسے اس گندے جوہڑ سے دور رکھا تھا۔

اپنی بہن گھنگھرو کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دماغ جلنے لگا ...... نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی ...... وہ ابھی اس تذبذب کا شکار تھی کہ لاہور جانے کا اپنا ارادہ بدل ڈالے اور یہیں سے واپس کین جھر ہاؤس لوٹ جائے کہ اچانک اس کی سماعتوں سے غراتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''کوئی فائدہ نہیں بھاگنے کا ...... شرافت سے ہمارے ساتھ چلی چلو ورنہ ہم اس بھرے مجمع میں بھی تمہیں آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔''

پازیب کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا ...... اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خوف سے لرزتے ہوئے گردن اٹھا کر قریب ہی کھڑے کھگے بدمعاش کی طرف دیکھا جس نے پازیب کے اپنی جانب متوجہ ہوتے ہی اس کو مزید خوفزدہ کرنے کی غرض سے اپنے لیدر کی جیکٹ کے اندر رکھے مہیب پستول کی جھلک دکھائی تھی۔

''چل رہی ہے پھر ہمارے ساتھ ......؟'' معاً اس کے دائیں جانب کھڑے

دوسرے بدمعاش نے جیسے ٹھوکا دیا۔

''نہیں ...... نہیں ......! میں ہرگز تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی ...... چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' بالآخر پازیب نے اپنی منتشر ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے انہیں دھمکایا اور ساتھ ہی مدد کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اس ثناء میں یہ بدمعاش فوراً وہاں سے کھسک گئے پازیب نے پھر قدرے سکھ کا سانس لیا مگر وہ اس بات بھی واقف تھی کہ زیادہ دیر لوگوں کا یہ رش اسے تحفظ نہیں دے سکتا تھا ...... وہ ہر پل غیر محفوظ تھی، اب تو ان غنڈوں نے اسے قتل کرنے کی بھی دھمکی دے ڈالی تھی، اس بات نے پازیب کو مزید دہشت زدہ کر ڈالا تھا ...... وہ سخت مشکل کا شکار ہو چکی تھی دفعتاً ایک بچے کی آواز سن کر چونکی۔

''باجی ...... باجی ......! یہ شربت پی لیں ...... آپ کو پیاس لگی ہوگی۔'' وہ ایک معصومانہ منت سماجت سے بولا۔ پیاس تو پازیب کو واقعی لگی تھی۔

''صرف ایک روپیہ کا گلاس ہے باجی ......!''

اس کے معصوم لہجے میں پازیب کو ایک التجا محسوس ہوئی، اسے اس پر ترس آ گیا اور ویسے بھی پازیب کا پیاس سے برا حال تھا، اس نے گلاس لے کر غٹاغٹ پی لیا اور پرس سے پانچ روپے نکال کر بچے کو تھما دیئے ...... بچہ واپس پیسے لوٹانے لگا مگر پازیب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا ...... بچہ جلدی سے غائب ہو گیا۔

پازیب اس حقیقت سے غافل تھی کہ ذرا فاصلے پر ایک ٹی اسٹال پر کھڑے کھگا اور اس کے دو ساتھی معنی خیز نظروں سے پازیب کو گھورے جا رہے تھے ...... ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سی تھی۔ جو بچہ، پازیب کو شربت پلانے کے بعد غائب ہو چکا تھا، اس نے انہی بدمعاشوں کے ایما پر پازیب کو شربت کا گلاس دیا تھا ...... کھگے نے بڑی صفائی کے ساتھ بچے کے شربت والے گلاس میں بے ہوشی کا سفوف ملا دیا تھا ...... بچے کو اس کا پتہ نہیں چلا مگر انہوں نے بچے کو کسی طرح اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ پازیب کو جا کر شربت کا گلاس پلا دے۔

وہ معصوم تھا ...... اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کا کیا مقصد ہے، بہرطور بچہ اپنا کام کر کے چلا گیا تھا ...... پازیب کو کھڑے کھڑے چکر سے آنے لگے، اس نے بے

اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا...... پازیب کے وجود کو لہراتا دیکھ کر کھگا اپنے ساتھی سمیت پازیب کی طرف بڑھا...... ادھر پازیب بے ہوش ہو کر گرنے ہی لگی تھی کہ کھگے اور اس کے ساتھی نے اسے سنبھال لیا اور چہروں پر پریشانی اور تفکر کے آثار پیدا کر کے انہوں نے جلدی سے پازیب کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے...... اس اثناء میں اردگرد کے لوگ بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”باجی...... باجی! ہوش میں آؤ“ معاً کھگا بدمعاش لوگوں کے سامنے جھوٹ موٹ کا اپنا پازیب کے ساتھ تعلق جوڑتے ہوئے دکھاوے کی غرض سے پازیب کو پکارنے لگا...... ادھر اس کا دوسرا ساتھی بھی روہانسی آواز میں بے ہوش پازیب کا گال تھپتھپاتے ہوئے جیسے بڑبڑایا۔ ”کہا بھی تھا میں نے...... بھائی جان آپ سے، انہیں دوبارہ بھی یہ دورہ پڑ سکتا ہے...... ان کی دوائیں لے چلو ساتھ مگر آپ ہمیشہ سے اپنی مرضی چلاتے آئے ہیں۔“ یہ مکالمے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت کھگا اور اس کے ساتھی کے بیچ جاری تھے کہ مجمع سے ایک بھلے مانس شخص نے پازیب کے ”بھائیوں“ کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”ارے تم دونوں اب آپس میں لڑتے ہی رہو گے یا اپنی بہن کو کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس بھی لے جانے کا بندوبست کرو گے؟“

یہی تو وہ چاہتے تھے...... بس پھر کیا تھا، انہوں نے آناً فاناً پازیب کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور ایک ٹیکسی میں ڈال کر چاندنی بی کے کوٹھے کی طرف روانہ ہو گئے ......ان کے سفاک چہروں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔



سرمد کو ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیا گیا تھا...... اس کی گرفتاری کی خبر آناً فاناً پورے گوٹھ میں پھیل چکی تھی...... مٹھن ہاری اور کونجاں پر یہ بری خبر بجلی بن کر گری تھی...... مٹھن ہاری تو بے چارہ چارپائی سے لگ گیا اور کونجاں چپکے چپکے ایک کونے میں آنسو بہانے کے سوا کیا کر سکتی تھی...... بوڑھے باپ کی لاٹھی اور جوان بہن کا واحد سہارا سرمد......! ایک ”خطرناک“ مجرم کی صورت میں پولیس کی حراست میں تھا اور ہر کس و ناکس کو پتہ تھا کہ ایسے مجرموں کے ساتھ پولیس کیا حشر کرتی ہے...... اس پر مستزاد یہ

کہ سرمد، موجا خان کا قاتل بھی تھا۔

قادر بخش کو بھی اس خبر نے ہلا کر رکھ دیا...... قادر بخش اس کا دوست تھا اور اس کا واحد ایسا دوست تھا جو یہ تلخ حقیقت جانتا تھا کہ اسکی زمینوں پر کام کرنے والا ایک معصوم اور عام سا ہاری ڈاکو کیسے بنا......؟ قادر بخش بری طرح دل مسوس کر رہ گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری، وہ سنجیدگی کے ساتھ سرمد کا کیس لڑنے کی منصوبہ بندی پر غور کرنے لگا، اس نے فوراً سرمد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا...... وہ تصور میں کونجاں اور اس کے باپ مٹھن کو آنسو بہاتے دیکھ رہا تھا۔

جس شخص کے کانوں تک یہ خبر سب سے پہلے پہنچی، وہ زمیندار حکم داد تھا، اس کے آدمیوں نے اسے راتوں رات نظرو دھاڑیل اور سرمد کی گرفتاری کی خبر سنائی جس خبر پر زمیندار حکم داد کو دھچکا پہنچا تھا، وہ جانو ماچھی کا قتل تھا...... یہی تو وہ شخص تھا جس نے زمیندار حکم داد کو جنگل ڈیرے پر سرمد کی موجودگی کے بارے میں خبر دی تھی اور پھر حکم داد کا بھی دل نظرو دھاڑیل سے خراب ہو گیا تھا...... یہیں سے ان دونوں نے گروہی بغاوت اور نظرو اور سرمد کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بنے تھے اور ایک رات اچانک اینٹی ڈکیت فورس کو ان کے ڈیرے کی مخبری کر ڈالی تھی مگر جانو ماچھی خود بھی اپنی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا تھا۔

زمیندار حکم داد کے لئے بہرحال اتنا ہی کافی تھا کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر سرمد اب قانون کی حراست میں تھا اور جس کی رہائی کے دور دور تک امکانات نہ تھے...... اس کی بہن کونجاں کا مسئلہ اس نے اب اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا...... ایک دن اس نے اپنا ایک آدمی مٹھن ہاری کو بلانے کے لئے اس کے گھر روانہ کیا جس نے واپس آ کر اسے اطلاع دی کہ مٹھن ہاری سخت بیمار ہے۔ کسی خیال کے تحت زمیندار حکم داد کی آنکھیں یکلخت چمکنے لگیں...... اس نے اپنے ڈشکرے گہرام خان کو ساتھ لیا اور جیپ میں بیٹھ کر سیدھا مٹھن ہاری کے گھر روانہ ہو گیا جبکہ قادر بخش، مٹھن ہاری کے ہاں پہنچ چکا تھا اور اب وہ اندر کمرے میں بوسیدہ سی رلی بچھی چارپائی پر صاحب فراش مٹھن ہاری کے قریب بیٹھا اس کی دلجمعی میں مصروف تھا۔ کونجاں پاس ہی ایک کونے میں کھڑی سر جھکائے سسکیاں لے رہی تھی...... اس کا پلو آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔

''کونجاں......! کم از کم تم تو مت روؤ...... میرے ہوتے ہوئے کیوں گڑتی کرتی ہو......؟ اس طرح تو تمہارے بابا کو اور بھی دکھ ہوگا۔''

معاً قادر بخش نے بڑے رسان کے ساتھ گردن موڑ کر کونجاں کو تنبیہہ کی پھر مٹھن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''چاچا! تو گھبرا مت...... تیرا بخار ٹھیک ہو جائے گا، تو جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔''

مٹھن ہاری کا جھریوں بھرا چہرہ شدید غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا، بیٹے کے غم میں رو رو کر بوڑھی آنکھوں کے سوتے تک خشک ہو چکے تھے...... ایک دن میں وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا...... قادر بخش کی بات پر اسکے ضعیف ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی پھر وہ جیسے ملتجی لہجے میں قادر بخش سے نحیف و نزار سی آواز میں بولا۔ ''قادر بخش......! میڈے پٹ کو بچا لے...... وہی تو ہمارا سہارا ہے...... پولیس والے اسے...... اسے کہیں پھانسی......!'' الفاظ غم جگر کی مانند کٹ کر ادھورے رہ گئے...... اس وقت کونجاں کی تیز سسکی کمرے کے محدود ماحول کو اور بھی آزردہ بنا گئی...... سوگواری اور غم جیسے در و دیوار سے ٹپک رہے تھے...... باہر صحن میں سرد اور کاٹ دار شام کے سائے دراز ہونے لگے تھے...... خشک اور سرد ہوائیں بین کرنے لگی تھیں...... ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' قادر بخش فوراً یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور کوٹھری نما کمرے سے نکل کر صحن سے ہوتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا، جیسے ہی اسنے دروازہ کھولا، بری طرح ٹھٹک گیا پھر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر گہری نفرت اور ناگواری کے آثار امڈ آئے تھے۔

سامنے زمیندار حکم داد اور گہرام خان کھڑے اس کی طرف گھور رہے تھے اور تب زمیندار حکم داد کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ استہزائیہ لہجے میں قادر بخش کے جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے پر اپنی تیز نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

''واہ سائیں واہ......! ادھر سرمد کیا گرفتار ہوا، بیری توڑنے پہلے ہی تم پہنچ گئے۔'' اس کے لفظوں کی کاٹ نے قادر بخش کو سلگا کر رکھ دیا مگر وہ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے ناگواری سے بولا۔

''میں صرف اپنے بڑے بھائی کی وجہ سے خاموش ہوں لیکن اگر تم نے اپنی بکواس جاری رکھی تو میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے بھائی کے سسر ہو۔''

''اڑے بابا! آپڑیں سائیں وڈے کے ساتھ زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ......؟'' اس بار گہرام خان نے اپنی گماشتہ گری دکھانے کی ایک عامیانہ کوشش کی...... زمیندار حکم داد کے ساتھ کھڑے ہونے کی وجہ سے گہرام خان شاید یہ بات بھول گیا تھا کہ وہ کسی عام انسان کو نہیں بلکہ ایک سردار زادے کو دھمکا رہا ہے...... اب تک قادر بخش نے اس کی طرف ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا لیکن جیسے ہی گہرام خان نے قادر بخش کو دھمکایا، قادر بخش کا پورا وجود سنسنا کر رہ گیا اور اگلے ہی لمحے اس کا الٹا ہاتھ پوری قوت کے ساتھ گہرام خان کے چہرے پر پڑا اور وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

قادر بخش زہر خند لہجے میں اس کی طرف گھور کر غرایا۔ ''اگر دوبارہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہارے جیسے زر خرید غلاموں کو زنجیر ڈالنا جانتا ہوں۔'' قادر بخش کے گرجدار لہجے کا اثر تھا کہ گہرام خان خاموش مگر کینہ توز نظروں سے قادر بخش کو گھور کر رہ گیا۔

''قادر بخش......! یہ تم نے اچھا نہیں کیا...... یہ میرا نوکر نہیں مہمان ہے۔'' زمیندار حکم داد نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''میں نے اسے اس کی اوقات یاد دلائی ہے...... شاید تمہارے ساتھ رہتے ہوئے یہ اپنی حیثیت فراموش کر بیٹھا تھا۔'' قادر بخش نے جواباً اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس اثناء میں قادر بخش کو عقب میں دروازے پر کونجاں کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''قادر بخش......! ان سے الجھو مت...... اندر آ جاؤ...... تمہیں رب سائیں کا واسطہ......'' زمیندار حکم داد اور گہرام خان کے کانوں تک بھی کونجاں کی یہ آواز ٹکرائی تھی اور دونوں کے بشروں پر کرختگی اور جلاپے کے آثار سوا ہو گئے پھر زمیندار حکم داد اپنے حلق سے ایک طویل اور معنی خیز ''ہوں'' خارج کر کے قادر بخش کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے لوٹ آیا۔ قادر بخش بھی حقارت سے اپنا سر جھٹک کر

اندر آ گیا...... اندر کونجاں صحن میں ہی دروازے کے ذرا قریب موجود تھی ...... حیران و پریشان......

''اب یہ تمہیں تنگ کرنے کبھی نہیں آئیں گے۔'' قادر بخش نے نرمی کے ساتھ کونجاں سے کہا۔ کونجاں نے اپنی نگاہیں اٹھا کر قادر بخش کی طرف دیکھا...... اس کی کشادہ آنکھوں میں تشکر کے جذبات تھے۔

''آؤ اندر چاچا کے پاس چلیں۔'' قادر بخش نے ملائمت سے کہا اور پھر دونوں کمرے میں آ گئے۔

اندر چارپائی پر دراز مٹھن کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور بوڑھی آنکھوں میں بے چینی......

''کک......کون تھا......؟'' مٹھن کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز برآمد ہوئی۔

''وہی رذیل حکم داد اور اس کا زرخرید کتا گہرام خان......'' قادر بخش غصے سے دانت پیس کر بولا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ ازراہ تشفی مٹھن سے مخاطب ہوا۔ ''چاچا! تو گڑتی نہ کر، وہ اب کبھی یہاں نہیں آئیں گے، میں نے انہیں کھری کھری سنا دی ہے، اچھا ہی ہوا کہ میں اس وقت یہاں موجود تھا۔'' ایک لمحے توقف کے بعد قادر بخش دوبارہ قدرے رسان کے ساتھ بولا۔ ''چاچا......! تجھے زمیندار حکم داد سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... میں ہوں نا...... تیرے بیٹے جیسا...... بالکل دل چھوٹا مت کرنا۔''

قادر بخش کی اس بات نے بوڑھے مٹھن ہاری کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو چھلکا دیئے ...... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فرط جذبات اور شاید کمزوری کے باعث اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے تھے۔

''چاچا! سرمد میرا دوست ہی نہیں بھائیوں جیسا بھی ہے...... میں اس کے لئے بھی کوششیں کروں گا...... ایک اچھے سے وکیل کا بندوبست کر کے اس کا کیس لڑوں گا، شہر کی عدالت میں...... مجھے امید ہے سرمد کو کم سے کم سزا ملے گی۔'' قادر بخش نے کہا۔

اس نے دیکھا مٹھن ہاری کی غمناک آنکھوں میں ایک لمحے کو امید کی جوت لہرائی تھی، یہی حال پاس کھڑی کونجاں کا بھی ہوا تھا...... دونوں باپ، بیٹی، قادر بخش

کی طرف امید بھری نظروں سے تکنے لگے، جس میں ایک معصومانہ بے یقینی بھی شامل تھی جسے قادر بخش بھانپ کر پھر بولا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں ...... میں شہر جا کر سرمد کا کیس لڑوں گا ...... بس تم لوگ میری کامیابی کے لئے دعائیں کرتے رہنا۔'' اتنا کہہ کر اس نے ایک نظر کونجاں کے سُتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا پھر رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں......'' ٹھیک اس وقت مٹھن ہاری نے قادر بخش کی طرف دیکھ کر بے چینی سے پہلو بدلا...... پھر کمزور سی آواز میں بمشکل بولا۔ ''پپ...... پُٹ! ذرا ٹھہر جا......'' قادر بخش اس کے قریب چارپائی کی پائینتی پر بیٹھ گیا پھر مٹھن ہاری نے کونجاں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا، کونجاں کے جانے کے بعد وہ قادر بخش کی طرف دیکھ کر مجبور و مغموم سے لہجے میں بولا۔

''پُٹ......! مجھے اپنی گڑتی نہیں ...... میری حیاتی کا کوئی آسرا نہیں ...... پتہ نہیں مجھے صبح کا سورج دیکھنا نصیب ہوتا بھی ہے کہ نہیں ...... کونجاں کی طرف دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی میرا سانس گلے میں اٹک جائے گا...... تو نے کہا تھا نا کہ اس کا فیصلہ کر لے ...... میں نے آپڑیں کونجاں کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیا...... کیا کہتا ہے؟ ابھی مجھے جواب دے تا کہ میں سکون سے مر سکوں۔''

''نہیں چاچا......! تجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' قادر بخش اپنی اندرونی پرمسرت کیفیت کو دباتے ہوئے ترنت بولا۔ ''میرا جواب ہاں میں ہے چاچا......! کونجاں کو اپنی عزت بنا کر رکھوں گا۔''

مٹھن ہاری کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس خارج ہو گئی اور اس نے اپنی آنکھیں موند لیں ...... قادر بخش اسے سوتا محسوس کر کے باہر صحن میں آ گیا۔ رات سر پر تھی ...... کونجاں بھی کہیں سے صحن میں نمودار ہوئی ...... فضا پر بھیدوں بھرا سکوت طاری تھا ...... دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو چہرے تمتمانے لگے ...... دلوں میں چپکے چپکے جلنے والے محبت کے دیئے روشن تر ہونے لگے ...... برابر کی لگی ہوئی دلوں کی آگ نے مل کر جام محبت کو دو آتشہ کر ڈالا۔ کونجاں اس وقت ہی سب جان گئی تھی جب اس کے باپ نے اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کیا تھا، اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اس

کے باپ نے قادر بخش سے کس نوعیت کی بات کی تھی۔ قادر بخش کا جوش سے تمتمایا ہوا چہرہ بھی تو گواہی دے رہا تھا کہ تقدیر نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔

''کونجاں......! اب تو میری ہو گئی ...... ہمیشہ کے لئے......!'' قادر بخش نے پیار بھری حلاوت سے کہا۔ انداز کلام میں ملکیت کا غرور تھا......ایک محبت آمیز فخر تھا......قادر بخش کے محبت پاش جملوں نے کونجاں کے کانوں کی لوئیں سرخ کر دیں...... دل بے طرح انداز میں تڑپنے لگا۔

قادر بخش کی آواز کونجاں کو اپنی ساعتوں میں امرت گھولتی محسوس ہونے لگی۔

''اچھا کونجاں......! میں اب چلتا ہوں ...... بہت جلد بارات لے کر آؤں گا اور تمہیں ڈولی میں بٹھا لے جاؤں گا۔'' قادر بخش نے آخری بار ایک بھرپور نظر الفت کونجاں کے رخ دلفریب پر ڈالی اور چلا گیا۔



کونجاں کے گھر سے رخصت ہوتے ہی پہلا کام قادر بخش نے یہ کیا کہ ان دونوں باپ بیٹی کو حفاظت کی غرض سے اپنے ایک خاص آدمی وزیر علی اور دو ایک دوسرے ساتھیوں کو مٹھن ہاری کے گھر کی نگرانی کی ہدایات دیں۔ قادر بخش جانتا تھا کہ زمیندار حکم داد اور گہرام خان جیسے گدھ اس سانحے کے بعد کہ سرمد گرفتار ہو چکا تھا، اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کی خاطر پھر ان کے گرد منڈلانے لگیں گے......سرمد سے وہ پہلے ذرا خائف سے تھے......موجا خان کے قتل نے ان پر کچھ زیادہ دہشت طاری کر دی تھی مگر اب سرمد کے گرفتار ہوتے ہی وہ دونوں دانت نکوسے میدان میں اتر آئے تھے۔



زمیندار حکم داد اور گہرام خان کے چہرے احساس شکست اور ذلت سے بری طرح تلملائے ہوئے تھے، رات اپنے جوبن پر تھی، مٹھن ہاری کے گھر اور قادر بخش سے کھری کھری سننے کے بعد وہ دونوں سیدھے اوطاق میں آ بیٹھے تھے اور اس وقت کسی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ قادر بخش کو بھی سبق سکھا دینا چاہئے۔'' زمیندار حکم داد

نے گھمبیر لہجے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ہو سائیں......! میں تو کہتا ہوں آج ہی کی رات فیصلہ کن ہے۔'' گہرام خان بھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مقدور بھر پھاڑنے کی سعی کرتے ہوئے عالم غیظ سے بولا۔ ''میرا خیال ہے کونجاں کو اٹھانا چاہئے آج رات......!'' حکم داد سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''گہرام خان! یہ معاملہ اب بہت طویل ہو گیا ہے، اسے اب ختم ہو جانا چاہئے۔''

''برابر سائیں......! آپ ٹھیک کہتے ہو......آپڑیں وڈے بھوتار سائیں جونگل خان کا بھی ایک آدمی پیغام لے کر آیا تھا ٹھٹھے سے......'' گہرام خان نے کہا۔ ''آپ نے مٹھن ہاری کی اس کونجاں کے حسن کی ایسی تعریف کی ہے کہ آپڑیں وڈے سائیں سے صبر نہیں ہوتا پڑا......'' اس نے اپنی بات ختم کی تو حکم داد کی پیشانی پر بھی تفکر آمیز سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

وہ جونگل خان کی جلد باز اور بیتاب طبیعت سے واقف تھا اور خوبصورت و معصوم چہروں کا وہ کس قدر شیدائی تھا، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا......اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہی تو حکم داد کونجاں کی صورت میں اسے یہ حسین تحفہ دینا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ وہ جونگل خان کے گوٹھ کا ایک ضمانتی آدمی موجا خان کو پہلے شادی کے ''مہذب'' پردے میں کونجاں کو اس کی بیوی بنانا چاہتا تھا جسے بعد میں وہ اپنے وڈے بھوتار سائیں جونگل خان کے چرنوں میں پیش کر دیتا......اب موجا خان کے مرنے کے بعد گہرام خان کو اس ناپاک مقصد کی خاطر منظر عام پر لایا گیا تھا مگر پہلے کونجاں کے باغیرت بھائی سرمد کی وجہ سے یہ مشکل کام نظر آنے لگا تھا اور اب قادر بخش کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑنے لگا تھا۔ حکم داد نے اب ایک جانب کونجاں والے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا تو دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جونگل خان کے کان میں کوئی بات ڈالنے کے بعد پیچھے ہٹنے کا مطلب اس سے ناراضی مول لینا تھا جو زمیندار حکم داد کسی طور بھی نہیں چاہتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حکم داد نے آج کی رات کونجاں کو اٹھوانے کا فیصلہ کرتے ہوئے

گھرام خان کو گرین سگنل دے دیا تھا...... یہ سن کر گھرام خان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں ...... وہ خود تنگ آیا ہوا تھا اور جلد سے جلد معاملے سے نمٹ کر واپس اپنے گوٹھ لوٹنا چاہتا تھا جو ٹھٹھے کے نواح میں تھا۔ حکم داد کی بات پر وہ مستعدی سے بولا۔ ''حاضر سائیں......! آپ حکم کرو، میں آج رات ہی مٹھن ہاری کے گھر نقب لگاتا ہوں ...... یہ موقع بھی اچھا ہے...... مٹھن ویسے ہی بیمار پڑا ہے۔''

''ہاں ...... میں تیرے ساتھ رمضو اور گولے کو کر دیتا ہوں۔'' حکم داد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ ایک ہی آدمی کافی ہے...... گولے کو میرے ساتھ کر دینا سائیں!'' گھرام خان نے جواب دیا۔

اور پھر وہ سر جوڑے سنجیدگی سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔

رات آدھی گزر چکی تھی ...... گارے مٹی سے بنے کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب قطاروں کے درمیان کالی بھٹ تاریک ڈیرے ڈال چکی تھی ...... تاروں بھرا آسمان صاف تھا اور کہیں سے چاند کا رخ روشن شوخ السپرا کی مانند جھانکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جس گلی میں مٹھن ہاری کا گھر تھا اس کے آغاز میں دو سائے مشکوک انداز میں داخل ہوئے تھے ...... یہ دونوں ڈھاٹا پوش تھے ...... بظاہر غیر مسلح تھے...... ان میں ایک گھرام خان اور دوسرا گولا تھا۔

یہ دونوں کونجاں کو اٹھانے آئے تھے...... وہ دونوں اب گلی کی دیوار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، مٹھن ہاری کا گھر اس دیوار سے ملحقہ چار پانچ گھر چھوڑ کر تھا۔ دفعتاً گھرام کے قدم رک گئے اور وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر سامنے تکنے لگا...... اس کی تیز آنکھوں نے عین مٹھن ہاری کے گھر کے سامنے ایک ہیولا دیکھا، وہ سگریٹ پی رہا تھا ...... چند ثانیے ٹہلنے کے بعد وہ اس گلی کے بطن سے نکلنے والی دوسری گلی میں چلا گیا، گھرام خان آگے بڑھا...... گولا اس کے پیچھے تھا۔

قادر بخش کی ہدایت کے مطابق وزیر علی نے اس رات کونجاں کی حفاظت کی غرض سے مٹھن ہاری کے گھر کی چوکیداری سنبھال لی تھی ...... گھرام خان نے جس شخص کے ہیولے کو تاریکی میں سگریٹ پیتے دیکھا تھا، وہ وزیر علی تھا...... وہ بظاہر ان دونوں سے لاپرواہ اپنی ہی دھن میں مگن سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتا ہوا بائیں جانب

ایک نسبتاً تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلی میں گھس گیا تھا، اگرچہ اس کی عقابی نظروں نے گلی کے شروع میں داخل ہوتے گھرام خان اور گولے کے متحرک سایوں کو دیکھ لیا تھا اور اب انجان بن کر بغلی گلی میں مڑ گیا تھا۔

گلی میں مڑتے ہی اسکے اعصاب تن گئے اور جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی ...... اس نے اپنی قمیض کی جیب میں ریوالور کی موجودگی کی تسلی کی اور پھر دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا...... اسی لمحے اس نے الو کی آواز نکالی، جواباً مٹھن کے مکان کی عقبی سمت اسکے ایک ساتھی شعبان نے بھی جوابی طور پر وہی آواز منہ سے برآمد کی اور ہوشیار ہو گیا۔

یہ ایک خفیہ سگنل تھا کسی ممکنہ خطرے کو بھانپ لینے کا اور خبردار کرنے کا بھی ......

ادھر گھرام خان اپنے ساتھی گولے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تھا...... مکان کے ذرا قریب پہنچ کر وہ رکے...... عقابی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہوں نے خفیف سا اپنا سر اثبات میں ہلایا اور اشاروں کنایوں میں ہی انہوں نے پہلے سے طے شدہ پروگرام پر عمل شروع کیا...... گولے نے عقبی دیوار کی راہ لی جبکہ گھرام خان سامنے کی دیوار پر نظر تولنے لگا...... کچھ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی، اس پر اپلے تھپے ہوئے تھے اور ایک ناگوار سی بو ان پر سے اٹھ رہی تھی مگر گھرام خان اس مکدر منظر کو کہاں خاطر میں لاتا، اس نے آناً فاناً بند دروازے پر ہلکی سی زقند بھری اور کسی جنگلی ''گو'' کی طرح دیوار سے چپک کر دروازے کی چوکھٹ پر دونوں پاؤں پھنسا کر اوپر چڑھنے لگا۔

پھر اگلے ہی لمحے وہ اندر صحن میں کود چکا تھا...... صحن میں کودتے ہی وہ چند ثانیے پھونس کے چھپر تلے دم سادھے پڑا سن گن لیتا رہا...... آس پاس زمین پر گھاس اور چارہ پھیلا ہوا تھا...... کونے میں ایک بھینس بھی بندھی ہوئی تھی ...... سردی سے بچاؤ کے لئے اس پر بوری پڑی ہوئی تھی۔

اس نے چند ثانیے وہیں دبک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر اس کی کھوجتی ہوئی نظریں سامنے کوٹھری پر پڑیں جہاں سے مدھم مدھم روشنی آ رہی تھی شاید اندر لالٹین جل رہی تھی ...... گھرام خان کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی، کوٹھری کا دروازہ ذرا وا تھا اور اگلے ہی لمحے اسے کسی کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دی ...... پہلے تو وہ

چونکا مگر پھر اگلے ہی لمحے جیسے اسے کسی بات کا ادراک ہونے لگا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ عود کر آئی ...... ہدف کو سہل جان کر وہ یکدم اٹھا اور پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور بلی کی سی بے آواز چال کے ساتھ وہ کوٹھری کے دروازے کے قریب آیا اور جھری سے آنکھ لگا دی۔

اک بوسیدہ رلی بچھی جھلنگا چارپائی کے قریب کونجاں بیٹھی اپنے باپ مٹھن کے بے جان وجود سے لپٹی روئے چلی جا رہی تھی ...... کونجاں کے گھٹے گھٹے رونے کے انداز سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کافی دیر سے اپنے باپ کے مردہ وجود سے لپٹی رو رہی ہو ...... اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر گہرام خان کی خوفناک آنکھوں میں شکرے کی سی چمک عود کر آئی۔

اگلے ہی لمحے وہ فتح کے نشے میں چور بڑے دھڑلے کے ساتھ دروازہ دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

کونجاں تڑپ کر اٹھی ...... ہراساں نگاہوں سے ایک اسلحہ بدست کو دیکھا اور بے اختیار اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی ...... گہرام خان نے آگے بڑھ کر تیزی کے ساتھ شکرے کی طرح کونجاں کو دبوچ لیا ...... اس کا نازک وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح گہرام خان کے شکنجے میں لرزنے لگا ...... قریب چارپائی پر مٹھن ہاری کا وجود بے سدھ تھا ...... وہ دنیاوی آلام سے بے نیاز ہو چکا تھا ...... کونجاں نے ہراساں ہرنی کی مانند خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور دوسری مرتبہ چیخنے کے لئے دہن وا کیا ہی تھا کہ گہرام خان نے اپنے ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا ...... چیخ اندر گھٹ کر رہ گئی۔

پھر ٹھیک اسی وقت جب وہ کونجاں کو بے رحمی سے گھسیٹ کر باہر لے جانا چاہ رہا تھا، کوٹھری کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور وزیر علی ہاتھ میں کلہاڑی لئے اندر داخل ہوا ...... گہرام خان ٹھٹکا ...... کونجاں کو معلوم نہ تھا کہ وزیر علی اس کا بہی خواہ ہے، وہ مزید ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔

''چھوڑ دے اس کو ورنہ ......!'' وزیر علی کلہاڑی سونت کر گہرام کی طرف قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا ...... گہرام خان کی آنکھوں میں اچانک خونخواری عود کر آئی اور وہ اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ ''میرے راستے سے ہٹ جا پرے

...... نہیں تو ......!'' یہ کہتے ہوئے گہرام خان نے اپنا پستول سیدھا کر دیا ...... وزیر علی کی ابلتی آنکھوں میں ایک ثانیے کو الجھن سی تیر گئی ...... گہرام خان، کونجاں کو دبوچے اور وزیر علی کو پرے دھکیلتے ہوئے کوٹھری سے باہر تاریک صحن میں آ گیا۔

''میں کہتا ہوں اس چھوکری کو چھوڑ دے ......'' وزیر علی نے جیسے فیصلہ کن دھمکی دی ...... وہ بھی بھناتا ہوا صحن میں آ گیا تھا، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ گہرام خان کے ہاتھ میں خطرناک پستول ہے۔

''تیرا بندوبست پہلے کرنا پڑے گا۔'' گہرام خان اس کی جانب شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر بولا اور اپنے پستول کا رخ وزیر علی کی طرف کرتے ہوئے لبلبی پر انگلی رکھ دی ...... ٹھیک اسی وقت ایک سایہ دیوار کی منڈیر سے نمودار ہوا اور کسی جنگلی بلے کی طرح اس نے گہرام خان کے اوپر چھلانگ لگا دی ...... پستول گہرام خان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ...... ان دونوں کے زمین بوس ہوتے ہی بے چاری کونجاں بھی نیچے آ رہی ...... اس کے حلق سے ہلکی چیخ خارج ہوئی۔

گہرام خان پر جھپٹنے والا وزیر علی کا ساتھی رمضان تھا ...... کچے فرش پر اب وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا تھے ...... وزیر علی اپنے ساتھی کو پہچان چکا تھا، وہ کونجاں کو سنبھالنے کے لئے لپکا ...... اس پر نیم غشی طاری تھی ...... گہرام خان کا ٹنٹا جلد نمٹانے کے لئے وہ اپنے ساتھی رمضان کی مدد کی خاطر میدان میں کود پڑا اور پھر جلد ہی ان دونوں نے ہانپتے ہوئے گہرام خان کو رسی سے جکڑ دیا۔



اسرار بھری رات دبے پاؤں گزر رہی تھی، بھٹائی ہاؤس پر گہرا سکوت طاری تھا ...... قادر بخش اپنے کمرے میں آتشدان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا ...... اس کی نظریں سلگتے ہوئے شعلوں پر جمی ہوئی تھیں مگر سوچ کر نگاہوں میں اس سے کہیں زیادہ پرتپش مناظر کی گرمی موجود تھی ...... اپنے بھائی عاقل خان کی دوبارہ اور اچانک شہر واپسی نے اسے پھر مجبور کر کے رکھ دیا تھا۔

اپنے باپ کی موت قادر بخش کے ذہن سے ہنوز محو نہیں ہو سکی تھی اور اس نے بارہا عاقل خان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی اور اس سازش کے درپردہ عناصر کو

بھی کیفر کردار تک پہنچانے کی اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا تھا مگر اس نے پہلے ہی دن سے محسوس کیا تھا کہ عاقل خان یہ بات سرے سے ماننے کے لئے ہی تیار نہ تھا کہ ان کے باپ سردار شیر دل خان کی موت کسی سازش کا نتیجہ تھی۔ باوجود اس کے کہ قادر بخش نے اپنے بھائی عاقل کو واضح لفظوں میں حویلی کی کالی بھیڑوں سے محتاط اور ہوشیار رہنے کو کہا تھا مگر اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا بھائی عاقل خان اس کی کسی بات کو درخور اعتنا سمجھتا ہی نہ تھا...... قادر بخش جتنا ان باتوں پر غور کرتا، اتنا ہی اس کا دماغ چلنے لگتا...... وہ حویلی میں درون خانہ گھناؤنی سازشوں کی بو سونگھ رہا تھا جس کے ڈانڈے اسے نہ صرف گھر کے اندرونی افراد بلکہ باہر کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملتے محسوس ہوتے تھے۔

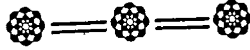
معاً دروازے پر آہٹ ہوئی...... دروازہ کھلا...... وہ خیالات سے چونکا پھر اپنی ماں دراں خاتون کو دودھ کا گلاس تھامے اندر آتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی...... اپنی معصوم اور پرشفیق ماں کے چہرے پر ممتا بھری حدت کو محسوس کر کے قادر بخش کی ساری ذہنی کلفت دور ہوگئی، وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کسی نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کر دودھ...... خود کیوں تکلیف کرتی ہے...... امڑ گودی!'' قادر بخش نے ازراہ احترام ملائمت سے کہا تو اس کی ماں ممتا بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ناپٹ......! دودھ جیسی شے ماں کے ہاتھ پینے سے اولاد کو ثواب ملتا ہے...... میں تجھے اس ثواب سے محروم نہیں رکھنا چاہتی۔'' ماں کی بات پر قادر بخش ہولے سے مسکرایا اور پھر دودھ کا گلاس ماں کے ہاتھوں سے لے لیا۔

سازش کرنے والے بھی بلا کا ذہن رکھتے ہیں...... پیاروں کے ہاتھوں پیاروں کی ہی موت کا سامان کرتے ہیں اور ذرا بھنک تک نہیں پڑتے دیتے...... سادہ لوح دراں خاتون نہیں جانتی تھی کہ وہ دودھ کا جو گلاس اپنے بیٹے قادر بخش کو دینے آئی تھی، کچھ عرصہ پہلے یہی دودھ کا گلاس پی کر اس کا شوہر سردار خان بھی موت کی نیند جا سویا تھا اور آج وہی دودھ کا گلاس سازش کھیلنے والوں نے دوبارہ ایک ماں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا جو وہ اپنے بیٹے کو ممتا بھری محبت کے ساتھ تھما چکی تھی...... اس

تلخ حقیقت سے یکسر بے خبر کہ سازش کھیلنے والوں نے خود اس کے ہاتھوں اسے ایک بار بیوگی کی چادر پہنائی تھی اور اب وہی اس کے ہاتھوں اس کے جوان بیٹے کو کفن پہنانے والے تھے۔



کبھی زندگی اور موت کے بیچ ایک لمحے کا فاصلہ ہوتا ہے اور کبھی ایک قدم کا ......مگر قادر بخش کے لئے زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک گھونٹ کا فاصلہ تھا۔

زہریلے دودھ کے ایک گھونٹ کا......

اس کی ماں دراں خاتون اپنے بیٹے کو دودھ کا گلاس اور انجانے میں زہر کا پیالہ تھما کر کمرے سے جا چکی تھی اور قادر بخش اپنی موت سے غافل دودھ کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے ...... آتشدان کے سامنے کرسی پر دوبارہ براجمان ہو گیا۔ آتشدان میں شعلوں کی حدت قدرے کم ہونے لگی تھی۔ قادر بخش اب دودھ پی کر سو جانا چاہتا تھا۔

وہ اب آتشدان کی آگ اور اپنے سینے میں گنجلک سوچوں کو کریدنا چاہتا تھا۔ اس نے دودھ کا گلاس آہستہ سے اپنے ہونٹوں تک بڑھایا۔

ابھی وہ اپنی موت کو بوسہ دینا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً اسے کمرے کے دروازے پر ہلکی چاپ کا احساس ہوا۔ گلاس والا ہاتھ ہونٹوں تک آتے آتے رک گیا۔ چونکتی ہوئی نظروں نے بند دروازے تک سفر کیا اور پھر نیچے بنی فرش سے قدرے اونچی درز پر جا کر ٹھہریں۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا اور دروازے کی دوسری جانب وہ کسی کی موجودگی محسوس کر کے کرسی سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے تک آیا اور یکدم کنڈی گرا کر اس نے دونوں پٹ وا کر دیئے۔

مدھم سی روشنی میں قادر بخش نے دو سایوں کو بدحواس ہو کر بھاگتے دیکھا اور چونک گیا۔ طویل راہداری کے دائیں بائیں بیشتر کمرے تھے۔ ملگجے سے اندھیرے میں وہ دونوں بدحواس ہیولے آگے جا کر داہنی جانب مڑ گئے۔ قادر بخش بغور ان کی چال اور خدوخال بھانپتا ہوا تیزی سے ان کے تعاقب میں ہولیا۔

راہداری ویران تھی، قادر بخش کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ معاً ایک اور سایہ

نمودار ہوا مگر اس کی حرکات و سکنات مشکوک نہ تھیں۔ وہ لاپرواہانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ منصب خان تھا، اس کا سوتیلا بھائی ...... وہ قادر بخش کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے کھلے دروازے کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر اندر قدم رکھ دیا۔ سامنے تپائی پر اسے دودھ کا بھرا ہوا گلاس نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری۔ اس نے آگے بڑھ کر غٹاغٹ دودھ پی لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دودھ قادر بخش کے لئے اس کی ماں دراں خاتون رکھ کر گئی ہے۔ محض قادر بخش کو ستانے کے لئے منصب خان دودھ کا گلاس خالی کر کے چپکے سے کمرے سے نکل گیا۔

جو کسی دوسرے کے لئے گڑھا کھودتا ہے، سب سے پہلے خود اس میں گرتا ہے۔

یہ مثل یہاں صادق آ چکی تھی۔ حاکم زادی ......ایک سادہ لوح ماں کے ہاتھوں زہریلا دودھ تھما کر اس کے لختِ جگر کو موت کی نیند سلانا چاہتی تھی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ...... وہ دودھ کا گلاس اب اس حاکم زادی کے اپنے بیٹے منصب خان نے پی لیا تھا۔

وہ کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ وہ بے اختیار رک گیا اور اپنے گھٹتے ہوئے حلق پر ہاتھ رکھ دیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ آن کی آن میں وہ لڑکھڑایا اور زمین بوس ہو گیا۔

ادھر قادر بخش ان دونوں مشکوک انسانی ہیولوں کو پہچان چکا تھا۔ ان میں ایک اس کی سوتیلی ماں حاکم زادی اور دوسری بھابھی ہدایتاں تھی۔ اسے حیرت کے ساتھ الجھن سی ہونے لگی کہ یہ دونوں بھلا اس کے کمرے کے دروازے سے لگی کیا سن گن لینے کی کوشش کر رہی تھیں جبکہ وہ کمرے میں تنہا تھا۔ اس کی چھٹی حسی خطرے کا الارم بجاتی محسوس ہونے لگی۔ ماں کے ہاتھ بیٹے کے لئے زہر ملا دودھ پہنچانے کے بعد درحقیقت حاکم زادی اور ہدایتاں اپنے اس عمل بہیمانہ کا سفاک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی تشفی کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لئے دروازے سے لگی قادر بخش کو تکے جا رہی تھیں مگر عین وقت پر جانے کس طرح قادر بخش کو ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

جھری سے ان دونوں نے قادر بخش کو اٹھتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے وہاں سے رفو چکر ہونے کی کوشش کی۔

بہرطور ...... قادر بخش شکن آلود پیشانی کے ساتھ واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹا تب اسے فرش پر اپنے سوتیلے بھائی منصب خان کی لاش دکھائی دی۔ اسے بے سدھ پڑا دیکھ کر قادر بخش بے اختیار اسے پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ معاً اس کی نظریں منصب کے منہ سے نکلتی خون کی ایک لکیر پر پڑیں اور وہ دہل کر رہ گیا۔

منصب خان اگرچہ اس کا سوتیلا بھائی تھا اور اکثر قادر بخش کو زک بھی پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر قادر بخش اس کی حالت دیکھ کر ملول اور پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے اس کی نبض دیکھی، سینے پر ہاتھ رکھا مگر سینے کا زیر و بم تو کب کا عنقا ہو چکا تھا، دل کی دھڑکنوں کی جگہ سکوت طاری تھا۔

منصب خان کے منہ سے خون کی پتلی لکیر دیکھ کر قادر بخش کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہیں لگی کہ منصب خان کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔

وہ جلدی سے اٹھا، اس کا خون رگوں میں اچھالیں مارنے لگا اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور تب اس کی نظر تپائی پہ رکھے خالی گلاس پر پڑی۔ اسے یاد تھا تھوڑی دیر پہلے یہ گلاس دودھ سے لبالب بھرا تھا مگر اب وہ خالی تھا۔

اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ ایک سنسنی خیز تصور نے اس کی رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ موت کی سنسنی ...... حاکم زادی اور ہدایتاں کا مشکوک انداز ...... تپائی پہ ایک دودھ کا خالی گلاس اور اپنے کمرے کے سامنے منصب خان کی لاش، ان سب عناصر نے کڑی سے کڑی ملا دی تھی، سب کچھ قادر بخش کے دل و دماغ کے اندر اترے ہوئے دم بہ خود سناٹوں میں یہ حقیقت منکشف ہونے لگی کہ دودھ کا وہ گلاس کس کے لئے تھا اور پی کس نے لیا تھا۔



پازیب کو ہوش آ چکا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھی اور خزاں رسیدہ پتے کی طرح اس کا نرم و نازک وجود لرز رہا تھا۔ وہ ایک سجے سنورے کمرے کے وسط میں بچھے ...... خاصے اونچے سرہانے والی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ حالانکہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر شیشے کا گلاس موجود تھا مگر خوف

نے اسے اس قدر گنگ کر کے رکھ دیا تھا کہ اس میں ذرا بھی حرکت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اپنا دل اسے کانوں کے پاس دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ چند لمحے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ نیز وہ کہاں تھی اور کدھر آ گئی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ نیم خوابیدہ ذہن پر شعوری کوشش کرتے ہوئے زور دینے پر اسے یاد آتا چلا گیا تھا کہ وہ لاہور جانے کے لئے اسٹیشن پر ٹرین کی منتظر تھی اور اس دوران ایک چھوٹے سے بچے نے شربت کا گلاس اسے پینے کو دیا تھا ...... اب اس کے بعد اسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا مگر اب پوری طرح دماغی طور پر بیدار ہوتے ہی پہلا خدشہ اسے چاندنی بی کے پالتو کتوں، کھگا بدمعاش اور اس کے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ یہ خیال آتے ہی مارے خوف کے اس کا دل اچھل کر حلق میں آن ٹکا تھا۔

معاً دروازہ کھلا، وہ ہراساں ہرنی کی طرح ٹھٹکی۔ اندر آنے والے چار پانچ افراد کو دیکھ کر پازیب کو اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہونے لگا۔ ان میں ایک شخص کو دیکھ کر پازیب کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسے اپنے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوگئی تھی۔

وہ کھگا بدمعاش تھا، دو اس کے ساتھی، ایک ادھیڑ عمر عورت تھی، یہ چاندنی بی تھی اور ساتھ ہی اس کے منے خان کھڑا تھا۔ وہ سب لوگ اسے شکرے جیسی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''واہ ...... مجھے اب ...... گھنگھرو کے جانے کا افسوس نہیں رہا۔ دیکھو تو منے! اپنی اس بنو رانی کو، یہ تو ہمارے کوٹھے کی رونقیں بڑھا دے گی۔'' معاً چاندنی بی نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے مکروہ لہجے میں کہا اور بے چاری پازیب سرتا پا لرز اٹھی۔ وہ سب پازیب کو گھورتے ہوئے مسہری کے قریب آ چکے تھے۔ پازیب جال میں پھنسی بے بس چڑیا کی مانند خود کو محسوس کرنے لگی۔ اتنے میں چاندنی بی پازیب کے قریب مسہری پر براجمان ہوگئی کہ نرم لہجے میں اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ ''ڈرو نہیں بنو ...... ہم تمہارے اپنے ہیں ...... ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں ......'' پازیب

لرزیدہ آواز میں گڑگڑائی۔

اثنائے راہ منے خان خبیثانہ لہجے میں پازیب سے بولا۔ ''تم اب بھلا کہاں جا سکتی ہو، اب یہی تمہارا آخری ٹھکانہ ہے۔ دیکھو...... تم ہمارا کہنا مانتی رہو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے ...... ورنہ یہ بدمعاش ہمارا ذرا سا اشارہ پا کر تمہارا سارا خوف توڑ ڈالیں گے۔''

منے خان کے سفاک لہجے نے پازیب کی روح فنا کردی۔ اسے غش سے آنے لگے اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر ذرا دیر بعد ہی وہ مسہری پر ڈھیر ہوگئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''یہ تو کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہوگئی ہے، مجھے ڈر ہے کہیں شریف لڑکیوں کا وتیرہ اپناتے ہوئے خودکشی نہ کر بیٹھے۔'' چاندنی بی نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''اسے تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔'' منے خان نے تنبیہہ کی اور پھر بولا۔

''ویسے گھبرانے کی بات نہیں ...... دھیرے دھیرے اسے شیشے میں اتار ہی لیا جائے گا۔ تم گھنگھرو کو بھول گئیں چاندنی بی۔ اس نے بھی شروع میں ایسے ہی رنگ دکھائے تھے پھر کس طرح بعد میں رام ہوتی چلی گئی۔''

''مگر منے خان! یہ گھنگھرو نہیں ہے۔ گھنگھرو اگر ہماری بات ماننے پر مجبور ہوگئی تھی تو اپنی اس بہن کی وجہ سے لیکن اسے ہم کس طرح مجبور کر سکتے ہیں۔'' چاندنی بی نے بے ہوش پڑی پازیب کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا پھر متفکر لہجے میں بولی۔

''اسے ہوش میں تو لاؤ ...... کہیں اس کا دل ہی کام کرنا نہ چھوڑ دے۔'' اس کی بات سن کر منے خان نے کھگے اور اس کے ساتھیوں کو وہاں سے جانے کو کہا۔ پھر قریب ہی تپائی پہ رکھے پانی کا جگ اٹھایا اور آگے بڑھ کر پانی کے چھینٹے پازیب کے چہرے پر مارے۔ اتنے میں چاندنی بی پازیب کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے گال تھپتھپانے لگی۔ ذرا دیر بعد ہی پازیب نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور ہوش میں آتے ہی وہ یکدم چاندنی بی سے پرے ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا تھا۔

''تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔'' چاندنی بی نے اپنے لہجے میں اپنائیت سموتے ہوئے کہا پھر منے خان سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تم جاؤ ...... بے بی کے لئے

کھانا وغیرہ لے آؤ۔ بے چاری جانے کب سے بھوکی ہوگی۔''

''نہیں ...... میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔'' پازیب نے روتے ہوئے کہا اور یکدم مسہری سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو قریب کھڑے منے خان نے کسی شکرے کی طرح اسے دبوچ لیا اور قہربار لہجے میں بولا۔

''دیکھو بے بی ہمیں سختی پر مجبور مت کرو ورنہ......'' اس نے تنبیہی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میرا خیال ہے یہ ایسے نہیں مانے گی، اسے کھگے کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔'' چاندنی بی کے لہجے سے یکلخت ملائمت کا ملمع اتر گیا اور وہ زہرخند لہجے میں پازیب کی طرف دیکھ کر منے خان سے بولی۔ منے خان نے پازیب کو بے دردی کے ساتھ دوبارہ مسہری پر دھکیل دیا۔ ''تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے جانے دو۔'' پازیب اپنے ہاتھ جوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی مگر ان عزت کے بیوپاریوں کے لئے گریہ وزاری ایک عام بات تھی۔ ان پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا...... اور تب چاندنی بی نے ایک بار پھر پازیب کو ''راہ راست'' پر لانے کے لئے نرمی کا سہارا لیتے ہوئے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''دیکھو بے بی......! یوں رونے کا کوئی فائدہ نہیں ...... یہاں سے نکلنے کا راستہ صرف قبر تک جاتا ہے بلکہ اسے قبر بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہماری بات مان لو...... تمہارا اب یہی گھر ہے۔''

''نہیں ...... یہ گھر نہیں ہے ...... یہ کوٹھا ہے۔'' اس بار پازیب پر چاندنی بی کی سفاک دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ الٹا اس کے اندر سرکشی عود کر آئی تھی۔ ''میں روؤں گی ...... چیخوں گی ...... تم لوگ مجھے یہاں میری مرضی کے خلاف ایک پل بھی نہیں رکھ سکتے۔''

''میرا خیال ہے منے خان ...... تم کھگے کو بلا ہی لو ...... وہ اس کے ساتھ ایسا کھیل کھیلے گا کہ یہ خود ہی راہ راست پر آجائے گی۔'' معاً چاندنی بی نے مسہری پر سے اٹھتے ہوئے منے خان سے کہا۔

''ایسا ہی کرنا پڑے گا...... اس کے ساتھ...... اسے شاید معلوم نہیں ...... اس کی بہن گھنگھرو کو بھی دبیر دادا نے ہی ٹھیک کیا تھا۔'' منے خان نے پازیب کی طرف

سفاک نظروں سے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر کہا اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ کھگے کو کمرے میں بلا لایا اور اسے ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ ''کھگے ......! اس چڑیا کے پر اس وقت تک نوچتے رہو...... جب تک یہ ہماری بات ماننے کا فیصلہ نہ کر لے۔'' کھگا یہ سن کر پازیب کو گھورتا ہوا مسہری کی طرف بڑھنے لگا۔

''نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے ...... میں اپنی جان دے دوں گی۔'' پازیب نے متوحش ہو کر کہا اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی کلائی کو منہ کے قریب کر کے اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اتنے میں کھگا کسی شکرے کی مانند اس پر جھپٹا۔ پازیب کی کلائی زخمی ہو چکی تھی اور اب اس سے خون رسنے لگا تھا۔ قریب کھڑی چاندنی بی اور منے خان بدحواس ہو گئے۔

''چھوڑ دے اسے کھگا......! یہ مر نہ جائے۔'' چاندنی بی نے اچانک چلا کر کہا اور منے خان سے بولی۔ ''تم ...... تم جاؤ...... جلدی سے فرسٹ ایڈ بکس لے آؤ۔ خادم اگر ہو تو اسے بھی لے آنا مرہم پٹی کے لئے......''

منے خان فوراً کمرے سے بھاگا، پازیب ہنوز ...... کھگے کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچل رہی تھی۔ کھگے کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ پازیب کے گال پر رسید کر دیا۔ پازیب کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی مگر کھگے نے اسے چھوڑا نہیں تھا۔ اس نے پازیب کی زخمی کلائی کو دبوچ لیا تھا۔

اتنے میں منے خان ایک شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا بکس تھا۔ انہوں نے کسی طرح پازیب کی زخمی کلائی پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی اور اس خادم نامی شخص نے بکس سے ایک سرنج نکال کر اس میں محلول سا بھرا پھر پازیب کی نس میں سوئی گھونپ کر وہ سارا محلول انجیکٹ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے پازیب کی کمزور مزاحمت بالکل دم توڑنے لگی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''گھبرانے کی بات نہیں ...... رگ ابھی نہیں کٹی ہے، صرف کھال زخمی ہوئی تھی۔'' خادم نامی اس شخص نے چاندنی بی سے کہا۔ ''میں نے آرام کا ٹیکا لگا دیا ہے ...... یہ اب دو تین گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔'' اس کی بات سن کر چاندنی بی نے سکون کا سانس لیا۔

اتنے میں منے خان نے پرتفکیر لہجے میں چاندنی بی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ...... ابھی اس پر سختی نہیں کرنی چاہئے۔ اسے ذرا دیر کے لئے اپنے حال پر چھوڑ دو۔''

اس کے بعد کمرے میں صرف چاندنی بی اور منے خان رہ گئے۔ وہ اس خیال سے پازیب کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے کہ کہیں وہ ہوش میں آتے ہی دوبارہ نہ خود کو نقصان پہنچائے۔



گہرام خان کو قابو کرنے کے بعد وزیر علی قریب ہراساں کھڑی کونجاں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اب رونے لگی تھی۔ وزیر علی نے ملائمت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ادی......! تم ڈرو نہیں ...... یہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' مگر کونجاں کسی اور وجہ کے تحت رو رہی تھی۔ بالآخر گلوگیر لہجے میں اس نے وزیر علی کو بتایا۔ ''مم ...... میرا بپو مر گیا ہے۔''

وزیر علی اس غمناک اطلاع پر چونکا۔ پھر وہ اس سے مغموم لہجے میں بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ......'' کونجاں کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وزیر علی گہرام خان کے پاس چھوڑ کر...... کونجاں کے عقب میں کوٹھڑی میں آ گیا۔

سامنے چارپائی پر وزیر علی کی نگاہ پڑی تو ایک لحظہ کے لئے اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مٹھن ہاری کی لاش اکڑنے لگی تھی۔ یکایک در و دیوار بہ زبان خاموشی ماتم کناں سے محسوس ہونے لگے۔ وزیر علی نے فوری صورت حال سے نمٹنے کے لئے ...... سب سے پہلے کونجاں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے کہا۔ ''بھاجائی......! تو ...... دوسرے کمرے میں چلی جا...... اور قرآن مجید پڑھ...... میں کچھ کرتا ہوں۔''

کونجاں سسکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وزیر علی نے فوراً ایک پرانی سی چادر کی لیریں بنا کر پھاڑیں اور سب سے پہلے اس نے مٹھن کی دونوں ٹانگوں کو جوڑ کر انگوٹھوں سے باندھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ...... پھر باہر صحن میں آ گیا ...... اور رمضان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تو ایسا کر...... اس رذیل کو کسی طرح چھوٹے سائیں کے حوالے کر...... اور مٹھن کی موت کی بھی خبر کر دینا...... میں ذرا محلے والوں کو خبر کر

دوں۔"

"لیکن ...... تم کس حیثیت سے اطلاع دو گے ...... یہ مناسب نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے ہم دونوں چل کر چھوٹے سائیں کو خبر کرتے ہیں۔ وہ ہی ادھر آ کر یہ سب کر سکتے ہیں۔" رمضان نے جواباً کہا اور وزیر علی کو اس کی بات میں وزن محسوس ہوا اور پھر وزیر علی ایک بار پھر کونجاں کے پاس آیا اور ملائمت سے بولا۔ "بھاجائی......! یہ مناسب تو نہیں کہ تمہیں یہاں اکیلا چھوڑا جائے مگر میری مجبوری تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں...... گہرام خان کو لے کر ہم چھوٹے سائیں کے پاس جا رہے ہیں اور انہیں ادھر بھیج دیں گے یا میں بھی ان کے ہمراہ ادھر آ جاؤں گا۔ تم ذرا حوصلے سے کام لینا۔"

کونجاں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا اور وزیر علی باہر آ گیا۔ پھر جب وہ دونوں گہرام کو پکڑ کر اپنے ساتھ گھر سے باہر نکلے تو مکان کی دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ یہ گولا تھا جو نہ جانے کب سے موقع کی تاک میں تھا اس نے فوراً صحن میں چھلانگ لگائی اور دبے پاؤں اس کوٹھڑی جانب بڑھا جدھر کونجاں موجود تھی۔ ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ معاً دروازہ کھلا اور کونجاں اپنے سامنے گولے کو دیکھ کر ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی۔ پر ابھی اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ گولے نے اسے جھپٹ لیا اور اپنا آہنی ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کونجاں بےچاری پہلے ہی ہراساں تھی۔ اس خوفناک صورت حال نے فوراً اس کے ذہن پہ اثر کیا اور وہ غش کھا کر گولے کے بازوؤں میں جھولتی چلی گئی۔ اپنا کام "آسان" ہوتے دیکھ کر گولے کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی تھی۔ اس نے کونجاں کے نازک وجود کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ باہر سنسان اور تاریک گلی میں آ گیا۔ اس کا رخ زمیندار حکم داد کی حویلی کی طرف تھا۔



ادھر قادر بخش انتہائی نازک اور سنگین صورت حال سے دوچار تھا۔ ایک جانب سوتیلے بھائی منصب خان کی لاش موجود تھی اور دوسری طرف کونجاں اپنے مردہ باپ کی لاش کے ساتھ اپنے گھر میں تنہا تھی۔ اس کے دونوں جاں نثار ساتھی وزیر علی اور

رمضان گہرام خان کو پکڑ کر اس کے حوالے کر چکے تھے نیز وزیر علی نے قادر بخش کو نئی صورت حال سے بھی باخبر کر ڈالا تھا۔ خود قادر بخش اب شدید مخمصے کا شکار تھا۔ دودھ کا جو زہر ملا گلاس اس کی ماں دراں خاتون اس کے لئے لائی تھی، ایک سنگین صورت اختیار کر گیا تھا اور جسے پی کر منصب خان راہئ عدم ہو چکا تھا۔ قادر بخش جانتا تھا کہ دنیا کی کوئی بھی ماں اپنے لخت جگر کو زہریلا دودھ نہیں پلا سکتی تھی۔ یہ ایسی سازش تھی جس کا قادر بخش کو پہلے ہی سے شک تھا جو اب منصب خان کی موت کے بعد پختہ ہو گیا تھا کہ اس کے باپ سردار شیر دل خان کو بھی اس طرح ہی پراسرار موت کا شکار کیا گیا تھا۔ اس نے وزیر علی کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد انہیں گہرام خان کو اوطاق میں لے جانے کا کہا اور خود سیدھا ماں کے پاس آیا۔

اسے یقین تھا ماں کے لئے یہ بات ناقابل یقین اور رنج کا باعث ہوگی۔ بے شک وہ منصب خان کی سگی ماں نہ تھی مگر وہ جانتا کہ اس کی سادہ لوح ماں کو شدید ذہنی دھچکا پہنچے گا لیکن یہ حقیقت اسے بتانا بھی ضروری تھی۔

"امڑ......! میری بات کا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ تجھے یہ دودھ کا گلاس کس نے دیا تھا۔ کیا تو نے خود یہ میرے لئے بنایا تھا۔" بےچاری دراں خاتون اس غیر متوقع سوال پر پریشان سی ہوگئی اور اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ قادر بخش اسے حوصلہ دیتے ہوئے اپنے لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے بولا۔ "امڑ......! پریشان مت ہو...... جلدی بتا مجھے...... یہ دودھ کا گلاس تجھے کس نے دیا تھا؟"

اس کی ماں دراں خاتون نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ اپنے بیٹے کے چہرے پر ڈالی پھر لرزیدہ سی آواز میں بولی۔ "پپ...... یہ...... دودھ کا گلاس تو میں خود تیرے لئے لائی تھی مگر......"

"مگر...... کیا......؟" قادر بخش نے اپنے اتھل پتھل تنفس پہ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل یہ گلاس مجھے حاکم زادی نے دیا تھا۔ اس کے پاس ایسے دودھ بھرے دو گلاس تھے۔ وہ ایک اپنے بیٹے منصب کے لئے لے جا رہی تھی، دوسرا اس نے مجھے تھما دیا تھا کہ میں خود اپنے بیٹے کو دے آؤں۔ پر تو...... یہ کیوں پوچھ رہا ہے

......کیا ہوا؟" دراں خاتون نے جواب دیتے ہوئے سراسیمگی سے پوچھا۔ ماں کی بات سن کر قادر بخش کے چہرے پر ایک تناؤ کی کیفیت عود کر آئی۔

"امڑ......! اس دودھ کے گلاس میں زہر ملا ہوا تھا۔"

"کک......کیا......ہوش میں تو ہے تو......" اس کی ماں کی جیسے روح فنا ہو گئی۔

"تت......تو نے...... پی تو نہیں لیا کہیں......"

"نہیں امڑ......" قادر بخش نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس نے میرے لئے گڑھا کھودا تھا وہی اس کے لئے قصر فنا ثابت ہوا ہے۔" پھر جب قادر بخش نے اپنی ماں کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ قادر بخش فوراً ماں سے بولا۔ "امڑ......! حوصلے سے کام لے...... اللہ کو یہی منظور تھا۔ دیکھ میری بات غور سے سن میں ایسی ہی اور بھی صورت حال سے دوچار ہوں۔ میں ابھی باہر جا رہا ہوں...... جلدی لوٹ آؤں گا...... تو گھبرانا مت...... ہمت سے کام لینا...... کسی طرح حاکم زادی کو اس بات سے آگاہ کر دینا...... میں ابھی آتا ہوں۔"

"مجھ میں اس کی ہمت نہیں پت......" اس کی ماں بے حال ہو کر بولی۔

"اچھا پھر ٹھیک ہے......تو ایسا کر......اپنے کمرے میں ہی موجود رہنا۔ میں آ کر سنبھالتا ہوں۔" قادر بخش نے کہا اور پھر اوطاق میں آ گیا۔ جدھر اس کے دونوں ساتھی گہرام خان کے ساتھ موجود تھے۔ پھر اس نے وزیر خان کو ساتھ لیا اور کونجاں کے گھر کی طرف چل دیئے۔



سنسنی خیز حالات کا ایک ایک پل بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ رات سر پہ آ گئی۔ پازیب ہنوز مسہری پہ بے سدھ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے قریب ہی چاندنی بی اور منے خان کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان کے چہروں پر تفکر آمیز الجھن تیر رہی تھی۔ ادھر ذرا دیر بعد پازیب کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹ کپکپائے۔ "پپ پانی......"

چاندنی نے جلدی سے قریب ہی تپائی پہ رکھے، جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پازیب کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد پازیب نے دیکھنے

کی کوشش کی تو اسے ذرا دھندلا دھندلا سا دکھائی دینے لگا۔ وہ شدید نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ ذہن پر ہنوز غنودگی طاری تھی۔ چاندنی بی بڑی مکاری کے ساتھ پازیب کے بالوں کو بڑے پیار سے سہلانے لگی۔ پھر ذرا دیر بعد پازیب پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر عیار چاندنی بی یکدم ہوشیار ہو گئی۔ چہ جائیکہ وہ پھر نہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر ڈالے۔

"دیکھو...... پازیب......! میری بات غور سے سنو۔" قریب بیٹھے منے خان نے ذرا کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اچانک پازیب کو مخاطب کر کے نرمی سے کہا۔ پازیب خاموشی سے اس کی طرف تکنے لگی۔ تاہم ہوش میں آتے ہی وہ چاندنی بی سے ذرا پرے ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے چاندنی بی کے وجود سے گھن آ رہی تھی۔

"تم کیسا سمجھتی ہو، اس طرح خودکشی کر کے تمہاری بہن گھنگھرو کو خوشی ہو گی؟ کیا اس کے لئے یہ دکھ کی بات نہ ہو گی جس بہن کے لئے اس نے اپنی عزت کی قربانی دی وہ یوں ختم ہو گئی؟ پھر تمہاری بہن نہ مرنے کی ہو گی نہ جینے کی......" منے خان عیاری سے بولتا چلا جا رہا تھا اور پازیب کو اپنے اندر کوئی شے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر اس نے جواباً قدرے اتنا ضرور کہا۔ "مگر جو کچھ تم لوگ مجھے بنانا چاہ رہے ہو کیا اسے دیکھ کر میری بہن کو خوشی ہو گی؟ وہ مجھے ایک ناچنے گانے والی کے روپ میں دیکھ کر زندہ درگور ہو جائے گی۔"

"ہاں......! یہ تمہاری بات درست ہے۔" منے خان نے یوں ظاہر کرتے ہوئے کہا جیسے یہ جواب اس نے کچھ گہری سوچ کے بعد دیا ہو۔ "اس کا حل ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ دیں۔" منے خان نے جیسے انکشاف کیا اور پازیب کے چہرے پر پھوٹنے والی مسرت دیدنی ہو رہی تھی۔ "ہاں......مگر اس وقت تک تم یہاں رہو گی جب تک کہ تمہاری بہن گھنگھرو کو ہم جیل سے چھڑا کر یہاں نہ لے آئیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہمارا یہی معاہدہ چلا آ رہا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گی جبکہ تمہاری طرف ہم ذرا بھی ہاتھ نہیں بڑھائیں گے۔" منے خان نے اپنی بات ختم کی۔ چاندنی بی منے خان کی اس نئی مگر قدرے الجھی ہوئی چال کو سمجھ کر اب تک خاموش ہی بیٹھی رہی تھی جبکہ پازیب ایک پل بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی

بہن گھنگھرو کی قربانی کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی خاطر کیسے گندے ماحول میں زندگی گزارتی آئی تھی۔ منے خان کی آخری بات سن کر پازیب نے کچھ منہ سے کہا نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بھلا اس کی بہن اب اتنی جلدی کس طرح جیل سے رہائی پا سکتی ہے۔ ابھی تک تو یہ کیس عدالت تک بھی نہیں گیا تھا۔

”تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ گھنگھرو کو ہم کس طرح جیل سے نکال لائیں گے۔“ گھاگ منے خان نے جیسے پازیب کا چہرہ پڑھتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ”ہمارے لئے گھنگھرو کو جیل سے باہر نکالنا کوئی مسئلہ نہیں ...... بس تم خاموشی سے ادھر رہو ...... میرا خیال ہے تم اب میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی!“

منے خان خاموش ہوا۔ چاندنی بی گہری نگاہوں کے ساتھ یک ٹک پازیب کے ستے ہوئے چہرے کی طرف تکے جا رہی تھی۔ پازیب عجیب الجھن اور پریشان کن تذبذب کا شکار تھی۔ اسے نہ جانے کیوں اب کسی گہری چال کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے منے خان اور چاندنی بی بڑی مکاری اور پراسرار طریقے سے دھیرے دھیرے اس کے گرد کوئی نادیدہ سا تار عنکبوت بن رہے ہوں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کہے ...... کیا کرے ......!

اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ تینوں بری طرح چونکے تھے۔ اندر آنے والوں میں کھگا اور اس کے کچھ ساتھی تھے۔ وہ بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔

”پپ ...... پولیس نے ہمیں گھیر لیا ہے۔“ انہوں نے بدحواس ہو کر اطلاع دی۔ اس اطلاع پر منے خان سمیت چاندنی بی بری طرح اچھلے تھے اور ان کے چہرے فق سے ہو گئے پھر وہ یکدم بدحواس ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پازیب نے بھی یہ سن لیا تھا۔ پہلی بار اس کے بجھے دل میں جینے کی امنگ پیدا ہو گئی۔ پھر ابھی وہ لوگ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے پر بھاری جوتوں کی دھمک گونجی اور کئی پولیس والے رائفلیں لئے اندر آ گئے۔ ان میں انسپکٹر خرم اور عاقل خان بھی شامل تھے۔

”خبردار ......! اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو ......“ انسپکٹر

خرم نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ پازیب عاقل خان کو دیکھ کر بے اختیار یوں جی جان سے پکار اٹھی جیسے وہ اس کا نجات دہندہ ہو۔ ”عاقل ...... عاقل ......“ اور عاقل خان بھی پازیب کو دیکھ کر اس کی جانب دیوانہ وار بڑھ چکا تھا۔ پازیب سرعت کے ساتھ مسہری سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی تھی اور اس سے لگ کر زار و قطار رو دی۔ عاقل خان کو اس کا وجود خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزیدہ محسوس ہوا۔

”تم ...... تم ٹھیک تو ہو ناں ...... پازیب ......“ عاقل خان ملائمت بھری حلاوت سے بولا۔ اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ تو پازیب نے سسکتے ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس اثناء میں پولیس، چاندنی بی سمیت اس کے ”ڈشکروں“ کو آہنی زیور پہنا چکی تھی۔ پھر پازیب نے مختصراً عاقل خان اور انسپکٹر خرم کو ساری روداد بیان کر دی جسے سن کر عاقل خان کا دل پسیج سا گیا اور وہ قہربار نظروں سے چاندنی بی کے مکروہ چہرے کی طرف گھورنے لگا۔ پھر پازیب کو تسلی دیتے ہوئے ملائمت بھرے لہجے میں بولا۔

”پازیب ......! حوصلہ رکھو ...... میں آ گیا ہوں ناں۔“ اور پازیب کو عاقل خان کے بازوؤں کا حصار دنیا کی محفوظ ترین اور پرسکون پناہ گاہ محسوس ہونے لگی۔ اس کی کشادہ اور سرمگیں آنکھوں میں اب خوشی کے آنسو امڈ آئے تھے۔



انسپکٹر خرم نے چاندنی بی کے حواریوں کو لے جا کر تھانے میں بند کر دیا تھا جبکہ عاقل خان پازیب کو اپنی جیپ میں بٹھا کر کین جھر لے آیا تھا۔

”پازیب ...... دیکھو ...... تمہاری ذرا سی بے وقوفی نے تمہیں کتنے خطرناک لوگوں کے پاس پہنچا دیا تھا مگر اب دوبارہ بھول کر بھی ایسی غلطی نہ کرنا۔“ عاقل خان نے پازیب سے کہا۔ اس کے لہجے میں خفیف سا شکوہ تھا۔ پازیب کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ پازیب کے چہرے پر ندامت کے آثار محسوس کر کے عاقل اس کی خفت مٹانے کی غرض سے محبت پاش لہجے میں بولا۔ ”لیو اٹ ...... ناؤ ...... میں اب تم سے فوراً شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عاقل خان کی بات پر پازیب نے اچانک نگاہ اٹھا

کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور اس بار عاقل خان کو پازیب کی نگاہوں میں ...... انکار کی جھلک نظر نہیں آئی۔

''عاقل ...... گھنگھرو باجی کا کیا ہوگا؟'' معاً پازیب نے پوچھا۔ جواباً عاقل خان نے ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر مت کرو ...... مجھے انسپکٹر خرم نے امید دلاتے ہوئے بتایا ہے کہ چونکہ چاندنی بی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے اور میں نے گھنگھرو کا مقدمہ لڑنے کے لئے اچھے وکیل کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ وکیل صاحب نے کہا ہے کہ تمہارے بیان سے نہ صرف چاندنی بی اور اس کے غنڈوں کو کڑی سے کڑی سزا مل سکتی ہے بلکہ تمہاری بہن گھنگھرو کی سزا میں بھی کافی حد تک تخفیف ہو سکتی ہے۔''

عاقل خان نے اپنی بات ختم کی تو پازیب مجبور سے لہجے میں بولی۔

''عاقل ......! کیا باجی سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکتی؟''

''کیوں نہیں ...... مگر پہلے تھانے چل کر تم نے چاندنی بی اور اس کے حواریوں کے خلاف اپنا بیان قلمبند کرانا ہے، یہ بہت ضروری ہے۔'' یہ سن کر پازیب نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔



اگلے دن عاقل خان اور پازیب تھانے پہنچے جہاں انسپکٹر خرم نے پازیب سے تفصیلی بیان لیا۔ اس کے بعد وہ لیڈیز تھانے پہنچے۔ گھنگھرو پازیب کو دیکھ کر اس کی جانب لپکی۔ دونوں بہنیں سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے سے مل کر رو پڑیں۔ عاقل خان خاموش کھڑا یہ رقت انگیز منظر دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد عاقل نے مختصراً گھنگھرو کو باقی کے حالات کے بارے میں بتا ڈالا۔ گھنگھرو ایک ثانیے کے لئے ششدر سی رہ گئی۔ اسے یہ سن کر خوشی ہوئی تھی کہ عاقل خان پازیب کی طرف سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ پازیب خطرناک درندوں کے شکنجے سے بچ نکلی تھی۔ نہ صرف یہ ...... بلکہ چاندنی بی اپنے گروہ سمیت جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا چکی تھی۔ اسے اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ پازیب کے لئے عاقل خان سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔ اس نے آنسوؤں بھرے

چہرے سے خاموش کھڑے عاقل خان کی جانب تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر لہجے کی رقت آمیز کپکپاہٹ پر قابو پا کر اس سے بولا۔ ''عاقل صاحب ......! ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں، ہمیں اندازہ نہ تھا کہ آپ ......''

''پلیز ...... اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ...... اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ مجھے امید ہے اب آپ دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی بہن پازیب کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرو گی۔'' عاقل خان نے ملائمت سے کہا پھر جب وہاں سے جانے لگا تو گھنگھرو نے اسے مخاطب کر کے روکا۔

''عاقل ......! کیا آپ ہم پر ایک اور احسان نہیں کرو گے!'' عاقل چونک کر مڑا پھر انتہائی شستہ لہجے میں گھنگھرو سے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے۔''

''پازیب ......! میری بہن ...... میں سمجھتی ہوں ...... تمہارے لئے اب عاقل سے بڑھ کر مضبوط سہارا اور کوئی نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ تم اپنا فیصلہ سنا دو تا کہ میرے دل کو ابدی سکون مل جائے۔'' پازیب نے مجبور نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ اس کی بات غور سے سننے کے بعد اس نے ایک نگاہ عاقل خان پر ڈالی اور اپنا سر جھکا دیا۔ تب گھنگھرو نے عاقل اور پازیب کو ذرا قریب بلایا پھر اپنا ہاتھ باہر نکال کر عاقل خان کا ہاتھ اپنی بہن کے ہاتھ میں دے دیا۔



کین جھرولا میں نکاح کی رسم انتہائی سادگی کے ساتھ طے پائی تھی۔ پازیب نکاح کے اگلے روز عاقل خان کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے جیل پہنچی۔ پازیب کو عروسی جوڑے میں دیکھ کر بے اختیار گھنگھرو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ اسے ایکا ایکی یوں لگا جیسے ایک کٹھن اور طویل مسافت کا آج اختتام ہو گیا ہو۔

عاقل خان نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے لیڈیز پولیس آفیسر عنایتاں لاشاری سے درخواست کر کے دونوں بہنوں کے ملاپ کو جیل کی سلاخوں سے آزاد کر کے خوشیوں کے آنسو بہانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

پازیب نے گھنگھرو کو تشفی دیتے ہوئے امید دلائی تھی کہ بہت جلد سلاخوں سے

باہر ہوگی اور دونوں فرقت کی ماری بہنیں اب ساری عمر ایک ساتھ مل کر خوشیوں بھری زندگی گزاریں گی۔ پھر گھنگھرو نے عاقل خان اور پازیب کو ڈھیروں دعاؤں اور خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کیا۔



رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ قادر بخش اور وزیر علی جب کونجاں کے گھر پہنچے تو انہوں نے کونجاں کو غائب پایا اور وہ دونوں بری طرح پریشان ہو گئے۔ انہیں وہاں کونجاں کے باپ مٹھن ہاری کی لاش کے سوا کچھ نہ ملا۔

"لگتا ہے...... حکم داد کا کوئی کتا اپنا کام دکھا گیا ہے!" قادر بخش دانت پیس کر وزیر علی سے بولا۔ "میرا خیال ہے حکم داد کی حویلی پر دھاوا بولنا چاہیے اسی وقت......"

"وہ تو ٹھیک ہے سائیں...... پر...... میرا خیال ہے پہلے تھانے چل کر انسپکٹر مراد خان کو اس کی اطلاع دینی چاہیے۔" وزیر علی نے کہا۔ قادر بخش اور وزیر علی فوراً تھانے پہنچے۔

انسپکٹر مراد خان اپنے کوارٹر میں محو استراحت تھا۔ پہلے تو اس نے روایتی سستی اور کسلمندی کا مظاہرہ کرنا چاہا مگر جب قادر بخش نے اسے یہ دھمکی دی...... اگر وہ اس نازک صورت حال میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تو وہ خود اپنے مسلح آدمیوں سمیت حکم داد کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

انسپکٹر مراد خان جانتا تھا کہ قادر بخش ایسا کر سکتا ہے لہٰذا وہ فوراً تیار ہو گیا اور پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ زمیندار حکم داد کی حویلی پر ریڈ کیا اور اس کے قبضے سے کونجاں کو برآمد کر لیا۔ پولیس نے فوراً حکم داد اور اس کے دونوں بیٹوں سائیں رکھیو اور مولا داد کو حراست میں لے لیا۔ ایسے میں حکم داد نے انسپکٹر مراد خان کو ساتھ ملانے کی بھی کوشش کی تھی مگر گھاگ انسپکٹر مراد خان بھانپ چکا تھا کہ اس وقت زمیندار حکم داد کی پوزیشن خراب ہو چکی ہے۔ وہ نہ صرف کونجاں کو اغوا کرانے کے جرم میں رنگے ہاتھوں گرفتار ہو چکا تھا بلکہ اس کا ایک ساتھی گہرام خان بھی ہنوز اس جرم میں قادر بخش کے نرغے میں جا چکا تھا۔



اگلے روز پورے گوٹھ میں جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ ایک ساتھ کئی سنسنی خیز خبروں نے سب کے دل دہلا کر رکھ دیئے تھے۔ مرحوم سردار شیر دل خان کے بیٹے منصب خان کی اپنے باپ جیسی پراسرار اور اچانک موت زمیندار حکم داد کی ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتاری۔

حاکم زادی اپنے بیٹے کی مرگ ناگہانی پر پاگل ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلے جب اسے دراں خاتون نے بڑے غمناک لہجے میں یہ المناک خبر سنائی تو وہ مبہوت ہو کر دراں خاتون کا یک ٹک چہرہ تکتی رہ گئی۔ جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ کیا تقدیر اس کے ساتھ ایسا بھیانک مذاق بھی کر سکتی ہے۔ کیا مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد حاکم زادی کے منہ سے ہسٹریائی انداز میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ دو ہتڑ اس نے اپنی سوتن دراں خاتون کے سینے پر مارے...... چلا کر پاگلوں کی طرح بولی۔ "تت...... تو نے میڈے پٹ کو زہریلا دودھ دیا تو نے میڈے پٹ کو مارا ہے۔" دراں خاتون بے چاری کیا جواب دیتی۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھی۔

تب حاکم زادی نیم پاگلوں کی طرح ہنسی اور بولی۔ "نن...... نہیں...... میں نے...... میں نے اپڑیں سوہنے پٹ کو مارا ہے...... اپڑیں منصب خان کی میں قاتل ہوں۔" وہ ہسٹریائی انداز میں بلند قہقہے مارتی چلی گئی۔ "ہا...... ہا...... میں ناگن ہوں۔ زہریلی ناگن...... پہلے میں نے اپڑیں مڑس (شوہر) کو زہر دیا اور...... اب اپڑیں پٹ (بیٹے) کو بھی زہر دے کر مار ڈالا۔ ہا...... ہا...... میں ڈائن ہوں...... مگر نہیں...... ڈائن تو سات گھر چھوڑتی ہے، میں نے تو...... میں نے تو ایک گھر بھی نہیں چھوڑا۔ میں ڈائن نہیں...... راکاس (بڑا بلا) ہوں۔ ہا...... ہا......" وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔



قادر بخش نے کونجاں کے ساتھ انتہائی سادگی سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ شادی کے بعد وہ دونوں ڈسٹرکٹ جیل لاڑکانہ سرمد سے ملنے پہنچے...... بڑی مشکلوں کے بعد ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے سامنے ان دونوں کو لایا گیا جہاں سرمد قید تھا۔ غالباً اسے کسی سنتری نے بتا دیا تھا کہ اس کی "ملاقات" آئی ہے۔ سرمد...... اپنی بہن کونجاں

اور قادر بخش کو ایک ساتھ دیکھ کر بہت کچھ اندازہ لگا چکا تھا۔ سب سے پہلے دونوں بہن بھائی خوب جی بھر کر روئے ...... قادر بخش بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔

''قادر بخش ...... تت ...... تو نے یاری کا حق ادا کر دیا یار ...... اب میں سکون سے مروں گا۔'' سرمد نے گلوگیر لہجے میں قادر بخش کو مخاطب کیا۔

''ایسا مت بول یار ...... اللہ سائیں بہتر کرے گا ...... مایوسی گناہ ہے۔'' قادر بخش اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اس کی انگلیاں سلاخوں کو تھامے ہوئے تھیں اور سرمد بڑے پیار سے اسے سہلا رہا تھا۔ ''نہیں میڈے یار ...... قادرے ......! میری معصوم بہن کونجاں کو سہارا دے کر تو نے بڑا احسان کیا ہے ...... یقین جان ...... مجھے اب مرنے کا بھی غم نہیں رہا۔ تو نے میری موت آسان کر دی یار ......''

''اڑے بس کر ...... کیا بکواس کر رہا ہے۔ تو نے ابھی اپڑیں ننھے منے بھتیجوں کو گود میں کھلانا ہے وہ ...... وہ ...... تجھے سرمو چاچا ...... سرمو چاچا ...... پکار پکار کر تیرا ناک میں دم کر دیں گے۔'' قادر بخش کہتا جا رہا تھا۔ دونوں دوستوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ دل مارے غم و اندوہ کے طفل تسلیاں دے رہا تھا۔ کونجاں زار و قطار رو رہی تھی اور پھر ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا۔ ملاقات کے بعد رخصت ہونے کا منظر بھی انتہائی دلدوز تھا۔ دل جھیر جھیر اور روح کٹ سی رہی تھی۔ پھر وہ دونوں جیل کی عمارت سے باہر آ گئے۔



یہ تھی ''بھٹائی ہاؤس'' کی داستان المناک، غمناک اور عبرتناک۔ ''بھٹائی ہاؤس'' میں اب سسکیوں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ کبھی کبھی اس کے شکستہ در و دیوار کے ساتھ حاکم زادی کے ہسٹریائی قہقہے آسیبی چمگادڑوں کی طرح سیلن زدہ سنگی روزنوں میں چکراتے رہتے ہیں۔ دونوں بھائی عاقل خان اور قادر بخش کا دل بھٹائی ہاؤس سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ سب اب شہر میں کین جھرولا میں ہمیشہ کے لئے آن بسے تھے۔

